بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
فروری 2023
www.pklibrary.com

ناولٹ

افسانے

حسین غزلیں

فروری 2023

جلد 36 عدد 08

قیمت 120 روپے

مستقل سلسلے

اس شمارے میں،

- عمیرہ احمد - حسن حسین کے ناول کی آخری قسط،
- نگہت سیما کا مکمل ناول - جھیلیں، آئینے اور سائے،
- فرح بخاری کا مکمل ناول - شام شہر ہجر،
- ثمین صداقت کا مکمل ناول - قید،
- آپ اپنے دام میں - صدف عمر کا ہنستا مسکراتا ناولٹ،
- حمیرا شفیع، نازیہ عمبر، مونا شاہ، ملیحہ سون اور عودیہ بتول کے افسانے،
- آپ کی پسندیدہ لکھاری زینب تبسم سے ملاقات،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ - دستک،
- شعراء کے ساتھ ساتھ - قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

کعبہ دیکھا تو ہم دیکھتے رہ گئے
رب کا لطف و عطا دیکھتے رہ گئے

آنکھیں جھک جھک کے کعبے کو تکتی رہیں
فضلِ ربِ العلیٰ دیکھتے رہ گئے

ہم گنہگار کعبہ میں جب آ گئے
رب کی رحمت سدا دیکھتے رہ گئے

میں نے مانگی تھی کعبہ میں جو بھی دُعا
پوری ہوتی دُعا دیکھتے رہ گئے

دیکھی ہر آنکھ پُرنم خدا کے حضور
آنسوؤں کی گھٹا دیکھتے رہ گئے

میرے مولا نے بخشے گناہ بن کہے
زاہدِ بے نوا دیکھتے رہ گئے

زاہد قاسمی

خدا نے آپؐ کو عالم کی سروری دے دی
یوں بشر کے تنِ مردہ کو زندگی دے دی

جہاں میں حق کا ہے نور آپؐ کے وسیلے سے
ختم اندھیرا کیا اور روشنی دے دی

بتایا مقصدِ ہستی، دکھائی راہ سیدھی
یہ آپؐ کا ہی ہے احسان، آگہی دے دی

مقام آپؐ کا یہ ہے کہ ربِ باری نے
ذکر بلند کیا، شان اک نئی دے دی

ہے دل مچلتا درِ مصطفیٰؐ پہ جانے کو
مجھے حضورؐ کے عشق نے دیوانگی دے دی

کروڑوں بار درود و سلام آقاؐ پر
کہ بارگاہِ خدا سے وابستگی دے دی

امت الرحمٰن مومنہ

ادارہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں اپنا پیٹ بھوک کی شدت سے زمین پر ٹیک دیتا تھا اور (اسی طرح بعض دفعہ) بھوک کی شدت سے میں اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا۔ ایک روز میں اس راستے پر بیٹھ گیا جہاں سے لوگ گزرتے تھے۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (میرے پاس سے) گزرے تو میں نے ان سے کتاب اللہ کی ایک آیت کے متعلق پوچھا۔ میں نے تو ان سے اس لیے پوچھا تھا کہ وہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں، لیکن وہ گزرتے گئے اور کچھ نہ کیا۔ پھر میرے پاس سے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ گزرے تو میں نے ان سے قرآن مجید کی ایک آیت کے متعلق پوچھا۔ میں نے تو ان سے بھی اسی لیے پوچھا تھا کہ وہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلا دیں، لیکن وہ بھی گزر گئے اور انہوں نے بھی کچھ نہ کیا۔

پھر میرے پاس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مجھے دیکھا تو مسکرائے اور میرے چہرے اور دل کی کیفیت کو جان گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"ابوہریرہ!"

میں نے کہا۔" حاضر اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" ساتھ آؤ۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم چل پڑے۔ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہولیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ میں نے اجازت طلب کی تو مجھے بھی اجازت مرحمت فرمادی اور میں بھی اندر چلا گیا۔

وہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دودھ کا ایک پیالہ پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔

"یہ دودھ کہاں سے آیا؟"

گھر والوں نے کہا۔" فلاں مرد یا فلاں عورت نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہدیہ بھیجا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" ابوہریرہ!"

میں نے کہا۔" اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم (فرمایئے) حاضر ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔" اہل صفہ" کے پاس جاؤ اور انہیں میرے پاس بلا لاؤ۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ اہل صفہ درس گاہ نبوی کے طلبا اسلام کے مہمان تھے۔ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، گھر بار تھا نہ کوئی مال اور نہ کسی اور کا سہارا۔ جب بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقے کی کوئی چیز آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بھیج دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس میں سے کچھ نہ لیتے۔ اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ہدیہ آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بلا بھیجتے اور خود بھی اسے استعمال فرماتے اور انہیں بھی اس میں شریک فرماتے۔ چنانچہ اپنی اس عادت مبارکہ کے مطابق جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اہل صفہ" کو بلا لاؤ۔" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم

وسلم کی یہ بات مجھے ناگوار سی گزری (کہ ایک پیالہ دودھ ہے اور میں بھوک کی شدت سے نڈھال ہوں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے پلانے کے بجائے فرما رہے ہیں کہ اہل صفہ کو بلا لاؤ۔)

میں نے (دل میں) کہا۔ اس دودھ سے اہل صفہ کا کیا بنے گا! میں اس بات کا زیادہ حق دار ہوں کہ میں اتنا پی لوں جس سے میں طاقت حاصل کرلوں۔ چنانچہ جب وہ آئیں گے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ہی حکم دیں گے کہ میں انہیں دوں اور مجھے امید نہیں کہ اس دودھ کا کچھ حصہ مجھے بھی ملے گا۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بغیر چارہ نہیں۔

چنانچہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق) میں ان (اہل صفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے پاس آیا اور انہیں بلایا، تو وہ سب آئے اور اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دے دی اور وہ گھر میں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

''اے ابو ہریرہ!''

میں نے کہا۔

''حاضر ہوں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''یہ پیالہ پکڑو اور انہیں دو (باری باری پیش کردو۔)''

چنانچہ میں نے پیالہ لیا اور ایک ایک آدمی کو دینے لگا۔

ایک کو دیتا تو وہ پیتا یہاں تک کہ سیراب ہو جاتا، پھر وہ پیالہ مجھے لوٹا دیتا۔

میں وہ دوسرے کو دیتا۔ پس وہ پیتا حتیٰ کہ سیراب ہو جاتا پھر وہ پیالہ مجھے لوٹا دیتا۔

پھر (اگلا آدمی) پیتا اور سیراب ہو کر مجھے واپس لوٹا دیتا۔

یہاں تک کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا اور سب لوگ پی کر سیراب ہو چکے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ پکڑا اور اسے اپنے ہاتھ پر رکھا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا۔

''اے ابو ہریرہ!''

میں نے کہا۔ ''حاضر ہوں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اب میں اور تم ہی باقی رہ گئے۔''

میں نے کہا۔ ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے سچ کہا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''بیٹھ جاؤ ادھر، پیو!''

چنانچہ میں بیٹھ گیا اور دودھ پیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا۔ ''اور پیو۔'' میں نے پھر پیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے ''پیو!'' (اور میں پیتا رہا) یہاں تک کہ میں نے کہا۔

''قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا! اب میں کوئی گنجائش اس کے لیے اپنے اندر نہیں پاتا۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ''اچھا مجھے دکھاؤ۔'' چنانچہ وہ پیالہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور اس کا نام لیا اور (سب کا) کا بچا دودھ پی لیا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) اس میں معجزہ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اصحاب صفہ کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کا خیال رکھنے کا بیان ہے۔

(2) نبی صلی اللہ علیہ وسلم صدقے کی چیز نہیں کھاتے تھے، تاہم ہدیے کی چیز کھا لیتے۔

(3) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیے میں بھی دوسروں کو شریک فرماتے۔

(4) مسلمان کا بچا ہوا کھانا پینا جائز ہے، جیسے اس واقعے میں ہے۔

(5) مہمان کو مزید کھانے پینے کے لیے کہنے کا استحباب۔

(6) اگر میسر ہو تو خوب سیر ہو کر کھانا پینا بھی جائز ہے۔ خاص طور پر غریب اور بھوکے بچے کو شکم سیر کرنا مستحب ہے۔

صحابہ کی خودداری

محمد بن سیرین بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

''میرا یہ حال ہوتا کہ میں منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے کے درمیان بے ہوش ہو کر گر پڑتا، تو آنے والا آتا اور اپنا پاؤں میری گردن پر رکھ دیتا اور خیال کرتا کہ میں دیوانہ ہوں حالانکہ مجھے کوئی دیوانگی نہیں تھی۔ صرف بھوک تھی۔ (جس کی شدت سے مجھے غشی آجاتی۔'' (بخاری)

فوائد و مسائل

ا۔ گردن پر پیر رکھنے کا مقصد تحقیر و تنقیص نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ عام خیال تھا کہ اس طرح بے ہوش آدمی ہوش میں آجاتا ہے۔2 اس میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ابتدائی تنگی کے ذکر کے علاوہ ان کی خودداری اور صبر و قناعت کا بھی بیان ہے۔

وصال کے وقت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زرہ ایک یہودی کے پاس 30 صاع جو کے بدلے میں گروی رکھی ہوئی تھی (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد کے بیان کے علاوہ اہل کتاب سے ادھار وغیرہ کا معاملہ کرنے کا جواز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب ثروت صحابہ کے بجائے ایک یہودی سے قرض اسی جواز کی وضاحت کے لیے لیا، یا اس لیے کہ صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معاوضہ یا رقم واپس لینا پسند نہ فرماتے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبع غیور کو یہ پسند نہیں تھا۔

قناعت

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ جو کے بدلے میں گروی رکھی۔ اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کی روٹی اور پگھلی ہوئی چربی، جس میں کچھ تغیر آچکا تھا، لے گیا اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ فرماتے ہوئے سنا۔

''محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کے پاس صبح اور شام کو ایک صاع خوراک بھی نہیں ہوتی۔'' حالانکہ وہ تو (9) گھر تھے۔'' (بخاری)

سادگی

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کے درخت کی پتلی چھال بھری ہوئی تھی۔ (بخاری)

فوائد و مسائل

(1) ان احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی کا جو نمونہ ملتا ہے وہ آج کل کی پُرتکلف معاشرت سے کس قدر مختلف ہے جسے مسلمانوں نے بھی اپنا لیا ہے۔ کاش! مسلمان اپنے پیغمبر کی سادگی کو اختیار کریں۔

(2) نرم گداز بستر انسان کو غافل کر دیتا ہے اور رات کو اٹھنا بھی نہایت گراں گزرتا ہے۔ پھر نرم بستر پر نیند بھی زیادہ گہری آتی ہے۔

عیادت

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک انصاری آدمی آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، پھر وہ واپس جانے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے انصار کے بھائی! میرے بھائی سعد بن عبادہ کا کیا حال ہے؟"

اس نے کہا۔ "ٹھیک ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم میں سے کون ان کی عیادت کے لیے تیار ہے؟"

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہوگئے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم دس سے کچھ اوپر تھے۔ ہمارے پاس جوتے تھے نہ موزے، ٹوپیاں تھیں نہ قمیص، اس شوریلی زمین میں ہم پیدل چل رہے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچ گئے۔ چنانچہ ان کے گھر والے، ان کے پاس سے پیچھے ہٹ گئے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، وہ ان کے قریب ہوگئے۔ (مسلم)

فوائد و مسائل!

(1) اس حدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی جو کیفیت بیان کی ہے، اس کی مناسبت سے واضح ہے کہ ان میں کس قدر غربت اور سادگی تھی۔

(2) دوسرا نکتہ اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ۔۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا بھائی کہا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رشتہ دینی اخوت کا بھی ہے۔

(3) جگہ تنگ ہو تو گھر والوں کو چاہیے کہ مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کر دیں تاکہ وہ مریض کے پاس چند لمحے بیٹھ کر مریض کی عیادت کریں۔

مال جمع کرنا

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے فرزند آدم! اگر تو زائد از ضرورت مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا تو تیرے لیے بہتر ہوگا اور اگر تو اسے روکے گا تو تیرے لیے برا ہوگا۔ اور برابر سر برمال پر تو ملامت کے لائق نہیں ہوگا۔ اور (خرچ کرنے کی ابتدا ان لوگوں سے کر جن کے اخراجات زندگی کا ذمہ دار تو ہے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل

(1) اس میں جہاں اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت کے مطابق مال رکھنے کی اجازت بلکہ تاکید اور حکم ہے، وہاں دوسری طرف ضرورت سے زائد مال کو ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کا استحباب بھی ہے۔

(2) مال کے روکے رکھنے کو انسان کے حق میں برا قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ صحیح نہیں۔ دنیا میں دولت کے ارتکاز (جمع کرنے) سے گردش دولت رک جاتی ہے۔ جس سے معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور آخرت میں تو اس بخل کا انجام بد واضح ہی ہے۔

(3) بعض علما کے نزدیک سالانہ زکوٰۃ کی ادائی کے بعد مزید خرچ کرنا ضروری نہیں۔ لیکن صحیح تربات یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائی کے بعد بھی اگر کسی کے پاس دولت موجود رہے اور اہل حاجت بھی اس کے علم میں ہوں تو ان پر خرچ کرنا اس کے لیے مستحب ہی نہیں، ضروری ہے۔

کافی ہے

حضرت عبداللہ بن محصن انصاری خطمی رضی اللہ تعالیٰ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''جو شخص تم میں سے اس حال میں صبح کرے کہ وہ اپنے گھر یا قوم میں امن سے ہو، جسمانی لحاظ سے تندرست ہو اور ایک دن کی خوراک اس کے پاس موجود ہو تو گویا اس کے لیے دنیا اپنے تمام تر ساز و سامان کے ساتھ جمع کر دی گئی۔'' (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائد و مسائل

(1) امن اور صحت کے ساتھ ایک دن کی خوراک فی الواقع بہت بڑی نعمت ہے۔ گویا اسے ایسی آسودگی حاصل ہوگئی جیسی کسی کو ساری دنیا مل جانے پر ہوسکتی ہے۔ اور اگر امن یا صحت نہ ہو تو دنیا بھر کے خزانے بھی انسان کے لیے بے کار ہیں کیونکہ دولت کے انبار انسان کو امن فراہم کر سکتے ہیں نہ صحت۔

(2) اس میں بالواسطہ یہ نصیحت بھی ہے کہ انسان کو دولت کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے بلکہ صبر وقناعت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ اسی میں امن وسکون اور راحت وآسائش ہے ورنہ اس سراب کے تعاقب میں سب کچھ گنوا بیٹھنے کا خدشہ ہے۔

کامیاب

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''وہ شخص کامیاب ہوگیا جس نے اسلام قبول کرلیا اور اسے برابر سرابر روزی حاصل ہوئی اور اللہ نے اسے اپنے دیے ہوئے پر قانع بنا دیا۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل

(1) کامیابی آخرت میں اللہ کی رحمت ومغفرت سے شاد کام ہونا ہے اور اللہ کی رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ اگر بدقسمتی سے انسان کا دامن دولت اسلام سے خالی ہے تو دنیا بھر کے خزانے بھی اسے آخروی کامیابی سے ہمکنار نہیں کر سکتے۔ بلکہ دنیا سے آنکھیں موند لینے کے بعد عذاب الٰہی کے شکنجے میں کس دیا اور جہنم کی بیڑیوں میں اسے جکڑ دیا جائے گا اور یوں یہ ناکام ترین انسان ہوگا۔

(2) اسی طرح بقدر کفاف (روز مرہ ضرورت کے مطابق) روزی کے ساتھ قناعت واستغفار کا مل جانا بھی امن وسکون کی ضمانت ہے۔ ورنہ دنیا کی حرص اور زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی خواہش اور کوشش انسان کا سکون چھین لیتی ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تونگری زیادہ ساز وسامان کا نام نہیں بلکہ اصل تونگری نفس کی تونگری ہے۔

زہد

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی راتیں متواتر بھوکے گزار دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو بھی رات کا کھانا میسر نہ ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر روٹی، جو کی روٹی ہوتی (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل

اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے زہد اور تنگ دستی کا تذکرہ ہے۔

☆☆

معروف فنکارہ

زینب شبیر سے ملاقات

شاہین رشید

نازک سی، خوب صورت اور ٹیلنٹڈ فنکارہ زینب شبیر جب اس فیلڈ میں آئی تو اسے اپنی جگہ بنانے کے لیے نہ صرف بہت محنت کی ضرورت تھی بلکہ الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا کی بھی ضرورت تھی۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے جانیں۔

مجھے یاد ہے کہ اس کے ڈرامہ سیریل "سانوری" میں اس کی پرفارمنس سے متاثر ہو کر میں نے اس کا انٹرویو کیا جو کہ ان کا پہلا انٹرویو تھا۔ تب زینب نے ایک کال پر انٹرویو دیا تھا اور اب وہ پہلے جیسی زینب ہی نہیں ہے۔ فون کرو، میسج کرو، نو ریپلائی خیر اس سے قطع نظر زینب شبیر ایک اچھی اداکارہ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ اسے بہت ترقی دے۔

زینب شبیر نے اپنے فنی سفر کا آغاز 2018ء سے ڈرامہ سیریل "ماں صدقے" سے کیا اور پھر اسے لیڈنگ رولا ملا۔ "سانوری" میں انہوں نے ایک سانولی لڑکی کا کردار کیا اور بہت اچھا کیا۔ یہی سیریل اس کو اٹھاتا چلا گیا، ایک کے بعد ایک ڈرامے اسے ملنا شروع ہو گئے۔

"اب تک کیا کیا کر چکی ہیں۔ بہترین سیریل کون سا رہا آپ کا؟"

"بہترین سیریل تو "سانوری" ہی تھا کہ جس نے مجھے شہرت دی اس کے علاوہ "دکھاوا"، "ملال یار"، "حقیقت"، "تیری راہ میں"، "کہی ان کہی"، "پیا کا نام"، "مہر پوش" وغیرہ وغیرہ اور کچھ ڈرامے ان پروڈکشن ہیں اور کچھ آن ایئر ہونے والے ہیں۔

"فیملی بیک گراؤنڈ؟"

"میں 1998 میں کراچی میں پیدا ہوئی۔ ستارہ کینسر ہے کیونکہ 26 جون کو جنم لیا۔ مجھے چار سے "ماما" کہتے ہیں۔ میری تین بہنیں ہیں مجھ کو ملا کر والدین کی چار بیٹیاں اور ان میں میرا نمبر تیسرا ہے۔ گریجویشن کر چکی ہوں۔ شادی نہیں ہوئی اور ابھی ارادہ بھی نہیں ہے۔ میری مادری زبان "اردو" ہے۔ والدہ نے ہی پرورش کی اور پروان چڑھایا۔ نانی کو ہم نے "باپ" کا درجہ دیا اور نانی کی خواہش رہی اس فیلڈ کو اپنایا اور امی کی بھی بہت زیادہ خواہش تھی۔ اللہ زندگی رکھے میری ماں تو مجھے کام کرتا ہوا دیکھ رہی ہیں جبکہ "نانی" اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔

"بچپن؟"

"بچپن بہت اچھا گزرا۔ جیسا کہ سب کو پتا ہے کہ ہم چار بہنیں ہیں بڑی بہن کی شادی ہو چکی ہے۔ ماشاء اللہ اس کے دو بچے ہیں۔ دوسری بہن جاب کرتی ہے اور چوتھی بہن پڑھ رہی ہے۔ میری ماں اور نانی نے ہماری بہت اچھی پرورش کی اور کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی، نہ ہی انہوں نے یہ احساس دلایا کہ ہم کسی سے کم ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے لڑکوں کے ساتھ ہر طرح کے گیمز کھیلے، کرکٹ، بیڈ منٹن، فٹ بال اور سائیکلنگ بھی کی۔ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بہت نمایاں رہی۔ بچپن میں اور پھر بڑے ہو کر بھی نعت خوانی بھی کی۔ بچپن میں بہت شرارتی تھی اور اب بھی ہوں مگر اب ذرا انداز مختلف ہے۔"

"فیلڈ میں آمد کیسے ہوئی؟ کس نے متعارف کرایا؟"

"مجھے بچپن سے ہی اداکاری کا شوق تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اداکاری کرتی رہتی تھی۔ میرے اس جنون کو دیکھتے ہوئے امی اور نانی نے کہا کہ تم اس فیلڈ کے لیے ٹرائی کرو۔ سوشل میڈیا پر دیکھا کرتی تھی کہ کسی کو نئے فنکاروں کی ضرورت ہے اور کہاں کہاں آڈیشن ہو رہے ہیں۔ بس میری خوش قسمتی کہ مجھے ایک نجی چینل سے کال آ گئی۔ میں گئی۔ آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئی۔ فوراً ہی مجھے ڈرامہ سیریل "ماں صدقے" میں ایک چھوٹا سا کردار مل گیا جو چھوٹا بھی تھا اور نیگیٹو بھی تھا۔ اس کے بعد اسی چینل کے "سوپ" میں مجھے مرکزی کردار مل گیا۔ بس پھر قسمت کھل گئی اور ایک کے بعد ایک کام ملنے لگا۔"

"اپنے آپ کو اسکرین پر دیکھ کر کیسا لگا تھا؟"

"یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ میں ہوں۔ بہت زیادہ خوشی ہوئی تھی۔ پہلا پلے اور پہلا کمرشل سب نے دیکھا۔ بہت سراہا۔ بہت حوصلہ افزائی کی۔ بہت اچھا لگا۔ یوں اچانک اسکرین پر آئی تو سب کو لگا کہ شاید میں کسی کی سفارش سے آئی ہوں۔ کیوں کہ اس فیلڈ میں آنے کے لیے میں نے بہت سے لوگوں کو مشکلات کا شکار ہوتے دیکھا ہے۔ شروع شروع میں تھوڑی سی مشکل ہوئی تھی۔"

"اب تک جتنے ڈرامے کیے ہیں سب پوزیٹو رول تھے کوئی نیگیٹو رول بھی کیا یا کرنا چاہیں گی؟"

"جی..... نیگیٹو رول کیا ہے اور وہ بھی مرینہ خان صاحبہ کی ڈائریکشن میں اور یہ میرے لیے بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ مجھے مرینہ خان کی ڈائریکشن میں کام کرنے کا موقع ملا۔ جو کہ میری پسندیدہ آرٹسٹ ہیں۔ ڈرامے کا نام "مشکل" تھا اور اس میں میرا نیگیٹو رول تھا۔ ڈھیر سارے پوزیٹو رول کرنے کے بعد جب نیگیٹو رول آفر ہوا تو میں نے "ہاں" کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ مجھے اس کردار میں بہت پسند کیا گیا۔ اس لیے آئندہ بھی کوئی اچھا سا نیگیٹو رول آفر ہوا تو ضرور کروں گی۔ ویسے میں نے اب تک جتنے بھی ڈرامے کیے ہیں ان میں "سانوری"، "یارنہ بچھڑے" اور "مشکل" کے رول مجھے پسند ہیں۔"

"کوئی رول چیلنجنگ بھی تھا؟"

"ایک تو وہ رول جو نیگیٹو تھے وہ کافی چیلنجنگ تھے اور ایک ڈرامہ سیریل "سانوری" کی اجالا کا رول۔ اجالا میرا نام تھا اور مجھے سانولا دکھایا گیا تھا۔ جو بھی رشتہ آتا تھا وہ سانولا رنگ دیکھ کر چلا جاتا تھا، تو میں نے محسوس کیا کہ جن لڑکیوں کے رنگ سانولے ہوتے ہیں ان کو کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہوگا۔"

"کوئی ایسا کردار کرنے کی خواہش ہے جس میں کسی کی زندگی کا عکس ہو؟"

"جو کردار میں کرتی ہوں اس میں دوسروں کی زندگی کا ہی عکس ہوتا ہے۔ میں تو ایسا کردار کرنا چاہتی ہوں جس میں میری زندگی کا عکس ہو۔ ویسے تو میری یہ خواہش بھی ہے کہ میں تھوڑی سی مینٹل اور تھوڑی سی

خودسر لڑکی کا بھی رول کروں، میں ہر طرح کے کردار کرنا چاہتی ہوں۔ ایسے رول بھی جو ہمیشہ یادگار بن جائیں میرے نام کے ساتھ۔"

"گڈ..... جو لائف آپ نے گزاری والد کے بغیر۔ وہ وقت یاد آتا ہے؟"

"میری والدہ اور نانی نے مجھے اور ہم بہنوں کو کبھی کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دی۔ مگر پھر بھی میں جب اپنے گزرے کل کے بارے میں سوچتی ہوں تو مجھے ڈپریشن سا ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ ہمارا گزرا وقت بہت زیادہ مشکل تھا اس لیے اداس ہو جاتی ہوں۔"

"اور خوش کب ہوتی ہیں؟"

"جب اپنا آج دیکھتی ہوں۔ بہت اطمینان بھی ہوتا ہے اور خوشی بھی اور اچھا بھی لگتا ہے، جب اپنے ڈرامے دیکھتی ہوں تو بہت خوشی ہوتی ہے۔ مگر اپنی خامیاں بھی تلاش کرتی ہوں کہ آئندہ نہ کروں۔ بہترین پرفارمنس دوں۔"

"سوشل میڈیا نے زیادہ شہرت دی یا آپ کے کام نے؟"

"میں سمجھتی ہوں کہ مجھے میرے کام نے زیادہ شہرت دی، ویسے ابھی تو ابتداء ہے۔ ابھی کہاں اتنی شہرت ملی ہے۔ ابھی تو بہت کام کرنا ہے۔ ہاں سوشل میڈیا بھی اچھا ہے اور ابتداء میں میں ہی ہر چیز اپنی سوشل میڈیا پر شیئر کر دیا کرتی تھی۔ مگر کچھ تلخ تجربات کی بنا پر اب ہر چیز شیئر نہیں کرتی، کوئی بہت ضروری چیز ہو کوئی بہت نمایاں کام ہو تو کرتی ہوں، ورنہ نہیں پہلے تو اپنی ذاتی زندگی کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھ دیا کرتی تھی۔ اب ایسا نہیں کرتی۔ آہستہ آہستہ ہی انسان کو عقل آتی ہے۔"

"فیلڈ میں حسد ہے؟"

"بہت زیادہ..... اس فیلڈ میں مخلص، وفادار اور اچھے اور سچے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ انڈسٹری بہت اچھی ہے مگر بس کچھ برے لوگوں نے

خراب کیا ہوا ہے سچے دوستوں کا ملنا بہت مشکل ہے۔"

"کبھی اسکینڈل کا سامنا کرنا پڑا؟"

"یہاں یہ سب کچھ چلتا رہتا ہے۔ مگر میں کسی کی باتوں پر کان نہیں دھرتی۔ کسی کے ساتھ زیادہ کام کرلو تو لوگ چہ میگوئیاں کرنے لگتے ہیں۔ کسی کے ساتھ زیادہ بات کرلو تو لوگوں کو مسئلے شروع ہوجاتے ہیں۔ اس لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ میں اپنے کام سے کام رکھوں اور اوٹ پٹانگ باتوں پر دھیان نہ دوں۔"

"لوگوں کو دوسروں کی خاص طور پر لڑکیوں کی شادی کی بہت فکر ہوتی ہے۔ تمہیں بھی کہتے تو ہوں گے؟"

"جی...... بہت کہتے ہیں کہ کب کررہی ہو شادی، آئیڈیل کیا ہے وغیرہ، تو میں کوئی جواب نہیں دیتی سوائے اس کے کہ ابھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ابھی مجھے بہت آگے تک جانا ہے۔ ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے اور آئیڈیل کیا ہوتا ہے یہی کہ جو بھی بندہ ہو بیوی اور اس کے گھر والوں کی عزت کرنا جانتا ہو۔"

"کردار لیتے وقت کیا مدنظر رکھتی ہو اور کس کس کے ساتھ کام کرکے اچھا لگا؟"

"اپنا کردار دیکھتی ہوں، رائٹر اور ہدایت کار، اور اگر آپ ہدایت کار یعنی ڈائریکٹر کا پوچھ رہی ہیں تو مہرین جبار، کاشف نثار، سیف حسن بہت اچھے ہیں۔ اور میں ثانیہ سعید کے ساتھ بھی کام کرچکی ہوں۔ صبا قمر، نعمان اعجاز اور بلال عباس کے ساتھ کام کرنے کی خواہش ہے۔"

"کچھ عام سوال ہوجائیں؟"

"بی پی کب ہائی ہوجاتا ہے؟"

"جب کوئی بلاوجہ غصہ دلائے۔ کوئی منہ پر جھوٹ بولے۔"

"کبھی کسی خواب نے پریشان کیا؟"

"ہاں، ایک بار بہت عجیب سا خواب دیکھا تھا کہ میں کسی عجیب سی جگہ پر ہوں اور وہاں سے نکلنے کے لیے میں بھاگ کر ٹرک کے اوپر چڑھ جاتی ہوں اور وہ مجھے میرے گھر تک پہنچانا چاہ رہے ہیں مگر راستہ ہے کہ ختم ہی نہیں ہورہا۔"

"شادی کی رسمیں پسند ہیں۔ کوئی تجویز؟"

"شادی کی رسومات اچھی لگتی ہیں۔ رونق ہوتی ہے۔ سب سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ ہاں ایک بات یا ایک تجویز ضرور دوں گی کہ منگنی نہیں ہونی چاہیے۔ بس بات پکی ہو اور شادی ہوجائے۔ منگنی کے بھی بہت خرچے ہیں۔"

"گھر میں فنکارہ والا Attitude (نخرہ) ہوتا ہے کیا؟"

"نہیں نہیں بالکل نہیں۔ بہت رف ہوکر رہتی ہوں۔ بیڈ پر کھانا کھاتی ہوں۔ اپنی مرضی سے سارے کام کرتی ہوں، اپنی مرضی سے سوتی ہوں اپنی مرضی سے جاگتی ہوں۔ شوٹ ہو تو جلدی اٹھ جاتی ہوں ورنہ نیند کا مزہ لیتی ہوں اور دیر سے اٹھتی ہوں مما ڈانٹتی بھی ہیں تو پروا نہیں کرتی۔"

"آئینے سے کتنا پیار ہے؟"

"پیار ہو یا نہ ہو، مجبوری میں بھی دیکھنا پڑتا ہے کیونکہ میرے چہرے پر ایکنی پرابلم ہے۔ تو آئینے کے سامنے میں ان پر دوائی لگاتی ہوں۔ اس لیے آئینہ زیادہ دیکھنا پڑتا ہے۔"

"پرستاروں سے آپ کا رویہ؟"

"کوشش تو کرتی ہوں کہ کسی کو مجھ سے کوئی شکایت نہ ہو۔ فین تعریف کرتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔ خوشی ہوتی ہے۔"

"کوئی ایسی شخصیت جس سے دل کی ہر بات کی جاسکتی ہے؟"

"جب تک شادی نہیں ہوتی تب تک تو والدین اور بہن بھائی ہی ایسی شخصیات ہوتی ہیں جن سے ہر بات شیئر کی جاسکتی ہے مگر پھر کچھ باتیں بندہ شیئر نہیں کرسکتا۔ ہاں شادی کے بعد لائف پارٹنر ایسی شخصیت ہوتا ہے جس سے ہر بات بلاتکلف کی جاسکتی ہے۔"

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

م۔ب گجرات

جب تجھ سے ناتا جوڑا ایک بہترین سلسلہ ہے اس کی شروعات میں شاید سب سے زیادہ میں نے ہی تنقید کی تھی۔ بورنگ سلسلہ ہے مگر یہ سلسلہ خود بخود دل میں اپنی جگہ بناتا گیا اسی دلچسپی کی وجہ سے میں نے سوچا۔ میں اپنی والدہ کی زندگی کے بارے میں آپ کو بتاؤں وہ جن حالات سے گزریں۔

اس کائنات میں ایسا کوئی نہیں۔ جس کے باب زندگی میں دکھ نامی شے کو لکھا نہ گیا ہو کسی کو کم کسی کو زیادہ خالق کائنات کی تقسیم ہے۔ ہم بندے اس کی رضا میں راضی ہیں۔

یہ میری امی جی کے حالات زندگی ہیں۔ قلم میرا ہے الفاظ ان کے ہیں۔

س: شادی کب ہوئی؟۔

ج: 12 اپریل بروز جمعرات میں ہوئی۔

س: شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟

ج: شادی سے پہلے کچھ خاص مشاغل نہیں تھے ہم دو بھائی اور ایک بہن ہیں۔ امی جی جب میں پانچ سال کی تھی تب فوت ہوگئی تھیں۔ ہم بہن بھائیوں کو ابو جی نے سنبھالا۔ میری پھوپھو دو تھیں جن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اس لیے چھوٹی سی عمر میں ہی گھر سنبھالنا پڑا۔ میرے ابو جی لاہور میں ڈبل بس کے ڈرائیور تھے۔ بس جن کی مائیں نہیں ہوتیں ویسے ہی ہم تینوں نے پرورش پائی۔ بڑے بھائی نے اس زمانے کا ایف اے کیا اور مجھ سے چھوٹے نے بی اے اور خود میں نے بس پانچویں تک پڑھا۔ ہاں لاہور کے خواتین کالج ایفا کالج میں ہر قسم کا ہنر سیکھا۔ سلائی کڑھائی سویٹر بننا ڈیکوریشن ڈیزائن سب کچھ۔ ٹی وی ہوتا نہیں تھا کہ دادا ابا کی اجازت نہیں تھی۔ ہاں ریڈیو تھا جو واحد تفریح تھی۔ گھر کا ماحول سخت پردہ والا تھا کہیں آنا جانا نہیں۔ سہیلیوں کا تصور تو کہیں تھا ہی نہیں۔ ہاں دادا کے دوست کی بہی میری دوست بنی اور شادی کے بعد تک بھی وہی سہیلی رہی۔ اسی نے گھر کے کام کرنا سکھایا۔ بال بہت لمبے تھے وہ کرسی پر بٹھا کر میرا سر دھوتی تھی۔

شادی سے پہلے بھی زندگی بس گھر تک محدود رہی اور شادی کے بعد بھی کچھ خاص تبدیلی نہیں آئی ہاں یہ ضرور ہے۔ تھا گھر میں خوش حالی تھی۔ غربت کس چڑیا کا نام ہے پتا ہی نہ تھا۔ ہمارے باپ نے اور دادا ابا نے ہر خواہش پوری کی صرف ایک ماں کے علاوہ۔

س: رشتے میں مرضی شامل تھی؟۔

ج: جی!۔ یہ رشتہ کسی جاننے والے کے توسط سے آیا تھا ابو جی کا ایک گجرات میں بھی گھر تھا اور زیادہ تر رشتے دار گجرات میں ہی تھے بس نوکری کی وجہ سے لاہور میں رہائش کی ہوئی تھی یہ رشتہ دادا ابا کے کسی جاننے والے نے کروایا اور ان کی طرف سے ان کی خالہ اقبال اور مامی نے کروایا تھا۔

س: ذہن میں جیون ساتھی کا تصور کیسا تھا؟۔

ج: طبیعت میں سادگی تھی تو زیادہ بولنا بھی پسند نہیں تھا بس اپنے کام سے کام تصور کچھ نہیں تھا بس باپ نے کہا اب تمہاری شادی کرنی ہے تو جی اچھا جی کہا تھا۔ نہ انہوں نے لڑکے کے متعلق کچھ بتایا نہ خود سے کچھ پوچھا۔ ذہن میں بس یہی تھا شادی ہونی ہے اپنے باپ جیسا کوئی فرشتہ صفت انسان ہو، اپنے گھر جیسا کوئی گھر ہو اس کے علاوہ کچھ سوچا ہی نہ تھا کہ دنیا کن کن عذابوں سے بھری پڑی ہے، اپنے بھائیوں اور باپ دادا کے علاوہ کسی کے بارے میں معلوم ہی نہ تھا رشتے داروں میں کہیں آنا جانا بھی نہیں تھا بس گھر کی چاردیواری۔

س: منگنی کتنا عرصہ رہی؟۔

ج: جی منگنی زیادہ عرصہ نہیں رہی۔ کیونکہ ان کی رشتے کی خالہ اور امی تین دن ہمارے گھر میں ہی رہیں یہی رٹ لگائے رکھی کہ ہاں کروا کے ہی جانا ہے اصل میں والد صاحب ٹال مٹول کرتے رہے کہ گجرات شہر دور ہے۔ اتنی دور شادی نہیں کرنی وہ خود نوکری کرتے تھے۔ بس ان کی نوکری کی وجہ سے ہاں کرنا پڑی کہ یہ آرمی میں تھے اور کوئی خاص خوبی نہیں تھی اس رشتہ میں، بہر حال خاصی ضد کے بعد میرا رشتہ ہوا اور ان کی خالہ اقبال چھ ماہ کے اندر اندر بیاہ کر لے گئی۔

س: شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں خیالات؟۔

ج: ماں بچپن میں فوت ہوگئی تھی، خالہ سگی تھی نہیں قریبی رشتوں کا فقدان ہی رہا سوچا تو یہی تھا ساس ماں جیسی ہوں گی اور بہن نہیں تھی تو نندوں کو بہن بناؤں گی دیوروں کو بھائی۔ مگر ناں جی تو بے پہ روٹی ڈالیے اور یہ سوچیے کہ مرضی ہماری چلے گی تو ایسا نہیں ہوتا۔

س: شادی کے لیے کن چیزوں کی قربانی دینی پڑی؟۔

ج: ہر چیز کو قربان کر دیا' لگتا تھا میرے والد کو پہلے پتا چل گیا تھا کہ میری بیٹی یہاں خوش نہیں رہے گی اللہ پاک ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ماں باپ تو اولاد کے لیے سب اچھا سوچتے ہیں لیکن میرے اپنے نصیب میں جو خوشی سکون تھا بس اپنے میکے تک ہی نصیب میں لکھا تھا، یہاں سسرال میں تو زندگی لگتا تھا کہ اللہ پاک دنیا میں ہی دوزخ کے نظارے کروانے لگا ہے۔

س: شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کے کیا کہا؟۔

ج: جب یہ کمرے میں آئے تو ڈر کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ جناب آرمی مین نے ڈارک بلیک سوٹ پہنا ہوا تھا شاید کسی بچھڑی محبوبہ کی یاد میں تعریف تو یاد نہیں۔ ہاں آواز سن کر ساسو ماں نے دروازہ بجا دیا۔

س: شادی کے بعد کیا تبدیلیاں آئیں؟۔

ج: کوئی ایک تبدیلی؟ سر سے پاؤں تک زندگی بدل گئی' میکے گھر میں فرشتہ صفت باپ تھا محبت کرنے والے دو بھائی۔ اپنے گھر پہ اجارہ داری یہاں ساس ماں' سسر صاحب چار دیور' پانچ عدد نندیں اور ہر کوئی منہ میں انگارے لیے ہوئے ہاں میری بڑی نند اور چھوٹا دیور جس کی عمر پندرہ سال تھی وہ کچھ قابل قبول تھے۔ ورنہ اونچا بولنا ویلیاں گھیاں مارنا اور دوسرے کے معاملے کو اپنے کچے دماغ (الٹی کھوپڑی والا دماغ) سے حل کرنا ان کا پسندیدہ عمل' میں حیران پریشان۔ میں نے تو گھر میں پانچ لوگوں سے زیادہ انسان نہیں دیکھے تھے اور یہاں مجھے انسانوں کا جنگل لگا۔

خیر میری شادی کے تین ماہ بعد ہی ہمیں علیحدہ کر دیا گیا میرے سسر نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے میرے شوہر اکلوتے بیٹے تھے۔ باقی ساری اولادیں دوسری بیوی سے تھیں۔ تھے تو سب سگے ہی مگر سوتیلوں سے بڑھ کر سلوک رکھا ان سگوں نے تین ماہ بعد یہ کہہ کہ گھر سے رخصت کر دیا کہ اپنا کماؤ اپنا کھاؤ چلو جی گل ہی مک گئی۔ تو ہوا یہ کہ نہ کسی نے کمایا نہ ڈھنگ سے کھلایا۔

س: شادی کے کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟۔

ج: شادی کے تین ماہ بعد ہی ہمیں علیحدہ کر دیا گیا پہلے کے گھر۔ میں اپنے ابو جی کے گجرات والے گھر میں شفٹ ہوگئی اور یہ شفٹنگ پچیس چھبیس سال رہی۔

اس دوران محترم شوہر صاحب کسی حاتم طائی کی اولاد کی طرح آرمی کی جاب چھوڑ آئے اور جو جمع جتھا تھا اسے اڑانے لگے۔ اسی دوران ہمارے تین بچے ہوئے۔ باپ بننے کے باوجود عقل نہ آئی کہ اس اولاد کے اچھے مستقبل کے لیے کہیں مستقل مزاجی سے ٹک کر کام کروں۔ باپ کے گھر جو ہنر سیکھا تھا میں اسی سے کام چلانے لگی کچھ والد مدد کر دیتے تھے۔ آہستہ آہستہ جنہوں نے رشتہ میں اپنا حصہ ڈالا تھا۔ ملک عدم

سدھارے۔ بات پھر نصیب پہ آ کر ختم ہوتی ہے جو جس کا نصیب ہے اس نے خود اسے برتنا ہے۔ بھگتنا ہے سو تھوڑی خوشی وہ بھی اولاد کی صورت میں ملی۔ زندگی زیادہ دکھوں میں ہی گزاری۔

سسرالی رشتے علیحدگی کے باوجود ہمارے گھر چنگاری چھوڑ جاتے ہیں اور شوہر صاحب اس چنگاری سے مجھے اور گھر کو سلگاتے رہتے تھے۔ یہ تو اولاد کچھ بڑی ہوئی تو ان کی عقل شریف نے کام کرنا شروع کیا کہ بیوی اتنی محنتی اور صابر ملی ہے۔ اس کی قدر کرنی ہے تب زندگی میں تھوڑا سکون آیا۔

س: میکے اور سسرال کے کھانوں میں فرق؟۔

ج: میکے میں ہم پانچ لوگ تھے اچھے خاصے خوش خوراک۔ میرے والد جب ہم چھوٹے تھے تب خود نوکری سے گھر آ کر کھانا بناتے۔ دوپہر کو دادا ابا کچھ نہ کچھ کھلا دیتے پھر آہستہ آہستہ میں نے پکانا شروع کیا دادا کے دوست کی بہو سے ہر قسم کا کھانا بنانا سیکھا ذائقہ بہت تھا ہاتھ میں پھر اپنے سسرال میں اپنے ہنر اور کھانوں کی تعریف ہونے لگی پہلی نند کی شادی ہوئی تو باقی تمام گھر کے افراد میں، بول چال زندگی کے ڈھنگ نمایاں ہونے لگے اور میری زندگی میں سکون آنے لگا۔

س: سسرال والوں نے وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا؟۔

ج: شروع کے تین ماہ تو بہت زیادہ پھر بعد میں بھی کچھ سال سسرال کے ہر چھوٹے بڑے سائز نے خوب زچ کیا۔ میاں صاحب کانوں کے کچے بغیر تصدیق کے مہابھارت شروع کردیتے اور مخالف پارٹی کے دل ’کلیجے‘ گردوں کو ٹھنڈ پڑ جاتی میاں صاحب جو کماتے، آدھے سے زیادہ باہر خرچ کردیتے پھر بھی صبر شکر کہ اپنی محنت سے اپنے بچوں کو پڑھادیا۔

س: سسرالیوں سے وابستہ توقعات؟۔

ج: توقع تو خیر جس سے زندگی کا ناتا جڑا تھا اس سے بھی نہ رکھی اور نہ ہی نے کبھی اپنے فرائض ادا کرنے کی ضرورت بھی، انہوں نے زندگی کو بس اپنے نظریہ پر گزارا۔

س: پہلے بچے کی پیدائش پر حالات؟۔

ج: ڈیڑھ سال بعد پہلی بیٹی پیدا ہوئی۔ بڑی اور منجھلی نند پاس رکنے آئیں۔ پہلی اولاد کی خوشی میں میاں صاحب بھی خوش تھے پھر دوسری بیٹی اور بیٹے کی پیدائش پر کافی حد تک میاں کے گھر والوں کا جادو ختم ہونے لگا۔ وہ مجھ پر اور بچوں پر توجہ دینے لگے۔

س: سسرال کے ماحول کو تبدیل کرنے کی کوشش کی؟۔

ج: میرے خیال میں ایک بندہ اتنے بندوں کو کیا تبدیل کرسکتا ہے۔ اچھے ماں باپ کی اولادیں سسرال کے رنگ میں رنگ جاتی ہیں اور ہمیں تو سسرال رہنا نصیب ہی نہیں ہوا۔

آخر میں یہی کہوں گی کہ ہر والدین اپنی اولاد کا اچھا سوچ کر ہی شادی کرتے ہیں۔ یہ تو لڑکی کے اپنے نصیب ہوتے ہیں۔ ماں باپ کے اپنے اختیار میں ہوتا تو ہر لڑکی کا نصیب خود لکھتے۔

زندگی دکھوں کا سمندر تھا جس میں خوشیوں کی لہریں بہت کم آئیں سب کو جھیلا پھر بھی اپنی باپ کی عزت پہ حرف نہیں آنے دیا اور ایک ایسے انسان کے ساتھ گزارا کیا کہ آج کل کی لڑکی ہوتی تو دومنٹ نہ لگاتی اور تین لفظ مانگ لیتی۔ میں نے اپنی بیٹی کو بھی شادی کے وقت یہ ہی نصیحت کی۔ شادی ہر کسی کو راس نہیں آتی پھر بھی جو تیرا نصیب ہوگا۔ اسی پر صابر شاکر رہنا۔ کوئی یہ نہ کہے کہ اتنی صابر اور نیک عورت کی بیٹی ایسی نکلی، لڑکی کو آخری حد تک ازدواجی زندگی کو نبھانا چاہیے۔

☆☆

دستک دستک

دستک

شاہین رشید

ثمینہ اعجاز

''کیسے مزاج ہیں؟''

''الحمد للہ۔''

''سیما غزل صاحبہ کیسی ہیں؟'' (سیما غزل ثمینہ اعجاز کی خالہ ہیں)

''اللہ کا شکر ہے۔ اب بالکل ٹھیک ہیں۔''

''اور آپ کی کیا مصروف ہیں؟''

''بس وہی گھرداری اور لکھنے کی ہی مصروفیات ہیں اور تو کوئی خاص نہیں۔''

''کب سے ہیں اس فیلڈ میں..... اور کیا کیا لکھ چکی ہیں؟''

''2000 سے اس فیلڈ سے وابستہ ہوں۔ بائیس سال ہوگئے ہیں اس فیلڈ سے وابستہ ہوئے۔ تو آپ خود سوچیں کہ بائیس سال میں کیا کیا لکھا کیسے یاد ہوسکتا ہے۔ ہاں یہ یاد ہے کہ جب لکھنے کا آغاز کیا تو سنگل پلے سے۔ اس کے بعد سوپ۔ سیریلز سیریز سب کچھ لکھا۔ الحمد اللہ اور لکھ رہی ہوں۔''

''عموماً ڈائجسٹ رائٹر ٹی وی پر بعد میں اور پہلے ڈائجسٹ میں آتی ہیں۔ آپ کے ساتھ کیا صورت حال ہے؟''

''میں کسی ڈائجسٹ سے نہیں آئی بلکہ میں ڈائریکٹ ٹی وی کی طرف آئی ہوں۔ میں نے کوئی افسانہ کوئی ناول کبھی نہیں لکھا۔ ڈائریکٹ، اسکرپٹنگ کی طرف آئی۔ مجھے اس فیلڈ میں لانے والی میری خالہ ''سیما غزل'' صاحبہ ہیں۔''

''اچھا ..... سیما غزل صاحبہ خود بہت اچھی لکھاری ہیں اور زبیر عباسی صاحب کو کون بھول سکتا ہے۔ تو پھر کیسے اندازہ ہوا کہ آپ میں ٹیلنٹ ہے؟''

''ایسا تھا کہ میری خالہ سیما غزل مجھے اکثر کہا کرتی تھیں کہ تم میں ٹیلنٹ ہے تم بھی لکھا کرو۔ مگر جو چوں کہ اس وقت میرے بچے بھی چھوٹے تھے اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرے میاں صاحب بھی مجھے اجازت نہیں دیں گے تو میں بس ٹال مٹول کرتی رہتی تھی۔ لیکن جب سیما غزل صاحبہ نے زیادہ کہا تو میں نے ایک کہانی ان کے ساتھ شیئر کی۔ انہیں کہانی پسند آئی اور انہوں نے کہا کہ بس اب تم لکھو..... اور میں نے لکھ دیا۔''

''ظاہر ہے کہ لکھنا آپ کو ''ورثے'' میں ملا تو آپ کیوں نہ لکھ پاتیں؟''

''جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں اور بڑی بات یہ کہ اللہ کامیابیاں دیتا چلا گیا۔''

''کہانی کا پلاٹ کب ذہن میں آتا ہے اور کیا لکھنا اچھا لگتا ہے۔ سوپ سیریل یا سنگل پلے؟''

''جہاں تک کہانی کے پلاٹ کی بات ہے تو آپ کو یہ سن کر بڑی حیرانی ہوگی کہ جب میں سو رہی ہوتی ہوں تو میرے ذہن میں کہانیاں چلنا شروع ہوجاتی ہیں اور جو ''گرہیں'' میری کہانی میں پڑی ہوتی ہوتی ہیں وہ کھلنا شروع ہوجاتی ہیں۔ تو میرے بیک آف مائنڈ میں سب چیزیں چل رہی ہوتی ہیں اور رہی بات کہ لکھنے میں کیا اچھا لگتا ہے تو ''لانگ پلے'' لکھنے میں زیادہ مزہ آتا ہے اس لیے میرے سارے لانگ پلے لائٹر موڈ کے ہیں ان کو لکھنا مجھے آسان بھی لگتا ہے اور اچھا بھی، باقی سیریل اور سوپ ذرا سنجیدہ ٹائپ کے ہی لکھتی ہوں۔''

''آسان کیا ہے...... سیریل یا سوپ؟''

''میرا خیال ہے کہ سوپ ہو یا پھر سیریل، دونوں میں ہی برابر کی محنت ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ سوپ چونکہ روز مرہ کی کہانی ہوتی ہے تو آسانی سے لکھی جاسکتی ہے تو ایسا بالکل نہیں ہے کیونکہ سوپ کی اقساط بھی کبھار سو سے بھی زیادہ ہو جاتی ہیں اور اتنی زیادہ قسطیں لکھنا تسلسل کے ساتھ کہ ہمیں بھول نہ جائے آسان کام نہیں ہے۔''

''کچھ یاد ہے کہ پہلا سیریل کون سا تھا آپ کا؟''

''ہاں...... یہ تو مجھے بالکل یاد ہے۔ میرا پہلا سیریل ''ماہ رخ'' کے نام سے تھا۔ بہت پسند کیا گیا تھا۔ بس پھر اس کے بعد سلسلہ جو چلا تو آج تک چل رہا ہے۔''

''آپ کے لکھنے کا بہترین ٹائم کیا ہے؟''

''جب میں نے لکھنے کی ابتدا کی تب سے اب تک میرے لکھنے کا بہترین ٹائم میرے حساب سے صبح کا ہی ہے۔ جب بچے چھوٹے تھے تو صبح کے وقت ہی ٹائم ملتا تھا تو بس پھر ایسی عادت ہوئی کہ آج تک صبح کے وقت ہی لکھتی ہوں۔''

''جب بچے چھوٹے تھے تب اور اب جبکہ بڑے ہو گئے ہیں اور بیٹیاں اپنے گھروں کی تو گھر ڈسٹرب ہوتا تھا یا ہوتا ہے؟''

''اللہ کا شکر ہے کہ گھر کبھی ڈسٹرب نہیں ہوا۔ دن کے وقت لکھتی ہوں۔ جب یا تو گھر والے سو رہے ہوتے ہیں یا اپنے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں۔ تو کبھی گھر داری متاثر نہیں ہوئی۔ کھانا بھی بہت اچھا پکاتی ہوں اور گھر کی صفائی ستھرائی کا بھی بہت جنون ہے۔ ہاں بس برتن دھونے بعض اوقات مشکل لگتے ہیں۔''

''بہت شکریہ ثمینہ نئے سیریل پر آپ سے بات ہوگی۔''

☆☆

شعاع کے ساتھ ساتھ

ادارہ

رضوانہ وقاص.....کرلاں ہری پور

س "شعاع کب پڑھنا شروع کیا؟"

ج "شعاع طالب علمی کے زمانے میں جس عمر میں بس پڑھنے کا شوق اس وقت کوئی سمجھ ہی نہیں تھی۔ لیکن ایسا چسکا پڑا پھر اس کا ساتھ ہی نہ چھوٹا نہ چھوٹے گا۔ بچوں کی کتابیں بھی پڑھی ہیں۔ اب بھی مجھے نونہال پڑھتا دیکھ کر بچے بھی پوچھتے ہیں۔ مما کیا پڑھتی ہیں۔ ہمیں بھی سنائیں۔ میں بولتی ہوں یہ آپ کے پڑھنے کی نہیں۔ احمد اب ماشاء اللہ چھٹی میں جائے گا۔ تھوڑا بہت پڑھ لیتا ہے۔ نونہال کی کہانیاں تھوڑی بہت سمجھ آجاتی ہے اور بچے اب خوش ہوتے ہیں۔ مما آپ کا کتابوں میں نام آتا ہے۔ مجھے پڑھائی پر بھی ایسی ڈانٹ نہیں پڑی جب اسکول میں تھی امی کہتی تھیں پڑھائی خراب ہوگی۔

اب تو ماشاء اللہ میرے شوہر اتنے اچھے ہیں۔ انہوں نے کہا تم لکھو میں پوسٹ کروں گا۔ روز بازار آتا جاتا ہوں اور ہر مہینے ڈائجسٹ لا کر بھی دیتے ہیں۔ جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔

س "دن کا آغاز کب ہوتا ہے؟"

ج "الحمدللہ صبح کی نماز پڑھتے ہیں۔ سب بچوں نے اسکول جلدی جانا ہوتا ہے۔ کہتی ہوں نماز پڑھ کر اپنے اسکول کی تیاری کریں اب ماشاءاللہ ارسلان بھی اسکول جانے لگا ہے۔ سب سے پہلے جاگ جاتا ہے اور پھر اپنے بھائیوں کو بھی کہتا ہے اٹھو دیر ہو رہی ہے اسکول نہیں جانا۔ ناشتہ امی بناتی ہیں۔ صبح کا ٹائم اچھا لگتا ہے۔ اب سردی کی آمد ہے آرام سے ہی بستر سے نکلتے ہیں۔ میری امی میرے لیے بہت قیمتی ہیں۔ میرے بچوں کا اتنا خیال رکھتی ہیں۔ میری دعا ہے۔ میرے بچے کسی کا دل نہ دکھائیں اچھے بچے بن جائیں۔ میری امی کو میری دعائیں لگیں کسی کی محتاج نہ ہوں۔ میرے بچے فرماں بردار بنیں اس قابل ہو جائیں کہ میرا علاج کروائیں مجھے سنبھال لیں۔ (آمین)

س "آپ کی خوبیاں؟"

ج "خوبیاں کوئی دوسرا بتائے تو اچھا لگتا ہے۔ لیکن ادھر کوئی نہیں خوبیاں بتاتے چلیے میں خود ہی بتا دوں۔ غریبوں کے لیے بہت دل دکھتا ہے۔ کسی کا دل نہیں دکھا سکتی۔ پہلے بہت اچھی تھی سب سے پیار کے ساتھ بولنا لیکن اب چڑچڑی ہوگئی ہوں۔ جلدی غصہ آجاتا ہے۔ سب کہتے ہیں پہلے تم اتنی اچھی تھیں سب کے ساتھ اب کیا ہو گیا۔

چارپائی پر رہ رہ کر تھک گئی ہوں۔ معافی بھی مانگ لیتی ہوں کہ امی ناراض نہ ہو جائیں اتنا خیال کرتی ہیں میرا۔ مجھ سے کوئی چیز مانگنے میں نہ نہیں کر سکتی۔ کسی سے میں مانگ لوں مجھے پتہ چل جائے نہ ملے پھر غصہ آجاتا ہے۔ کسی سے ناراض نہیں رہ سکتی اور کوشش کرتی ہوں مجھ سے بھی کوئی ناراض نہ ہو۔ اور اپنے شوہر سے تو بالکل بھی نہیں۔ فوراً کہتی ہوں آپ مجھ سے ناراض تو نہیں پلیز ہونا بھی نہیں۔"

س "آپ کی خامیاں؟"

ج "خامیاں بھی بہت ہیں۔ پتا ہے میں سب کے ساتھ اچھی ہوں۔ کوئی مجھ سے جھوٹ بولے۔ یا بات چھپائے تو غصہ آجاتا ہے۔ میں جو بات بھی ہوتی ہے منہ پر بول دیتی ہوں۔ جو ناراض ہوتا ہے۔ ہوتا رہے بات دل میں نہیں رکھتی۔"

س "سالگرہ مناتی ہیں؟"

ج "نہیں جی اپنی سالگرہ کبھی نہیں منائی۔ شادی کے بعد ایک دفعہ شوہر نے گھڑی دی باندھنے

کے لیے خوش ہوگئی بچوں کی سالگرہ پر سورۃ لیس پڑھتی ہوں۔ پھر جس دن سالگرہ ہو دعا کر لیتے ہیں بچوں کی مناتے ہے۔ کیونکہ اب بچے ہی ہماری زندگی ہیں۔ اللہ انہیں صحت وتندرستی والی لمبی زندگی دے ایمان کے ساتھ (آمین)"

س "پسندیدہ اشعار؟"

ج "یہ بہت پسند ہے۔ اپنے شوہر کے لیے۔"

وہ جو سوچتا ہے اس کی وضاحت بھی نہیں کرتا
وہ تو کھل کے محبت بھی نہیں کرتا
جتنا ٹوٹ کے چاہا ہے ہم نے تمہیں
اس طرح تو کوئی عبادت بھی نہیں کرتا

☆☆☆

جب تک زندہ ہوں
تب تک حال پوچھ لیا کرو
اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ
مٹی میں سوجانے کے بعد
بھلا دینا رواج ہے دنیا کا

☆☆☆

س "بارش کیسی لگتی ہے؟"

ج "بارش اسکول میں اچھی لگتی تھی۔ اب تو بارش میں سردی لگتی ہے اور میری سردیاں تو ساری بستر میں ہی گزرتی ہیں۔ بچے بارش میں نہا کر کپڑے بھی گندے کر لیتے ہیں اور ٹھنڈ بھی لگ جاتی ہے۔ منع کرتی ہوں پھر سوچتی ہوں۔ یہی عمر ہوتی ہے مستی کرنے کی۔ جی لو زندگی بھرپور طریقے سے۔"

س "پسندیدہ کتاب؟"

ج "قرآن مجید اسلامی کتابیں، عبقری بچوں کے اسکول کی کتابیں پڑھتی ہوں۔ اس کے علاوہ ہر کتاب۔ خواتین۔ شعاع کی تو بات ہی الگ ہے۔ اور جو بھی اچھی کتاب مل جائے پڑھ لیتی ہوں۔"

☆☆

ہاشمی کا خوب صورت افسانہ "حصہ" دل کو لگا بلکہ دل دکھ سا گیا۔ بالکل سچ ہے کہ بیٹیاں شادی کے بعد میکے میں مہمان سے زیادہ نہیں ہوتی ہیں۔ اور صبا تحریم کا "شکل و صورت" بھی اچھا ہی رہا۔ اس کے علاوہ "آپ جیسی" حنظلہ نبیل دین نے مختصر مگر جامع کہانی رقم کی۔ اچھی لگی افسانوں میں "نیا دل مبارک" صائمہ نور نے نمبر ون لکھا اور ہمیں تو بہت ہی اچھا لگا۔ سونیا ربانی نے میں ایک بے چارہ شوہر ہوں دلچسپ لکھا، اب جلدی سے بتایئے کون بے چارا یا بے چاری اپنی سرگزشت سنانے کو باقی ہے میرے خیال سے سسر محترم کو بھی موقع دیا جائے تا کہ وہ بھی اپنے دکھ بیان کر سکیں، کیا خیال ہے۔ اور جناب سال نو کا سروے بہترین لگا، تمام قارئین نے بہت شاندار لکھا۔

"پیارے نبی کی پیاری باتیں" ہمیشہ کی طرح اس بار بھی عالی شان لگیں۔ دل کو چھو لینے والی باتیں اتنی محنت سے یہ سلسلہ مرتب کرنے پر اللہ تعالیٰ آپ سب کو خوش رکھے، جزائے خیر دے، آمین۔

ج: پیاری تسنیم! آپ کو شعاع پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک پسند آیا۔ یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے لیکن آپ یہ بھی لکھ دیتیں کہ کون سی تحریر یا سلسلہ زیادہ پسند آیا تو ہمیں زیادہ اچھا لگتا۔ آپ ہمارے تینوں پرچوں کی نہ صرف باقاعدہ قاری ہیں بلکہ بڑی باقاعدگی سے خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار بھی کرتی ہیں آپ کی رائے کے لیے بے حد شکریہ۔

رضوانہ وقاص کرلاں ہری پور سے لکھتی ہیں

شعاع ملا پہنچے والے دن، 7 تاریخ کو میرے بیٹے عالیان کی سالگرہ کا دن۔ ماڈل سدرہ جبار کی سنوری بہت ہی پیاری تھی۔ جیولری بہت ہی پیاری تھی۔ مجھے بتائیں آپ کو کوئی ماڈل نہیں ملتی۔ سدرہ جبار یا پھر فرینہ اعجاز۔ پلیز نیلم منیر، علیزہ شاہ یا پھر عائزہ دانش کو لگا دیں۔ "پہلی شعاع" پڑھی 2022ء مہنگائی کا دور بہت ہی مہنگائی ہوگئی ہے۔ اللہ کرے 2023ء اچھا ثابت ہو۔

حمد و نعت دونوں پڑھی۔ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" ساری کی ساری بہت ہی پیاری۔ ہما چودھری سے ملاقات اچھی لگی۔

"امید بہار" پڑھا۔ سونیا ربانی آپ کو کیا مسئلہ

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

تسنیم کوثر ایف بی ایریا کراچی سے شرکت کر رہی ہیں

اس بار آپ کی پیاری سی محفل میں خود کو نہ پا کر دل کو دھکا سا لگا مگر سروے میں خود کو موجود دیکھ کر خوشی ہوئی۔

نوشین فیاض کا تحریر کردہ ناول "سنگ تیرے میرے مہرباں" بے حد اچھا لگا، ماشاءاللہ انہوں نے بہت عمدہ اور دلکش کہانی لکھی ہے۔ دوسرا افرح بخاری کا ناول "شام شہر ہجر" بھی خوب رہا بہت پسند آیا۔ اور "عمر پیسرا" کو بھی حسنہ حسین بخوبی لے کر چل رہی ہیں۔

ایک بات کہوں تمام ناول میں تحریم ابدال کا ناولٹ "آشنائی تک" سب سے نمبر ون لگا، ان کی اسٹوری میں دلچسپی آخر تک برقرار رہی مصنفہ کو مبارک باد۔ شازیہ الطاف

ہے۔آپ بتایئے گا۔اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔آمین۔میرے لیے بھی دعا کرنی ہے۔شکریہ رمشا روشن میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں کب ہو رہی ہے شادی؟ ہمیں ضرور بلانا ہے۔ابھی شادی ہوئی نہیں ساس، بہو کے جھگڑوں کا بڑا پتا ہے (ہاہاہا) ریحانہ وقاص۔یہ بات آپ نے ٹھیک بولی میں آپ سے اتفاق کرتی ہوں۔مہنگائی اتنی زیادہ ہے۔تو واقعی بازاروں میں رش دیکھ کر لگتا ہے۔واقعی لوگ بہت خوش حال ہیں۔سلمیٰ مسرت بہت بہت مبارک ہو عمرے کی۔جبیں چیمہ، ربیعہ نسرین، نجمہ جبار، صائمہ گل، طلعت ثنا، عائشہ عامر، زرینہ خانم، تسنیم کوثر۔سب نے اچھا لکھا اور میں خود نے بھی اچھا لکھا سب کی باتیں اچھی لگیں۔

"والحصر" مجھے ورلی کی وجہ سے یہ کہانی بہت پسند تھی۔لیکن اب اس پر بہت غصہ آتا ہے۔پلیز عینی کے ساتھ کچھ برا نہیں ہونا چاہیے۔"آپ جیسی" کی مجھے کچھ ہی نہیں آئی۔"نیا دل مبارک" اروبی پر سخت غصہ آیا ہے۔جا بجا ناقدری کرواتی رہی۔"موبائل" جو یہ ہر گھر کی کہانی ہے۔نجی آصف نے اچھا لکھا ہے۔"حصہ" بہت ہی اچھا لکھا شازیہ الطاف نے ویلڈن جی کیا بات ہے۔

سب کے ہی خط اچھے لگے، تبصرے پسند آئے۔علیزہ بلال۔ثانیہ جعفر۔آپ دونوں بہنیں ہیں اور بتانا ہے آپ کس شہر سے شرکت کر رہی ہیں۔آرہ اکبر شاہ سے کچھ نہیں آتی۔میرے شوہر بہت تعاون کرتے ہیں مجھ سے۔دل سے شکریہ جی بہت بہت۔میرا خط وہی پوسٹ کرواتے ہیں۔میں تو سب کو یاد کرتی ہوں۔مجھے بھی کوئی یاد کر لیا کریں گی۔

ج: پیاری رضوانہ پیارے عالیان کے لیے مبارک باد کے ساتھ بہت ساری دعائیں۔بیشتر خطوں میں قارئین باقاعدگی سے خط لکھنے والی قارئین کو یاد کرتی ہیں۔لیکن صفحات کی کمی کی وجہ سے خطوط کا وہ حصہ ایڈٹ ہو جاتا ہے ویسے بھی ہم اس بات کو ٹھیک نہیں سمجھتے کہ کسی مخصوص قاری بہن کا ذکر کیا جائے۔ہمیں بہت ساری قارئین خط لکھتی ہیں اور تقریباً سب ہی بہت اچھے خط لکھتی ہیں۔کسی ایک کا نام لکھنے سے ان بہنوں کی دل شکنی ہوتی ہے جن کا نام شامل نہیں ہوتا۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ کے شوہر آپ سے تعاون کرتے ہیں۔واقعی آپ کے شوہر بہت اچھے ہیں ورنہ شوہر حضرات کو خواتین کے ذاتی مشاغل خصوصاً کتابیں یا رسالے پڑھنے سے بہت چڑ ہوتی ہے۔

صدف ناصر نے گوجرانوالہ سے لکھا ہے

نئے سال کا پہلا شمارہ پیاری سی ماڈل کے ساتھ بہت پیارا لگا۔محفل شعاع سے زیادہ اتفاق نہیں کیا کیونکہ جو حالات جا رہے ہیں۔ہمیں تو امید کی کوئی کرن نظر نہیں آ رہی۔مایوسی ہی چھائی ہے۔

"حمد۔نعت" سے دلی لطف اٹھایا۔شمیم فاطمہ کی نعت بے حد عمیق ہے۔ماشاءاللہ "پیارے نبی کی پیاری باتیں" تمام تر اخلاق حسنہ سے مزین رہا۔ہر بات قابل تقلید ہے۔سب ہی خطوط اور تبصرے شاندار ہیں۔منیبہ مہر فرحان اور علیزہ بلال کی محبتوں پر شکر گزار ہوں۔خوش رہیں ہمیشہ اور ناہیدہ سا گل واپس تشریف لے آئیں محفل میں۔

مکمل ناول سے تحریروں کو ویلکم کہا۔"شہر شام ہجر" ایک اچھی رائیٹر اور اچھی تحریر۔طوفان میں حادثے کی صورت حال فلمی سی محسوس ہوئی۔مگر مجموعی طور پر آغاز اچھا ہے پلاٹ اور تحریر میں کرداروں کے نام بھی زبردست۔آپ کا بہت شکریہ کہ ہلکی پھلکی سی گھریلو تحریر شروع کی۔اس پریشان حالی میں ہماری بھرکم تحریریں مزید سر درد کا باعث تھی ہیں۔ایک بات اور کہ تحریر کا عنوان بھی اچھا ہے۔

نوشین فیاض کو سلیوٹ پیش کرنے کو دل چاہ رہا ہے جنہوں نے "سنگ تیرے میرے مہربان" لکھ کر دل خوش کر دیا۔تحریر میں جہاں ڈھیروں اسباق تھے وہیں پر سب ہی موسموں اور رشتوں کی خوب صورتیاں بھی موجود ہیں۔"فروا" کا کردار خاصا بازنشور رہا اور باسط کو اس کی اکڑ اور نام نہاد انا کی ٹھیک سزا ملی۔ہر کردار کے ساتھ ٹھیک ٹھیک انصاف کیا مصنفہ نے۔اگر مثلی ذکر کروں گی اس جملے کا "رسالے پڑھنے والیاں اتنی پھوہڑ نہیں ہوتیں کہ پکوڑے بھی نہ بنا سکیں۔" یہ جملہ میری پوری زندگی کی کہانی ہے۔چائے بنانا، پکوڑے بنانا کیا ہوتا ہے۔معلوم ہی نہیں تھا۔بس کتابیں، رسالے اور ڈائریاں۔پھر شعاع اور خواتین کے سبب خالدہ جیلانی کی مہربانیوں سے آج سب کچھ

جھٹ پٹ بنالیتی ہوں۔ ماشاء اللہ اور شادی کے بعد دوسرے ماہ کی بات ہے، پکوڑوں کا سامان دو لوگوں کے لیے تیار کرنا تھا۔ کوئی دس لوگوں جتنا بنا ڈالا۔ (پھوہڑتھی) پھر ٹھنڈے برف آئل میں پکوڑے ڈالے۔ سارا آمیزہ ریزہ ریزہ ہوا۔ بے حد پریشان ہو کر لاہور سے گوجرانوالہ اپنی ساس کو کال کی کہ پکوڑوں کو کیا ہو گیا ہے۔ موبائل نند نے پکڑا اور بولی۔

"واہ ایم اے پاس لڑکی کو پکوڑے بھی بنانا نہیں آتے۔"

پھر وہ دن اور آج کا دن، یہ طعنہ نہیں دہرانے دیا کسی کو۔ ہر چیز زبردست بنالیتی ہوں بعد سالوں کے۔ (ہاہاہا)

ناولٹ دن بدن اکلوتا ہوتا جا رہا ہے۔ بھئی سیانے کہتے ہیں۔ "ایک سے دو بھلے۔"

"آشنائی تک" تحریم ابدال نے لکھ کر ان تمام لڑکیوں اور عورتوں کی آنکھیں کھول دی ہوں گی جو بے جا خود سری اور مظلومیت کا ڈھونگ رچا کر واپس میکے آبیٹھتی ہیں۔

ناول "والعصر" کی طرف توجہ فرمائی۔ عامر اور ریاتا پسندیدہ کردار۔

"افسانوں کی دنیا" میں بہار ہی بہار ہوتی ہے اب۔ یہ خواتین اور شعاع کی منفرد ترین خصوصیت ہے کہ تقریباً ہر ماہ نئی رائیٹر کا اضافہ لازم و ملزوم ہے اور نئی رائیٹرز مایوس بھی نہیں کرتیں۔

حمیلہ لال دین "آپ جیسی" کے ساتھ شامل تحریر ہوئی ہیں۔ نیا پلاٹ اور اچھا انداز تحریر۔ "حصہ" شازیہ الطاف کا افسانہ اور سچ میں حقیقت پر مبنی لکھا۔ "ماہی" بڑے غرور سے شوہر کا گھر چھوڑ کر میکے آن بیٹھی اور ملا کیا سوائے دکھ اور ٹھوکروں کے۔ ویل ڈن اشازیہ۔

"نیا دل مبارک" بھی بہت اچھی تحریر۔ صائمہ نور اچھی رائیٹر ہیں خواہ ناول لکھیں یا کچھ بھی۔ "اروہی" اپنی کم عقلی اور بے وقوفی کی بنا پر اپنا بستا بستا گھر اجاڑنے کے درپے تھی شکر کہ بروقت آنکھیں کھل گئیں۔ "زہیر" جیسے "فراڈیے" جگہ جگہ گھات لگائے بیٹھے ہیں "موبائل" لے کر لیتی آصف بیٹھی ہیں۔ بہت ہی تلخ حقیقت بیان کی مصنفہ نے۔ یہ بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ سالوں بعد بھی ملنا ملانا ہو تو ہاتھوں میں موبائل۔ نہ کوئی گرم جوشی نہ دکھ کی نہ سکھ کی۔ انسان کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی۔

"میں ایک بے چارا" متاثر نہیں کر پائی۔

عاصمہ فرحین دل کا راستہ لیے بیٹھی ہیں۔ ہلکی پھلکی مزاحیہ سی تحریر اچھی لگی۔

"شکل و صورت" بہت افسردہ سی تحریر۔ افسانے اختتام پذیر ہوئے۔ اور زبردست بات یہ ہے کہ اب سارے افسانے بے حد مختصر ہوتے ہیں۔ بہت شکریہ ادارے اور رائیٹرز کا۔

"باتوں سے خوشبو آئے" آل دی بیسٹ سلسلہ ہے۔ "خصلت" پڑھ کر اش اش کر اٹھی کیونکہ چند دنوں سے بے حد دل برداشتہ تھی اور گھر والوں کی جان کھائے رکھی کہ ہر ایک کے ساتھ بہترین سلوک کرتی ہوں مگر لوگ مجال ہے ذرا بھی اپنی خصلت سے باز آجائیں۔

مجموعی طور پر نئے سال کا شمارہ بغیر کسی جھوٹ اور مبالغہ آرائی کے ہنڈرڈ پرسنٹ رہا۔

ج: پیاری صدف! حالات جس حد تک خراب ہیں۔ اس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں لیکن مایوسی گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھیں۔ حالات جلد بہتر ہوں گے۔ ان شاء اللہ

آپ کا تبصرہ حسب روایت شان دار ہے۔ بہت شکریہ۔

مہوش خولہ راؤ لکھتی ہیں

2022 کے شماروں میں خط سروے اور افسانہ لگا کر ہمیں جگہ دیتے رہے جب تشکر کا وقت آیا تو ہمیں رسالے سے باہر رکھا، میرا دردمندانہ سوال "جنوری کے شمارے سے مجھے کیوں نکالا" کہیں نہیں تھے ہم۔ خط سروے کی محنت تو ضائع ہو افسانہ کی امید باقی ہے۔ نہایت عرق ریزی سے مصنفات کی پچھلے سال کی کارکردگی پر تبصرہ کیا ہمارے کرم ری اشاعت کر کے ان تک پہنچا دیجیے۔ گزشتہ سال نئی کہانی چھپالیس افسانہ نگار خواتین کو پڑھا۔ نئی رائٹرز کی بھی ایک کھیپ متعارف ہوئی۔ میری طرف سے اس سال کی نمبرون افسانہ نگار ماجدہ ریحان قرار پائیں، ان کی تحاریر نے بہت متاثر کیا۔ میرا شفیع نے بھی افسانہ پورشن میں سب سے زیادہ جگہ گھیری لیکن مزاح میں ان کا رنگ گہرا تھا۔ قرۃ العین خرم

باجی' مریم انصاری' صائمہ نور کو پڑھ کر بھی پڑھنے کا حق ادا ہوا۔ ناول نگاری میں بھارت کی آسیہ رئیس خان خوبصورت اضافہ ثابت ہوئی ہیں ان کا ناول "ہو کے مجبور" اچھا لگا تھا خواتین میں اور بھی اچھے ناول انہوں نے لکھے۔ سو لکھتی رہیے شوق سے پڑھ رہے ہیں۔ ہم اور بلبلیں گزشتہ سال کی بہترین تحریر تھی۔ سلسلے وار ناول نور القلوب پسندیدہ تحریر رہی۔ نور القلوب کے تفصیلی تبصرے کی اشاعت ممکن نہیں تو تنزیلہ ریاض تک ہی پہنچا دیجیے۔ اس ماہ کے شعاع میں خط سروے پڑھنے کے بعد فرح کا ناول شروع کیا ہے۔ اختتام پر باقی آئندہ درج تھا تبھی رائے بھی آئندہ ہی ملے گی۔ فرح کا انداز لیکن بن باجی جیسا دوبارہ کب ملے گا۔ دبیلہ، منصب کا ایکسیڈنٹ جس وقت ہوا صرف اس وقت سنسنی محسوس ہوئی۔

شہلا خان کا خط پڑھا ان کا ناولٹ کفارہ شائع ہو چکا ہے اور میں نے اس پر تبصرہ بھی کیا تھا مصنفہ کی نظر سے نہیں گزرا اس کی اشاعت ہو چکی ہے اس سے پہلے مصنفہ نے اپنا بھی تعارف کروایا تھا کہ یہ ابروڈ سے ہیں اور پہلے بھی لکھتی رہیں ہیں۔ کہانی یہ تھی نا کہ لڑکا اپنی کزن پلس فیانسی کو لٹکا ہوا چھوڑ کر باہر ملک شادی کرتا ہے اور پھر اپنے بیوی بچوں کے رویے سے دل برداشتہ ہو کر وطن واپسی پر بوڑھے والدین کی خدمت کا ارادہ بناتا ہے جہاں اس کی بچپن کی منگ اس کے والدین کی خدمت کر رہی ہوتی ہے۔

ریحانہ مہر سے گزارش ہے خط سروے میں شامل ہوا کریں۔ رضوانہ وقاص کی وادی سردیوں میں پانی کا پوچھتیں رشک آیا۔ یہاں گرمی میں ہی کوئی پانی کا پوچھے۔ پڑوسی شہر ٹنڈو آدم سے مشعل کا خط اچھا لگا۔ رمشا روشن دو بہنوں کی اک گھر میں شادی کر لیجیے لیکن پھر زندگی جو کی بیٹھی ہو موازنے سے بچیے گا۔ شیلہ لال دین کا انداز تحریر متاثر کن تھا بالکل نو آموز نہیں لگیں۔ صائمہ نور کے افسانے کا نام منفرد لیکن افسانہ اس مرتبہ متاثر نہیں کر سکا۔ صبا تحریم کے افسانے نے ڈپریس کر دیا۔ کالا رنگ کالا نصیب اس محاورے کا کیا ہوا روپ کی روئے کرم کی کھائے آخری پیرا بہتر تھا لیکن اچھا اثر نہیں۔ باقی مطالعہ جاری۔

ج: پیاری مہوش ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی قارئین کو بھول جائیں اور آپ تو ہماری مصنفہ بھی ہیں۔ مصنفین کو تو ہم خصوصی اہمیت دیتے ہیں۔ پہلی بات آپ کا خط نہیں ملا۔ آپ نے ڈاک سے بھیجا تھا یا ای میل کیا تھا۔ آپ نے بہت اچھا تبصرہ کیا۔ نور القلوب پر تفصیلی تبصرہ کیجیے، ہم ضرور شائع کریں گے۔

ریحانہ وقاص لاہور سے شریک محفل ہیں

بائیس تاریخ کو بچوں کے پیپرز ختم ہوتے ہی ہم اپنے میکے سدھار گئے۔ سفر بھی خاصا خوفناک کیا۔ دھند نے موٹر وے بند کروادی اور دوسرے راستے سے جاتے ہوئے ایسے لگ رہا تھا کہ ہم کسی کالے اندھے کنوئیں میں جا رہے ہیں کیونکہ کالا گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ پانچ گھنٹے کا سفر آٹھ نو گھنٹے میں طے ہوا۔ لیکن شکر خدا کا خیر خیریت سے بچوں سمیت گھر پہنچ گئے اور گھر آ کر بستروں میں گھس گئے۔

خیر کیم سے ملتان کے بازار کے چکر کاٹنے لگے کہ شعاع رسالہ آیا ہے کہ نہیں لیکن نہ جی نہ کیم کو آیا نہ دو نہ تین، چار کو ہماری بس ہو گئی۔ پھر ہم نے اپنی سسرال لاہور اپنی جیٹھانی کو فون کھڑکا یا، انہوں نے ہمیں خوش خبری دی کہ رسالہ آ چکا ہے۔ ہم فوراً شاپ پر جانے کے بجائے ملتان کتاب گھر پہنچ گئے اور کاؤنٹر پر پہنچ کر پہلا سوال رسالے کا کیا وہ بولا باجی آپ کے سامنے تو پڑا ہے۔ ہم نے بے تابی سے رسالہ اٹھایا اپنے ساتھ لگایا۔ دکاندار حیران کن نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اگلی صبح تک رسالہ پورے کا پورا ہم میں ٹرانسفر ہو چکا تھا (یہ تھی ہماری لازوال محبت کی جھلک) باتیں تو ہماری ختم نہیں ہوں گی اور یہ بھی آپ نے کٹ کٹا دینی ہیں۔ فیر فیدہ کی (پھر فائدہ کیا)۔

سرورق کی حسینہ ایک ہاتھ سے ٹیکہ پکڑے اور دوسرے ہاتھ کی ایک انگلی سے ہار کی طرف اشارہ کر رہی تھی (نجانے کیا) اس دفعہ تو "سونیا ناز" چھائی رہی شعاع خواتین اور کرن میں بھی (ویل ڈن)

"پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" مختلف عادتوں باتوں پر نہایت خوب صورت باتیں تھیں ہمیشہ کی طرح۔ "دیکھا چوہدری" کو ہم پہلی مرتبہ ہی دیکھ رہے ہیں۔ صائمہ گل مردان سے اور صفیہ مہر فرحان نے میرے افسانے کو پسند کیا بہت بہت شکریاں دونوں بہنوں کا۔

"شکل وصورت" کالے رنگ پر لکھی گئی اچھی تحریر تھی "نیا دل مبارک" اتنا اچھا شوہر؟ کہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ۔ "موبائل" تو گھر گھر کی کہانی ٹھہری، سنگ تیرے میرے مہربان مکمل ناول ایک غلط فہمی محرم کو مجرم بنا گئی۔ لیکن جو ہوتا ہے اچھے کے لیے ہوتا ہے اللہ نے جوڑیاں بہتر بنائی ہوتی ہیں۔ "حصہ" اعلیٰ تحریر خوب صورت پیغام تھی۔ بہنوں کا بس چلے تو وہ بھائیوں سے بھی کچھ نہ لیں۔ بھائی دعاؤں کا بھی حصہ ہوتے ہیں۔ بہنوں کی "آشنائی تک" ایک سبق آموز پیغام۔ انا میں زندگی نہیں گزرتی "بے چاری نند" کے بعد پیش خدمت تھا میں ایک بے چارا شوہر ہوں" سونیا ربانی نے اچھا لکھا۔ گھر گھر کی کہانی یا پھر ہر شوہر کی "عمر ایسرا" پر تو آکر لفظ ہی ختم ہو جاتے ہیں رلا ہی دیا۔ کیا کمال لکھا (ویل ڈن)

"نصیحت" میں حنا بشریٰ نے اچھی نصیحت کی واقعی ایسا ہی ہوتا ہے جب تک کام والیوں پر توجہ نہ دو وہ کام پر توجہ نہیں دیتیں ماں کے سر پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ بعض اوقات تو دل کرتا ہے کہ ان سے بہتر ہے کہ بندہ خود ہی کرلے اچھا کرلے جو وہ اکثر گند پر گند ڈال جاتی ہیں۔ موسم کے پکوان میں "خشخاش چکن" تو کچھ عجیب ترکیب لگی۔ اور ہاں ہمارا کوئی اور افسانہ قابل غور ہے کہ نہیں؟......

ج: پیاری ریحانہ! آپ کے افسانے تو کئی قابل غور ہیں۔ آپ میں صلاحیت ہے اور اللہ نے چاہا تو ایک دن آپ بہت اچھا لکھیں گی۔ بس محنت جاری رکھیے۔

کام والیوں کا شکوہ آپ کو ہی نہیں ہم نے تقریباً ساری خواتین کو یہی شکوہ کرتے دیکھا ہے لیکن ہم اس سے متفق نہیں۔ آپ اپنے ایک گھر کا کام پورا نہیں کر پاتیں تب ہی گھر میں ماسی رکھتی ہیں جبکہ وہ دس گھروں میں کام کر کے اپنے گھر جا کر پھر روٹی' جھاڑو برتن کرتی ہیں بچے پالتی ہیں' ایسے میں کہیں کسی کام میں کمی یا کوتاہی ہو تو معاف کر دیا کریں۔ انسانی طاقت محدود ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی دیکھیں کہ اتنی محنت کے بعد انہیں معاوضہ بھی نہایت قلیل ملتا ہے۔

انیسہ عائش کوٹ رادھا کشن: قصور سے لکھتی ہیں

"شعاع" پڑھا۔ سب سے پہلا نمبر" واصف" کا رہا۔ دوسرے نمبر پر بہت اچھا۔ دل کو چھوتا ناول فرح بخاری کا "شام شہر ہجر" تھا۔ آخر میں باقی آٹھ ماہ پڑھ کر خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ ایک مزید بہترین ناول نوشین فیاض کا سنگ تیرے میرے مہربان۔ مزے دار آغاز۔ اداس وسط اور مسرت آمیز اختتام۔ ناولٹ آشنائی تک بلاشبہ منفرد نوعیت کا تھا مگر اختتام میں کچھ کمی رہ گئی "نیا دل مبارک" مزاح سے بھرپور موبائل حقیقت سے قریب "نصیحت" (پراثر) شکل وصورت (امید افزا) "حصہ" ترش ذائقہ لیا ہوا تھا۔ "دل کا راستہ"، "آپ جیسی" کچھ خاص نہ لگے۔ (پیشگی معذرت) میں ایک بے چارا شوہر نے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ سب سے آخر میں "عمر ایسرا" پڑھا۔ ہماری تمنا ہے کہ یہ ناول اب اختتام پذیر ہو جائے۔ باقی تمام سلسلے بھی اچھے رہے۔ خطوط آپ کے پڑھ کر لطف آیا۔ ایک بات پوچھنی تھی کہ خطوط اور افسانوں کے لیے ایک لائن اور صفحے کی پشت خالی چھوڑنا لازمی ہے۔ ضرور بتایئے گا۔

ج: پیاری انیسہ......! آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی' ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں' عمر ایسرا کا اس ماہ اختتام ہو رہا ہے۔ صفحہ اور لائن چھوڑنا لازمی ہے۔

شعاع آپ کو پسند آیا' تہہ دل سے شکریہ۔

اسلام آباد سے سامعہ مخی نے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

دوڑتے بھاگتے' شب و روز میں یہ رسالے تازہ ہوا کا جھونکا بن کر آتے ہیں اور اب تو یہ جان کر اور خوشی ہو رہی ہے کہ ہم انہیں آن لائن پڑھ سکیں گے۔ کیا ہم اپنی کہانیاں بھی آن لائن بھجوا سکتے ہیں؟ آن لائن بھجوانے کے لیے کیا پروسیجر ہو؟ پلیز اس کے بارے میں تھوڑا انفارم کر دیں۔ سابقہ دو سال کے معمول کے مطابق سب سے پہلے "عمر ایسرا" کی جانب سے پڑھے۔ آخری قسط کی امید تھی مگر "باقی آئندہ" نے پھر اختتام لٹکا دیا۔ حسنہ حسین نے بلاشبہ بہت خوبصورت تحریر لکھی ہے مگر کئی جگہ کہانی بے جا کھنچتی ہوئی محسوس ہوئی۔ لیکن دل میں ایک ننھے منے سے شکوے نے سر اٹھایا کہ......

ہم جیسی نئی لکھنے والیاں اگر ایسا طویل لکھیں تو آپ

٭ہمیں بھی مشورہ دیتے ہیں کہ مختصر لکھیں اور مختصر لکھنے کی صورت میں آپ کہیں گے، کہانی میں نمک کی کمی ہے یا کرداروں کو منطقی انجام تک نہیں پہنچایا گیا۔

(یہ بات مجھے کہی گئی تھی جب میں نے کافی سال پہلے ایک مکمل ناول "یہ شام شام زندگی" آپ کو بھیجا تھا۔ تب میں آپ کی بزم میں یاسمین مغل کی حیثیت سے شریک ہوئی تھی) وہ ناول کہاں گیا۔ کچھ پتا نہیں چلا۔ پھر ایک اور بھیجا تھا "بند دریچے" اس کا بھی پتا نہیں چلا۔ شارٹ اسٹوریز بھیجیں۔ "کفارہ" اور "چیک میٹ" کے نام سے وہ گم۔ پھر میں نے لاسٹ ایئر آپ کو "تفیس شدہ" بھیجی کچھ پتا نہیں اس کا بھی۔

پھر ہمت چھوڑنے کا ہی دل کرتا ہے۔ میرے پاس دس بارہ ناولز کے ڈرافٹس لکھے پڑے ہیں جنہیں میں بہتر کر کے آپ کو بھیجنا چاہتی ہوں مگر یہ سوچ کالی بلی کی طرح راستہ کاٹ لیتی ہے کہ "کیا فائدہ' اتنا وقت' پیسہ' انرجی لگانے کا؟" پھر میرا فولڈر کئی ماہ بند پڑا رہتا ہے۔ پھر نظروں سے کوئی ایسی تحریر گزرتی ہے کہ بے اختیار دل میں یہ سوچ جنم لیتی ہے۔ یہ کیسے؟ میں کیوں نہیں؟ دل میں اضطراب' انگلیوں میں بے چینی ذہن میں ہمہ وقت کرداروں کی جنگ..... لکھنے کی 'ہڑک' جان نہیں چھوڑتی! کم بخت!

عاصمہ فرحین نے ڈاکٹر فہد کے ساتھ ہونے والی "ٹریجڈی" بڑی زبردست دکھائی' ایک فوڈی کی نیوٹریشنسٹ سے شادی.....اُف اُف! اس سے بڑھ کر اور کوئی سزا نہیں دی جاسکتی تھی ویسے یہ ڈائٹ اور نیوٹریشن کا کیڑا میرے اندر بھی بدرجہ اتم موجود ہے مگر شکر ہے کہ میاں صاحب ایسے نہیں۔ ورنہ واقعی میں بڑا مشکل۔

پیاری یاسمین! ہمیں آپ کا ایک افسانہ یاد ہے شاید توہین رسالت کے موضوع پر تھا۔ یہ ناول جس کے نام آپ نے لکھے ہیں قطعاً یاد نہیں۔ اگر آپ کے پاس ان کی نقل ہو تو آپ ہمیں ای میل کر دیں ہمارا ای میل ایڈریس درج ذیل ہے۔

Shuaa@Khawteen digest.com

فرحانہ مہتاز نے گوجرہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں۔

22 فروری 2019 کو ایک سفر کیا جب لکھا تھا کہ ہم نے یہ مشکل فیصلہ بچوں کے مستقبل کے لیے کیا اب پھر وہی مشکل فیصلہ کیا شاید ایک عورت ہمیشہ سے قربانی دیتی ہے اور اب تو ہم دونوں نے اپنی خواہشات کو پس پردہ ڈال کر بچوں کی پڑھائی کے لیے بہت بڑا قدم اٹھایا۔ 22 فروری کو جب اسلام آباد آئے تو ٹھیک ایک ماہ بعد یہاں پر کووڈ19 کی وجہ سے لاک ڈاؤن ہو گیا۔ بہت مشکل دن تھے بچوں کے لیے نیا ماحول تھا۔ ہر وقت چھوٹے سے گھر میں بند رہتے ہر وقت پریشانی۔ فراز بھی پریشان اور جھنجلائے رہتے کہ کب یہاں پر اسکول کھلیں اور بچے جو اپنے لیونگ سرٹیفکیٹ لے کر آئے ہیں، ان کے داخلے ہو سکیں۔

میں نے یہ دن بہت صبر سے کاٹے۔ اللہ اللہ کر کے آٹھ ماہ بعد لاک ڈاؤن ختم ہوا۔ اسکولز میں داخلے شروع ہو گئے۔ ہمارے گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی چاروں بچوں کے داخلے ہو گئے زندگی مصروف ہو گئی مگر کرونا کے اس پروسیجر کے بعد نہ تو بچوں کو صحیح تعلیم مل سکی۔ مہنگائی تو بس اسلام آباد کی ہے۔

میں اپنے گھر کا نظام میانہ روی سے چلانے لگی مگر یہاں کے فیڈرل بورڈ میں بھی تعلیم صحیح نہیں، جس ایریا میں ہم رہتے ہیں وہاں پر تعلیم کا فروغ بہت کم تھا۔ ہر تین ماہ بعد لاک ڈاؤن ہو جاتا اسلام آباد کے حالات خراب رہے۔ ہم نے بچوں کو ٹیوشن لگا دی۔ ہماری بھرکم رقم ٹیوشن پر جانے لگی۔ لیکن ٹیوشن کے دو گھنٹے کیا کرتے جب اسکول میں ہی تعلیم کو سیریس نہ لیتے۔ گھروں کا کرایہ آسمان کو چھونے لگا۔ وہی لوگ مزے میں رہتے جن کے گھر کرائے پر تھے۔

وہ اسمارٹ شہر شاید ہمارے لیے نہ تھا کہ ہم اپنے سویٹ سٹی آ گئے جہاں میرا اپنا گھر ہے، اچھے اسکول ہیں، صاف پانی ہے خالص دودھ۔ اسلام آباد میں ہر وقت پیٹ میں درد گردوں کا درد مہنگائی کا درد پڑھائی کا درد لیکن ان رسالوں سے جو ثابت قدمی کا درس لیا، اس پر قائم رہی۔ شعاع اور خواتین کے ساتھ جڑی رہی۔

اب فراز بھی پریشان تھے کہ میری پرائیویٹ نوکری

ہے، کاروبار تو گوجرہ میں میرا دیور چلا رہا ہے کہنے لگے میں چار پانچ سال لگا کر آ جاؤں گا تب تک اس سیلری سے کچھ انویسٹمنٹ کر کے آگے بچوں کی پڑھائی پر خرچ کریں گے، شاید ہائر ایجوکیشن کے لیے پھر یہیں آنا پڑے۔ یہ تو اللہ بہتر جانتا ہے بہرحال دو سال دس ماہ کے حالات کو کوزے میں بند کر کے اپنی پیاری قارئین تک پہنچا دیا آپ سے یہی ریکویسٹ ہے کہ آپ بھی میرے لیے میرے گھر کے لیے دعا کریں۔

آپی! میرے لیے دعا کریں آنسو ورق پر نظر نہیں آئیں گے کہ وہ جو لکھتے وقت میرے رخسار بھگوتے رہے۔ ایسے فیصلے جو بچوں کے اچھے مستقبل کے لیے کیے جائیں۔ وہاں دل پر پتھر رکھنا پڑتا ہے حوصلوں کو بڑھانا پڑتا ہے من کو مارنا پڑتا ہے۔

واپسی کا سارا راستہ روتے گزرا کہ بڑی دعاؤں کے ساتھ میں وہاں گئی تھی۔ اللہ سے دعائیں ہی ہماری آزمائش ختم کرتی ہیں۔ یہاں پر سب خوش تھے سوائے دیورانی کے ان تین سالوں میں سب یہی کہتے کب واپس آؤ گے بچوں کو لے کر اپنے شہر۔ آ جاؤ لیکن ہم تعلیم کی وجہ سے صد کر رہے مگر تعلیم؟

میرے دیور ہمارے لیے ہمارا گھر ایسا کرنے لگے سب خوش خاص میری امی جان جن کا وہاں دل نہیں لگا تھا۔ اپنوں میں خوش رہیں گی وہ مصروف زندگی۔ انجان لوگ، سب مفاد پرست تھے۔

پیاری مہناز! آپ کا خط پڑھ کر احساس ہوا کہ والدین اولاد کی خاطر کتنی قربانیاں دیتے ہیں وہ اپنی زندگی اپنا عیش و آرام اور اپنی خوشیاں تیاگ کر اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے سوچتے ہیں۔ اس لیے اپنے والدین یا شوہر کے والدین کا احترام عزت اور ان سے محبت ہر چیز پر مقدم ہو گئی۔ آپ کی خوشیوں کے لیے دعا گو ہیں

مسرت نور ٹانک سٹی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

سرورق ماڈل سرخ کپڑوں میں بہت زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ دسمبر کا شمارہ بھی بے انتہا اچھا تھا۔ جنوری بھی شعاع ہمیشہ کی طرح لاجواب۔ حمد باری تعالیٰ نعت شریف روح کو تسکین ملتی ہے پیاری باتیں میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ دستک میں مریم نواز کے بارے میں پڑھا اچھا لگا معروف فنکارہ ہیا چوہدری سے ملاقات اچھی لگی۔ سال نو، امید بہار سب کے سوالات کے جوابات اچھے لگے۔ افسانے اس دفعہ زبردست تھے۔ صبا تحریم کا افسانہ ”شکل و صورت“ بہت زبردست تحریر تھی۔ خوب صورتی ہی سب کچھ نہیں ہوتی سیرت کو بھی دیکھنا چاہیے مکمل ناول، سنگ تیرے میرے مہربان بہت اچھا لگا میں سمجھتی ہوں باسط کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ ان میں جو غلط فہمیاں ہوئی تھیں ان سب کو دور کر کے اس کا اینڈ اور اچھا ہو جاتا ناولٹ تحریر ابدال کا آشنائی تک بہت ہی لاجواب تحریر تھی اس میں لوگوں کے لیے سبق بھی شامل تھا والدین کے لیے بھی اور لڑکیوں کے لیے بھی جو اپنا گھر تباہ کر لیتی ہیں ایسے والدین کو مثبت سوچنا چاہیے اور ایسی لڑکیوں کو بھی۔ رائٹر نے بہت ہی اچھے انداز سے ناولٹ لکھا یہ کہانی مجھے بہت پسند آئی شاباش تحریر ابدال۔

اب آتی ہوں دسمبر کا شمارہ 2022 سال کا آخری شمارہ، افسانے دسمبر کے سب ہی زبردست تھے لیکن جو مجھے سب سے زیادہ اچھا لگا وہ تھا افسانہ قدرت کے فیصلے۔ نظیرہ فاطمہ صاحبہ کا جب میں یہ افسانہ پڑھ رہی تھی تو ساتھ ساتھ رو رہی تھی بے اولاد ہونے کا دکھ مجھ سے زیادہ کون سمجھتا ہے۔ مکمل ناول میرے ہرجائی میرے دلدار شازیہ جمال طارق صاحبہ کی لاجواب تحریر۔

مجھے پتا ہے میں اتنا اچھا نہیں لکھ پاتی جیسے اور لکھتے ہیں، پتا نہیں میری بات جو میں کرنا چاہتی ہوں آپ کو پہنچا پائی ہوں یا نہیں۔

ج: پیاری مسرت! آپ نے بہت اچھا خط لکھا اور آپ کی بات بھی ہم تک پہنچ گئی ہے۔ آپ کی اتنی محبت ہمارے لیے باعث فخر ہونے کے ساتھ ساتھ خوشی کا باعث بھی ہے۔

دستک میں مریم نواز نہیں مریم نور سے بات چیت تھی سہواً مریم نواز کا نام شائع ہو گیا۔

سونیا ہانی نے قاضیاں محلہ ہالا سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

جنوری کا شمارہ ہمارے پیچھے پیچھے ہمارے سسرال چلا آیا۔ ہم بچوں کو ساتھ لے کر چھٹیاں گزارنے اپنے

پیسرال آئے ہوئے تھے اور گاؤں آکر بہت اچھا لگا صحت بھی ٹھیک رہی اور بچوں کے چاچا کی شادی کی تیاریاں بھی کرلیں جنوری کے آخر تک شادی ہونی ہے بچوں کے ساتھ کھیتوں کا بھی چکر لگایا، بہت اچھا لگا اب آتے ہیں شعاع کی طرف۔

ٹائٹل ٹھیک ہی تھا مجھے سرخ رنگ بالکل پسند نہیں جبکہ ارسہ میری بیٹی کا فیورٹ ہے، پہلی شعاع سے شروع کیا اور آخر تک پڑھ لیا۔ نبی ﷺ کی باتیں۔ ہر بار کوئی نہ کوئی لائن سوچنے پر مجبور کردیتی ہے اس بار خود پسندی کے بارے میں پڑھ کر میں بیچ بیچ سوچ میں پڑ گئی۔ اللہ ہم سب کو استغفار کرنے کی عادت ڈالے۔ حال تو یہ ہے کہ لوگ اچھا لباس پہن کر خود کو کوئی اور ہی شے سمجھنے لگ جاتے ہیں اس بار تو بینا چوہدری پہ بھی نظر ڈالی اور دستک میں مریم نور کے سارے جواب پڑھ ڈالے۔ اس کے بعد مکمل ناول کی باری آئی عصر یسرا مجھے لگا کہ آخری قسط ہوگی مگر پڑھ کر لگ رہا ہے کہ شاید ابھی کچھ باقی ہے۔ بندہ ظالم ہو کمینہ ہو مگر باسط نہ ہو تو بالکل ٹھیک کیا فرمانے۔ مگر یہ باسط تو بہت بڑا گدھا نکلا یار۔ اچھا ناول تھا اور فرح بخاری کا قمر شام بجر بہت مزا آیا پہلا حصہ پڑھ کر اور مجھے لگ رہا ہے کہ منصب اور وسیلہ کا ماضی شاید جڑا ہوا ہے آخری حصے کے بعد اس ناول پہ بات کریں گے، ناولٹ آشنائی تک حمرین اقبال نے اماں جی کی شکل میں عزین کو اچھا سبق دیا۔ اور اب باری آتی ہے ہم جیسے افسانہ نگاروں کی تو جناب بہت بہت شکریہ کہ اس بار مجھ سے پہلے کسی کو بے چارے شوہر کا خیال نہ آیا ایک بار پھر سے شکریہ۔ شازیہ کا "حصہ" یار مجھے حیرت سے ہوتی ہے جب کسی ایسی ماں کے بارے میں پڑھتی ہوں جیسی ماہی کی ماں تھی بچوں سے چیزیں چھپا دیں نانی ایسی تو نہیں ہوتی مگر خیر کہانی تھی عاصمہ کا دل کا راستہ مجھے تو مہک کی تعریف سن کر پتا چل گیا تھا کہ وہ ایک نیوٹریشن ہے۔ اور آخر میں اپنا افسانہ پڑھ کر بھی مزہ آیا۔ خط آپ کے تو جناب سارے پڑھ ڈالے اور سب نے ہی خوب تبصرے کیے اور جن لڑکیوں کے افسانے نہیں جگہ پا رہے ہیں تو ہمت نہ ہار دینا لڑکیوں میرے پاس کئی افسانے آدھے لکھے پڑے

ہیں کئی پورے ،اور کئی ایسے ہیں جن کو کئی بار لکھا اور جب جا کر جگہ ملی بار بار لکھو۔ ہمت نہ ہارو۔

ج: پیاری سونیا۔ سالگرہ کی دلی مبارک باد اور دعائیں ۔اللہ تعالیٰ آپ کو صحت وتندرستی کے ساتھ طویل زندگی عطا فرمائے آمین۔

نئی مصنفین کے لیے پیغام دے کر آپ نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ بے شک کوشش اور مسلسل کوشش ہی کامیابی کا راز ہے، تبصرہ اچھا لگا۔ بہت شکریہ۔

ذل حزل گجر نے احمد پور شرقیہ سے لکھا ہے

رسالے والے کے پاس پہنچے میری ایک کلاس فیلو دوست بھی ساتھ تھی اور اس سے میں نے کہہ رکھا تھا میرا شعاع ایوارڈ شو اور اس میں ایک نظم بھی شائع ہوگی جیسے ہی میں نے رسالہ لیا اس نے جھپٹ کر کھولا اور ایک ایک صفحہ چھان مارا لیکن شعاع ایوارڈ شو ملنا تھا نہ ملا اس کے سامنے ہمیں سبکی اٹھانی پڑی اور دل اچاٹ ہو گیا پڑھنے سے۔

بس میں خط آپ کے کھولے اور اپنا خط پڑھا آپی آپ کا شکریہ کہ آپ نے اتنا تسلی بخش جواب دیا کم از کم میں نے افسانوں سے پڑھنا اسٹارٹ کیا۔

پہلا افسانہ نیا دلی مبارک مزا دے گیا اروی کا جان بوجھ کر ریان کو ستانا لیکن ریان صاحب کا ضبط کمال کا تھا ،ویلڈن صائمہ نور سے یاد آیا زینب نور کہاں گم ہو گئی ہیں۔ زینب جلدی سے حرارِ محبت کی طرح کا کوئی ناول لے کر آجائیں، شکل وصورت صبا تحریم آپ نے بہت اچھا سبق دیا، آپ جیسی ہنیلہ۔ لعل دین' نیا نام۔ لیکن بہت اچھا لکھا انہوں نے۔ موبائل لتی آصف صاحبہ اچھا تھا "حصہ" مجھے پڑھتے ہوئے نیند آنے لگی تو کچھ میں نہ آسکا اب خط لکھتے ہوئے آپی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ماں نے بچی کو مٹھائی نہ دی چاہے وہ بعد میں خراب ہو کر ڈسٹ بن میں ڈالی گئی لیکن بہن نے اپنا حصہ بھائی کو دے دیا مطلب اچھی تھی کہانی۔ جی میں ایک بے چارا ہائے رے یہ میں نے سوچا تھا کہ لکھ کر بھیجوں گی لیکن سونیا جی آپ نے لکھ کر پوسٹ بھی کر دیا۔ اچھا تھا مزا دے گیا۔ بے چارے شوہر کا احوال۔

دوسرے دن ناولٹ آشنائی تک پڑھا ۔ امیر ماں باپ صحیح ہے کہ اپنی بیٹیوں کے لاڈ اٹھائیں لیکن ان کی شادیوں کے بعد ان کی ازدواجی زندگی میں مداخلت نہ کریں، میاں بیوی کے مسئلے مسائل انہیں خود ہی حل کرنے دیں، اچھا سبق تھا ناولٹ میں مزہ آیا کہانی پڑھ کر۔ اس کے بعد والعصر پڑھا۔ بے چارے عیسیٰ کے ساتھ ناانصافیاں ہو رہی ہیں امت الصبور شہزادی عیسیٰ کا کریکٹر سوچا تو نہیں ہے آپ کا کہانی میں اب ذرا روانی آرہی ہے مزے کی قسط تھی مجھے خولہ اسی پرسنٹ رجا لگتی ہے اور شرر چالیس پرسنٹ مفتاح تو ساٹھ پرسنٹ عیسیٰ اور آتش ننانوے اشاریہ نو پرسنٹ عباد اور زیرو پوائنٹ زیرو نائن پرسنٹ عیسیٰ (دیکھیے میرے تکے کہاں تک ٹھیک ثابت ہوتے ہیں۔) پھر سنگ تیرے مہربان مکمل ناول پڑھا شروع شروع میں کہانی مزاحیہ لگی۔

مزے کا ناول تھا اینڈ میں اسٹوری سیریس ہوتی گئی لیکن کہانی پہ گرفت مضبوط تھی نوشین فیاض صاحبہ کی زبردست فہرست۔ میں فرح بخاری کا نام دیکھا تو دل بلیوں اچھلنے لگا شہر شام ہجر اچھی کہانی لگ رہی ہے۔ مجھے اور آپی کو یوں محسوس ہو رہا ہے ایلیا مومن کو پسند کرتی ہے ویسے ایلیا زبردست نام تھا۔

عمر یسرا کیا ناول ہے اس ناول کو ابھی ختم نہ کیا جائے (ہاں نا اتنے مزے کی تو کہانی ہے)

مجھے لگا تھا کہ فارس کی بچی پیدا ہوگی جو کہ ریان شیرازی کی ہیروئن ہوگی اور حسنہ حسین عمر ایسرا سیزن ٹو لے کر حاضر ہوں گی لیکن ایسا نہ ہوا ۔اچھا میری ایک معصومانہ سی خواہش ہے کہ فارس اور جنت کو میری طرف سے بیٹے کی مبارک دی جائے۔ سروے میں ساری بہنوں کے جوابات زبردست لگے خاص کر رمشا روشن کے رمشا کیسا لگ رہا ہے دلہن بن کر؟

ج: پیاری ذل۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے آپ نے دو افسانے بھجوائے ہیں ہایک قاری والا ۔ وہ قابل غور ہے جبکہ دوسرا افسانہ "کیا ہم" ناقابل اشاعت ہے آپ اس افسانے میں جو کہنا چاہتی تھیں کہہ نہیں پائیں۔ بھرپور تفصیل تبصرے کے لیے شکریہ۔

☆☆

حمیرا شفیع

نیا سال، نئی کہانی

سبزی مارکیٹ سے میاں جی کا فون آیا۔
"بیگم! آج پکانے کے لیے کیا لاؤں؟"
آلو گوبھی
آلو بینگن
آلو پالک
یا پھر
آلو مٹر"
وہ ان کے ٹھنڈے ٹھار لہجے سے سمجھ گئی کہ سبزیوں کے دام بھی بہت بڑھ گئے ہوں گے جبکہ مہینے کے آخر میں ان کی جیب کی حالت اس سے ڈھکی چھپی تو نہ تھی۔ اس لیے دھیرے سے بولی۔
"آپ صرف آلو لے آئیں۔ فریزر میں تھوڑا سا چکن رکھا ہے وہی ڈال کر شوربہ بنالوں گی۔"
حقیقت میں اس بار بجٹ کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا تھا۔ دسمبر میں لگاتار دو چار شادیاں نمٹانی پڑیں۔ ایک آدھ چکر گاؤں کا لگا تو ساری بچت ٹھکانے لگ گئی۔ روز افزوں بڑھتی مہنگائی نے الگ کباڑا کر رکھا ہے۔ تنخواہ میں چند ہزار کا اضافہ اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر ثابت ہوتا ہے۔
خیر میاں آلو لائے تو اس نے سالن بنانا شروع کیا۔ اتنے میں ڈور بیل بجی۔ بچوں نے دروازہ کھولا اور ساتھ ہی نعرہ لگایا۔
"بڑی پھوپھو آگئیں۔" وہ بھی سیدھی کچن میں ہی تشریف لے آئیں۔
"کیا بن رہا ہے؟ بڑے مزے کی خوشبو آرہی ہے بھئی۔"
"آپا! آلو چکن کا شوربا بنا رہی ہوں۔" اس نے خوش دلی سے استقبال کیا۔
"ہائے اللہ چکن......؟ مہینے کے آخر میں یہ عیاشی تم ہی افورڈ کرسکتی ہو......"

"نہیں آپا! یہ تو نجانے کب کا پیکٹ رکھا رہ گیا تھا۔" وہ بلاوجہ شرمندہ ہوئی۔

"بھئی بڑی ذخیرہ اندوز ہو تم...... ہمارا تو ہاتھ بہت کھلا ہے۔ مہینے کے شروع میں میاں جو گوشت لا کر دیتے ہیں۔ وہ ہفتے پندرہ دن میں سب کا سب دعوتوں میں نمٹ جاتا ہے۔"

وہ بھی بہت مہمان نواز واقع ہوئی تھی۔ خود ان کی فیملی اس بار تین دفعہ ان کے ہاں دعوت کھا کر گئے تھے۔ مگر اس معاملے میں ان کی یادداشت بڑی کمزور تھی۔ اسے بھی منہ پر جتانا پسند نہیں تھا۔ اس لیے خاموش ہی رہی۔

"یہ سنک میں جھوٹے برتن کیوں رکھے ہیں؟ اب تک دھوئے نہیں تم نے ......؟" ایک اور اعتراض۔

"وہ آپا! صبح سے کپڑے دھو رہی تھی تو وقت نہیں ملا۔"

"ہاتھ کے ہاتھ دھو لیا کرو۔ بے برکتی ہوتی ہے۔"

"جی اچھا......"

"یہ چپلیں بڑی پیاری پہن رکھی ہیں تم نے ......کہاں سے خریدیں......؟" اب کے ان کی عقابی نظروں نے اس کی نئی چپلوں کو تاڑ لیا۔

"آپا......! وہ چھوٹی بہن نے دی ہیں۔"

"ہیں کیا......؟" وہ اچھل پڑیں۔

"تم اپنے سے چھوٹوں سے بھی تحفے بٹورتی ہو ......؟"

"نہیں آپا ...... اس نے آن لائن خریدی تھیں۔ سائز صحیح نہیں آیا تو مجھے دے دیں۔"

"یہ آج کل کی لڑکیوں کو نجانے آن لائن شاپنگ کا کیا خبط ہے۔ نرا پیسے کا ضیاع ہے یہ ......"

"آپا ......! کھانا تیار ہو گیا ہے۔ میں میز پر لگاتی ہوں۔ آپ ہاتھ دھوئیں۔" وہ جلدی سے برتن نکالنے لگی۔

"سالن بہت مزے کا ہے مگر یہ ادرک لہسن کیوں تیرتے پھر رہے ہیں شوربے میں ...... اچھی طرح سے کیوں پیسا کیا......؟"

"وہ آپا...... چوپر خراب پڑا ہے۔" وہ کچھ گڑبڑائی۔

"ہاں تو کونڈی ڈنڈے سے کوٹ لیا کرو اور ہاں سبز دھنیے کو بھی ڈنڈیوں سمیت کاٹا کرو۔ وٹامنز ہوتے ہیں ان میں بھی......"

پھر انہوں نے خوب رغبت سے کھانا کھایا اور کٹوری بھر کر میاں کے لیے بھی لے جانا نہ بھولیں۔ وہ رخصت ہوئیں تو اس کے سینے میں کب کی رکی سانس خارج ہوئی۔

"اف تو بہ کتنے اعتراض کرتی ہیں آپا......!"

اس کی یہ نند بڑی نکتہ چیں طبیعت کی مالک تھیں۔ ہمیشہ سے ہی اس کے لیے ایک امتحان ثابت ہوئی تھیں۔ باقی تو اس کی دیورانیاں، جٹھانیاں انہیں پلٹ کر جواب دے دیتی تھیں مگر وہ خاموش ہی رہتی تھی۔ ایک تو فطرتاً امن پسند واقع ہوئی تھی۔ کچھ میاں بھی اپنی بہن کے معاملے میں ضرورت سے زیادہ حساس واقع ہوئے تھے۔ اس لیے زبان بندی میں ہی عافیت تھی۔

اس دن وہ پڑوس سے آئی تو بچوں نے بتایا پھوپھو کا فون آیا تھا۔ نئے سال کی مبارک باد دے رہی تھیں۔

"ہیں کیا نیا سال......! نیا سال آ بھی گیا۔"

حالانکہ سارا دسمبر بچے اس کے سامنے ہیپی نیو ایئر ہیپی نیو ایئر گاتے رہے تھے۔ مگر عین وقت پر اس کے ذہن سے نکل گیا۔ کچھ آج کل کے حالات بھی اتنے بے یقین سے تھے کہ نئے سال کی خوشی بھی اداسی، ملال اور کچھ کھو دینے کے احساس میں لپٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بہرحال دستور دنیا تو نبھانا پڑتا ہے۔

اگلے دن اس نے بھی ان کے ہاں جانے کا ارادہ کیا۔ ایک تو انہوں نے کافی دن سے چکر نہیں لگایا تھا۔ دوسرے اس نے سوچا کہ لگے ہاتھوں نئے

سال کی مبارک باد بھی دے دوں گی۔ ورنہ وہ اس بات کو لے کر بھی ناراض ہو جائیں گی۔

ان کے ہاں پہنچی تو حالات بہت کشیدہ تھے۔ ان کی ساس رات کو واش روم میں پھسل کر اپنی کولہے کی ہڈی فریکچر کروا بیٹھی تھیں۔ تاروے میں مقیم نند صاحبہ بھی آج کل تشریف لائی ہوئی تھیں اور اس وقت سخت ناخوش گوار موڈ میں بیمار ماں کے سرہانے بیٹھی تھیں۔

"اماں! بتا رہی تھیں کہ ان کی اسٹک ٹوٹ گئی تھی۔ وہ تم لوگوں نے مرمت ہی نہیں کروائی تھی۔ اس لیے یہ حادثہ پیش آیا۔" وہ خطرناک تیوروں سے آپا کو گھور رہی تھیں۔

"نہیں باجی! اسٹک تو ہم نے اسی دن مرمت کروا دی تھی۔ اماں کے سرہانے رکھی تھی۔ وہ واش روم لے جانا بھول گئی تھیں۔" آپا منمناتے ہوئے وضاحت دے رہی تھیں۔

آپا کے سسرال میں بیا روے والی نند، وہ واحد ہستی تھیں جن سے وہ خار کھاتی تھیں۔ کیونکہ وہ اچھی خاصی مالدار تھیں اور ان کے ہاں سے وافر بیرونی امداد آتی تھی۔ پھر وہ آپا کی متوقع سمدھن کے رتبے پر بھی فائز ہونے والی تھیں۔

"یہ اماں کے نیچے کیسا غیر آرام دہ سا گدا بچھا رکھا ہے تم نے؟"

"وہ باجی دراصل میڈیکیٹڈ کا آرڈر دے رکھا ہے ابھی لڑکا دے جائے گا۔"

آپا دبے دبے لہجے میں جواب دے رہی تھیں جبکہ اس سے تو ان کا یہ دبو سا انداز ہضم ہی نہیں ہو رہا تھا۔ وہ تو مقابل کو چاروں شانے چت کرنے میں ماہر تھیں مگر یہاں وہ بنا مقابلہ کیے ہتھیار ڈالے جا رہی تھیں۔

"ابھی تک سوپ تیار نہیں ہوا.....؟" نند صاحبہ نے ایک اور حملہ کیا تو وہ اس کی جانب دزدیدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی تیزی سے کچن کی جانب پلٹ گئیں۔ وہ سوچ رہی تھی کہ جب کسی سیر کو سوا سیر کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو شاید اس کی ایسی ہی حالت ہوتی ہے۔

دوسری طرف کچن میں سوپ بناتی آپا بھی گہری سوچ میں گم تھیں۔ شاید آج خود احتسابی کے عمل سے گزر رہی تھیں۔

سارا خاندان کہتا تھا کہ وہ بہت نکتہ چیں اور منہ پھٹ واقع ہوئی ہیں۔ مقابل کی خامیاں نمایاں کرنا اور پھر اس کی خجالت یا شرم ساری پہ حظ اٹھانا ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔

میکے اور سسرال دونوں پر بیک وقت حکومت کی تھی۔ لوگ ان کے سامنے تو کچھ کہنے کی جرات نہیں کرتے تھے مگر اپنی ذات پر اڑتے پڑتے تبصرے تو ان تک پہنچا ہی کرتے تھے جن کو درخور اعتنا نہ سمجھا کرتی تھیں۔

خاص طور پر اپنی اس وقت موجود، کم گو سی بھاوج کو تو انہوں نے سب سے زیادہ زچ کیا تھا۔ اس کی خاموشی کو کمزوری جان کر کچھ زیادہ ہی شیر ہو جاتی تھیں۔ آج احساس ہوا کہ جب کسی اعتراض کے جواب میں باوجود خواہش کے خاموش رہنا پڑے تو کیسا محسوس ہوتا ہے۔

ذرا سی آہٹ پر وہ چونکیں۔ پلٹ کر دیکھا تو سامنے وہی بھاوج کھڑی تھی۔

"اچھا آپا! اب اجازت دیں اور ساتھ ہی آپ کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو۔"

اس کے چہرے پر انہیں خلوص اور محبت کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ شرمندہ کرنے یا جتانے کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مزید شرم سار ہو گئیں اور اس سے گلے ملتے ہوئے بولیں۔

"سوری تہمینہ......!"

"کوئی بات نہیں آپا!" دونوں دیر تک گلے لگی رہیں۔

ان کے گھر میں نئے سال کی نئی کہانی یہی تھی کہ ایک کو اپنی خطا کا احساس ہو گیا تھا اور دوسری نے اپنی خاموشی سے میدان جیت لیا تھا۔

☆☆

تیری آنکھیں سیاہ جھیلیں ہیں
جہاں چاند ہمیشہ چمکتا رہتا ہے
اس کی سفید شعلہ ریز کرنیں ساحلوں کو چھیڑتی ہیں تو موسیقی کی دلکش آواز پیدا ہوتی ہے۔ گویا خوب صورت انگلیاں رباب کے تاروں کو چھیڑ رہی ہوں
اس جھیل کی گہرائی میں بے شار قیمتی اور عجیب چیزیں غرق ہیں۔ دنیا کے بیش بہا خزانے۔
سونے اور جواہرات کے ساغر
گزرے ہوئے شہنشاہوں کے زرنگار تاج۔
اور ماہی کی آنکھیں سیاہ جھیلیں تھیں۔ انہیں دیکھ کر اسے ہاشم ملک کی لائبریری میں موجود ایک پرانے میگزین میں سے پڑھی رابرٹ بروگ کی طویل نظم کا یہ پہلا بند یاد آجاتا تھا۔ ہاں ماہی کی آنکھیں ایسی ہی تھیں بڑی بڑی گھور سیاہ آنکھیں۔ بے تحاشا چمک دار جب وہ نگاہیں اٹھاتی تو جگر جگر کرتی سیاہ آنکھیں سیاہ پانیوں والی جھیلوں کی یاد دلاتی تھیں۔ وہ چھت کی منڈیر پر کہنیاں ٹکائے تھوڑا سا جھکا سامنے کھیتوں میں دیکھ رہا تھا۔ آدھے سے زیادہ کھیت سرسوں کے پیلے پھولوں سے بھرے ہوئے تھے اور ان پیلے پھولوں والے سونے جیسے کھیتوں کے درمیان کھڑی وہ خالص سونے جیسی لڑکی ماہی تھی، اس نے پھول دار بڑے بڑے پھولوں والی لمبی قمیض پہنی ہوئی تھی، سر پر سیاہ چادر تھی اور وہ اپنی سہیلی شالی کو کھیت سے گندلیں توڑتے دیکھ رہی تھی۔

”ماہی.....!“

مکمل ناول

اس نے زیر لب کہا۔ پتا نہیں ماہی کا پورا نام کیا تھا اس نے کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی اور پھر اسے آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے تھے پندرہ دن ۔اور یہ پندرہ دن۔

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ہجر، جدائی اور غم کی اذیت سے بھری سانس۔

لیکن جب وہ آٹھ سال پہلے آیا تھا تب بھی اس نے ماہی کا پورا نام جاننے کی کوشش نہیں کی تھی، وہ اپنے ہوش میں دوسری بار یہاں آیا تھا آٹھ سال پہلے جب وہ چودہ سال کا تھا اور اب آٹھ سال بعد۔ لیکن تب اور اب میں کتنا فرق تھا۔ تب اس کے ساتھ ڈیڈ تھے۔ سنجیدہ سے ڈیڈ اپنے گاؤں میں آ کر بے حد خوش تھے۔ اور خوش تو وہ بھی تھا اور اپنی خوب صورت آنکھوں میں تجسس اور حیرانی لیے ہر ایک چیز کو دیکھتا تھا۔ سرسبز کھیت، پیلے پھولوں کے گہنے سے لدے سرسوں کے کھیت کہ تب بھی یہی موسم تھا اور سرسوں پھول رہی تھی۔

فروری کا وسط تھا شاید۔ کھلے، کشادہ صحن والے گھر اور اکثر گھروں میں صحن میں ہی چھپر تلے بندھے جانور، کنوئیں پر پانی بھرتی عورتیں۔ خوب صورت نقش و نگار والے سرخ مٹی کے گھڑے۔ یہ سب اس کے لیے بہت دلچسپ اور خوب صورت تھا۔

سرخ پایوں والی چارپائیاں، رنگین پیڑھے اس کے لیے نیا اور انوکھا تھا۔ وہ ڈیڈ کے ساتھ اپنے ہوش میں پہلی بار پاکستان آیا تھا۔ ماما نے ایک بار اسے بتایا تھا کہ جب وہ بہت چھوٹا سا تھا شاید دو سال کا تو تب ڈیڈ اسے زبردستی پاکستان لے آئے تھے اپنے والدین سے ملانے کے لیے۔ خود وہ سال دو سال بعد اپنے والدین سے ملنے پاکستان آتے تھے۔ یہاں ان کے والدین کے علاوہ ان کے ایک بڑے بھائی بھی تھے لیکن ماما کبھی ان کے ساتھ پاکستان نہیں آئی تھیں۔ ان کا تعلق انڈیا سے تھا اور وہ ہمیشہ چھٹیوں میں انڈیا چلی جاتی تھیں اور اکثر اسے بھی ساتھ لے جاتی تھیں لیکن اگر وہ کبھی گھر پر ہی ہوتیں تو اسے ڈیڈ کے ساتھ پاکستان نہیں جانے دیتی تھیں۔

اس کے ڈیڈ قاسم ملک بہت نرم مزاج اور صلح جو طبیعت کے انسان تھے اور جھگڑے سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس لیے اس کی ماما، سلمٰی بیگم کے چلانے پر خاموش ہو جاتے تھے لیکن اس بار وہ اسے ساتھ لے آئے تھے۔

''تمہارے دادا، دادی تمہیں دیکھنے اور تم سے ملنے کی حسرت لیے دنیا سے چلے گئے۔ میں چاہتا ہوں اس بار تم میرے ساتھ چلو اور اپنے تایا جان تائی اور ان کے بچوں سے ملو۔ وہ اس دنیا میں تمہارے واحد خونی رشتہ دار ہیں۔''

وہ اپنے ننھیالی رشتہ داروں سے کئی بار مل چکا تھا۔ اس کی ایک خالہ تو یہاں ہی لندن میں رہتی تھیں جبکہ ایک خالہ اور نانا، نانی انڈیا میں تھے۔ وہ جتنے دن انڈیا رہتا تھا۔ بیزار سا رہتا تھا۔ خالہ زاد بہن اور بھائی جو عمر میں اس سے کافی بڑے تھے اسے کوئی خاص لفٹ نہیں کرواتے تھے۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اسے ایک بار اپنے ڈیڈ کے رشتہ داروں سے بھی ملنا چاہیے۔ سلمٰی بیگم نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

''عثمان وہاں جا کر کیا کرے گا قاسم۔ وہاں تمہارے بھائی بھابی ہیں تم جا کر مل آؤ۔ خواہ مخواہ اسے کہاں خوار کرو گے۔ میں آپا اور ان کے بچوں کے ساتھ چھٹیوں میں فرانس جانے کا پروگرام بنا رہی ہوں۔ عثمان بھی ہمارے ساتھ جائے گا۔'' لیکن ڈیڈ نے اس روز اکیلے میں اس سے کہا تھا۔

''عثمان! اس مٹی سے ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یہ اجنبی زمین ہے۔ ہماری جڑیں جس مٹی میں ہیں۔ جس زمین سے ہمارا رشتہ جڑا ہے۔ تم ایک بار تو اس مٹی کے لمس کو محسوس کرو۔ وہ گھر وہ جگہ جہاں میں نے جنم لیا۔ پروان چڑھا۔ میں چاہتا ہوں تم ایک بار تو۔''

ڈیڈ اسے اس روز بہت دل گرفتہ اور اداس لگے تھے اور اس نے ان کے ساتھ پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

''پتا ہے عثمان! رزق کی تلاش مجھے یہاں اس

اجنبی زمین پر لے تو آئی ہے لیکن میرا دل تو وہاں ہی رہ گیا ہے ان ہی فضاؤں میں۔ یہاں کا آسمان، یہاں کی زمین، یہاں کے موسم آج بھی مجھے اجنبی لگتے ہیں۔ میں نے سوچا تھا ایک وقت آئے گا۔ جب میں اپنے وطن لوٹ جاؤں گا لیکن۔"

"لیکن کیا ڈیڈ......؟" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر بات ادھوری چھوڑی تھی۔

"تمہاری مام......وہ...... پاکستان جا کر رہنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ ایک وقت ایسا بھی گزرا جب میں نے تمہاری مام کو چھوڑ کر جانے کا ارادہ کر لیا تھا لیکن پھر تم اور زارا آ گئے۔ میں تم دونوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ بچے دے نہ سکتی اور میں تم دونوں کے بغیر کیسے جی پاتا۔ پھر زارا بیمار ہو گئی۔ وہ خون کی کمی کا شکار تھی۔ اور میں جو سلمٰی کو منانے کے پلان بناتا رہتا تھا کہ وہ اگر نہیں جانا چاہتی پاکستان، تو اپنی مرضی اور خوشی سے بچے مجھے دے دے لیکن پھر زارا کی بیماری نے سب کچھ بھلا دیا۔ جس روز ڈاکٹروں نے تھیلیسیمیا تشخیص کیا اس کے بعد چار سال تک میں اور سلمٰی سب کچھ بھلا کر اس کے علاج کی تگ و دو میں لگ گئے۔ پھر وہ چلی گئی۔ اور میں نے بھی پھر پاکستان جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ کہ یہاں تم تھے۔ اور میں تمہیں چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

وہ ماما کے منع کرنے کے باوجود ڈیڈ کے ساتھ پاکستان آ گیا تھا اور ہاشم تایا اسے بالکل ڈیڈ کی طرح لگے تھے شفیق اور مہربان سے بلکہ ڈیڈ سے بھی زیادہ شفیق لگے تھے وہ۔

"میرا بچہ... میرے باپ کی نسل کا امین!" وہ کتنی ہی دیر تک اسے گلے سے لگائے کھڑے رہے تھے۔

"یہ بالکل فاروق جیسا ہے قاسم! فاروق جب اتنی عمر کا تھا تو ایسا ہی لگتا تھا۔"

"ان کا اکلوتا بیٹا فاروق دو سال پہلے ایک حادثے میں انتقال کر گیا تھا۔ اس کی بائیک کو ایک تیز رفتار ٹرک نے ٹکر ماری تھی۔"

"ہاں عثمان اور فاروق دونوں نے ہی اپنے دادا کی شباہت چرائی ہے۔ جب کہ زارا اماں کی طرح تھی، ویسی ہی ناک ویسی ہی آنکھیں اور ہونٹ۔" ڈیڈ زارا کو نہیں بھولتے تھے۔

تائی اماں سے مل کر بھی وہ متاثر ہوا تھا۔ نرم لہجے میں ٹھہر ٹھہر کر بات کرنے والی تائی اماں سراپا شفقت و محبت تھیں۔

اور ماہی کو بھی پہلی بار اس نے تب ہی دیکھا تھا۔ تائی جان کا آنچل پکڑے وہ تھوڑا سا ان کے پیچھے چھپی شرمائی ہوئی سی کھڑی تھی بے حد خوب صورت گھور سیاہ آنکھیں، خم دار لانبی پلکیں، سیدھی مانگ نکالے دو چوٹیاں کیے جن میں سرخ ربن بندھے تھے۔ سرخ ہی چھوٹے چھوٹے پھولوں والا گھیر دار فراک پہنے وہ نو دس سال کی بچی تائی جان کے پیچھے چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ ماہی ہے۔" ہاشم ملک نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تعارف کروایا تھا۔ "ہماری لاڈلی بیٹی۔"

اور وہ تھوڑا سا حیران ہوا تھا کہ تایا ابو کی کوئی اتنی چھوٹی سی بھی بیٹی ہو سکتی ہے اور پھر خود ہی سوچ لیا تھا کہ شاید تایا ابو نے زیادہ عمر میں شادی کی ہو اور ماہی شاید دیر سے پیدا ہوئی ہو۔

یہ تو بعد میں ڈیڈ نے بتایا تھا کہ ماہی مدحت بھابی یعنی تائی جان کی بھانجی ہے۔ سال بھر کی تھی کہ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ باپ نے فوراً ہی دوسری شادی کر لی۔ سوتیلی ماں رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے تائی جان اسے ساتھ لے کر آ گئی تھیں۔ ماہی کی امی نزہت ان کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ ماہی کے علاوہ گھر میں اور کوئی بچہ نظر نہیں آیا تھا جبکہ ڈیڈ نے اس سے کہا تھا کہ تایا جان اور اور ان کے بچے دوودھیال کی طرف سے اس کے واحد خونی رشتہ دار ہیں۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ تایا ابو کے کتنے بچے ہیں اور کہاں ہیں۔ ہاں دو سال پہلے جب اس کے ڈیڈ اپنے بھتیجے فاروق کی حادثاتی موت پر پاکستان آئے تھے تو اسے پتا چلا تھا کہ اس کے تایا جان کا کوئی بیٹا ہے

جس کا انتقال ہوگیا ہے۔ دراصل اس نے ڈیڈ سے نہ کبھی ان کے رشتہ داروں کے متعلق پوچھا تھا نہ انہوں نے کبھی بتایا بس اسے اتنا پتا تھا کہ ان کے ڈیڈ کے ماں باپ کے علاوہ ایک بڑے بھائی ہیں۔ اس نے ماما کو اکثر ڈیڈ سے الجھتے دیکھا تھا کہ ماں باپ مر گئے ہیں اب کس لیے بھاگ بھاگ کر پاکستان جاتے ہو۔

"میرے بڑے بھائی ہیں۔ اور میری مٹی کی خوشبو ہے جو مجھے بلاتی ہے۔"

ڈیڈ جھگڑتے اور چلاتے نہیں تھے۔ نرمی اور تحمل سے ماما کو جواب دیتے تھے لیکن اس نے کبھی ڈیڈ سے ان کے متعلق نہیں پوچھا تھا۔ شاید اس کی عمر ایسی تھی کہ اس کا دھیان اپنی دلچسپیوں کے علاوہ اور کسی طرف نہیں تھا۔

ماما کے زیادہ تر رشتہ دار انڈیا میں ہی تھے یہاں ایک بڑی بہن تھی جس کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔ اور انڈیا میں موجود رشتہ داروں کے متعلق ماما خود ہی اسے بتاتی رہتی تھیں۔ جب بھی فارغ ہوتیں تو ان کے پاس باتیں کرنے کے لیے یہ ہی موضوع ہوتا۔ انڈیا میں موجود اپنے رشتہ دار۔

آخری بار وہ ماما کے ساتھ چار سال پہلے انڈیا گیا تھا لیکن پاکستان تو وہ پہلی بار آیا تھا۔ اور اسے اچھا لگا تھا۔ دو روز بعد جب ناہید باجی اور صالحہ آپی انہیں ملنے آئیں تو اسے پتا چلا تھا کہ فاروق کے علاوہ تایا جان کی دو بیٹیاں بھی تھیں جو شہر میں بیاہی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں بھی اسے بہت اچھی لگی تھیں۔ ناہید باجی کے دو بیٹے تھے چار اور تین سال کے جب کہ صالحہ آپی کی ایک ہی بیٹی تھی دو سال کی۔

وہ تین دن رہ کر چلی گئی تھیں۔ اور تین دن گھر میں خوب رونق لگی رہی تھی اور ان تین دنوں میں ماہی بھی اسے کم ہی نظر آئی تھی۔ وہ تایا جان اور تائی جان کی طرح ناہید باجی اور صالحہ آپی کی بھی لاڈلی تھی۔ اور اسے بھی بہت کیوٹ لگی تھی۔ جلد ہی وہ اس سے بے تکلف ہوگئی تھی اور اس نے تقریباً آدھے گاؤں سے اسے متعارف کروا دیا تھا۔ یہ ہی نہیں اپنی بکری لاڈو اور شالی کے ڈوگی ڈبو تک سے وہ متعارف ہو چکا تھا۔

شالی ماسٹر نور خان کی بیٹی تھی جو پڑوس میں رہتے تھے اور ماہی کی سہیلی تھی۔ وہ تقریباً ایک ماہ یہاں رہے تھے اور یہ ایک ماہ اس کی زندگی کے خوب صورت ترین دنوں میں سے تھا۔ سرسبز کھیت، کھلی فضا، سادہ دل لوگ سب اس کے لیے پرکشش تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ پھر کبھی یہاں آ بھی پائے گا یا نہیں لیکن دل کے اندر کہیں یہ خواہش ضرور تھی کہ وہ پھر یہاں آئے اور ان محبتوں سے اپنی جھولی بھرے جن سے وہ ناآشنا تھا۔ ہاشم ملک اس کے تایا جان جن کے اصرار پر وہ ماہی کی طرح انہیں بابا کہنے لگا تھا اس سے بے حد پیار کرتے تھے اور تائی جان جنہیں اس نے خود ہی ماہی کی طرح بڑی اماں کہنا شروع کر دیا تھا اس پر ہر وقت صدقے واری جاتیں۔ اس کے اتنے لاڈ تو اس کی اپنی سگی ماں نے بھی نہیں اٹھائے تھے جتنے بڑی اماں اٹھاتی تھیں۔

اس نے ڈیڈ کو لندن میں اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا تھا جتنا وہ یہاں نظر آتے تھے شاید وہ صحیح کہتے تھے کہ اپنے وطن اور اپنی مٹی کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ اس کی باس میں اپنائیت کے جو رنگ ملے ہوتے ہیں۔ وہ اجنبی زمینوں کی خوشبو میں نہیں ہوتے۔

ہاشم ملک شہر میں کسی کالج میں پڑھاتے تھے۔ وہ سویرے ہی ناشتہ کر کے اپنی بائیک پر نکل جاتے تھے اور ڈیڈ اسے ساتھ لے کر پہلے قبرستان جاتے وہاں اپنے والدین اور فاروق کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد، کھیتوں میں سے ہوتے ہوئے لمبی واک کر کے گھر آتے۔ راستے میں ملنے والا ہر شخص بڑی محبت سے ملتا۔ ذرا بڑی عمر کے لوگ اس کے ڈیڈ کو واپس آنے کا مشورہ ضرور دیتے تھے۔ اور وہ مسکرا کر کہتے۔

"دعا کریں اللہ میرا دانہ پانی اپنی زمین پر ہی لکھ دے۔"

اور وہ سوچتا کہ اگر اللہ نے ڈیڈ کی دعا قبول کر لی تو وہ کیا کرے گا۔ وہ وہاں ڈیڈ کے بغیر ماما کے ساتھ کیسے رہے گا۔ اور وہ دل ہی دل میں ڈیڈ کے الفاظ کی تصحیح کرتا کہ اللہ ڈیڈ کے ساتھ اس کا اور ماما کا بھی دانہ پانی یہاں لکھ دے۔

وہ دل ہی دل میں دعا مانگتا اور ڈیڈ لوگوں سے سلام و دعا کرتے جب گھر پہنچتے تو ماہی برآمدے میں چٹائی پر بیٹھی ہل ہل کر سپارہ پڑھ رہی ہوتی اور بڑی اماں وہاں ہی آگے پیچھے کوئی نہ کوئی کام کرتی نظر آتیں۔ آتے جاتے وہ ماہی کے پاس رک کر اس کا سبق بھی سن لیتیں۔

ان کے واپس آتے ہی وہ خورشیداں خالہ کو ناشتہ تیار کرنے کا کہتیں۔ گرم گرم دیسی گھی میں تلا لچھے دار پراٹھا اس نے اپنی اس چودہ سالہ زندگی میں پہلی بار یہاں ہی کھایا تھا۔ پیاز اور ہری مرچوں والا آملیٹ اور ساتھ میں اچار، رات کا بچا سالن، عام روزمرہ کا ناشتہ تھا لیکن کبھی کبھار خصوصی ناشتا جیسے پائے، نہاری یا چنوں کے ساتھ تندوری پراٹھے یا نان۔

بازار سے تو کچھ بھی نہ آتا تھا۔ سب گھر میں ہی بنتا تھا ہاں نان قریبی قصبے سے عبدالرحمن لے کر آتا تھا۔ اور وہاں لندن میں وہی ایک مخصوص ناشتہ۔ ڈیڈ ٹوسٹر میں سلائس رکھتے۔ ماما ہاف فرائی انڈے ٹیبل پر رکھتی جاتیں۔ جیم اور مکھن پہلے ہی ٹیبل پر رکھ دیے جاتے۔ اور اس کے ٹیبل پر آنے تک ڈیڈ سلائس پر بٹر لگا چکے ہوتے تھے وہ خاموشی سے ایک پیس اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیتا تھا۔ کبھی کبھار ماما اسپنش یا چکن آملیٹ بھی بناتی تھیں لیکن بہت کم۔

بڑی اماں کے بنائے گئے آملیٹ میں جو ذائقہ تھا وہ کبھی ماما کے بنائے گئے آملیٹ میں اسے نہیں آیا تھا۔ اس دیہاتی طرز کے بنے ہوئے گھر میں ایک کمرہ ایسا تھا جو اس کے لیے بے حد کشش رکھتا تھا اور وہ تھا بابا کا اسٹڈی روم جو ان کے بیڈ روم کے ساتھ ہی تھا۔

دیوار کے ساتھ لگی شیلفوں میں کتابیں ہی کتابیں تھیں، اردو، انگلش، عربی، فارسی میں لکھی گئی کتابیں۔ اردو وہ اچھی طرح سے پڑھ نہیں سکتا تھا لیکن بول اور سمجھ سکتا تھا۔ اس کی دلچسپی کا محور انگریزی ادب ہی تھا۔ انگلش فکشن اور ناولز کے علاوہ اسے سوانح عمری اور تحقیق لٹریچر بھی بہت پسند تھا سو وہ اکثر ہی ناشتے کے بعد اسٹڈی میں آ جاتا کبھی کبھار ڈیڈ بھی آ جاتے تھے ورنہ وہ بڑی اماں سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ وہ ہاشم ملک کے آنے تک ان کی اسٹڈی میں ہی اپنا وقت کتابوں کے ساتھ گزارتا تھا۔

ہاشم ملک نہ صرف کالج میں پڑھاتے تھے بلکہ ایک اخبار میں کالم بھی لکھتے تھے اور دو تین کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ڈیڈ نے اسے بتایا تھا کہ ان کی ایک تنقیدی کتاب ایم اے کے اردو لٹریچر کے کورس میں بھی شامل تھی اسی طرح بڑی اماں بھی رائٹر تھیں اور مدحت ربانی کے نام سے وہ شادی سے پہلے ہی لکھا کرتی تھیں اور اب بھی مختلف ڈائجسٹوں اور ادبی پرچوں میں ان کی کہانیاں چھپتی تھیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے اور دو ناول کتابی شکل میں موجود تھے۔

وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہنے والے اس کے تایا جان اور تائی جان ادیب ہوں گے۔ جنہیں ماما اکثر پینڈو اور دیہاتی کہا کرتی تھیں ان کا تعلق تو قلم و کتاب سے تھا۔ وہ جہاں سے آیا تھا وہاں ایک مصنف اور استاد کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ لکھنے والوں کا بے حد احترام کرتا تھا اس کے نزدیک وہ عام لوگوں سے بہتر اور اعلا سوچ رکھنے والے ہوتے ہیں۔ سو ان سے گفتگو کر کے اسے مزا آتا تھا۔ اسے اندازہ ہوا تھا کہ بڑی اماں کی تحریروں کو کافی پسند کیا جاتا تھا۔ ہر روز ان کے نام ڈھیروں خط آتے تھے جو ان کے قارئین انہیں لکھتے تھے۔ چار ہفتے اتنی جلدی گزرے کہ پتا ہی نہیں چلا تھا۔ حالانکہ جب وہ ڈیڈ کے ساتھ آ رہا تھا تو اس کا خیال

تھا کہ یہ چار ہفتے یہاں ایک اجنبی جگہ گزارنا کتنا مشکل ہوگا۔ شاید وہ چند دنوں میں ہی بور ہو جائے گا۔
سلمٰی کا بھی یہ ہی خیال تھا کہ وہ وہاں زیادہ دن نہ رہ پائے گا سو اگر دل نہ لگے تو واپس آ جانا۔ بلاوجہ رکنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اپنے تایا سے مل کر تم تو فوراً واپس آ جانا۔
نہ جانے کتنی ہی بار انہوں نے اس سے کہا تھا۔
دراصل سلمٰی بیگم بھی ان نوے فی صد عورتوں میں سے تھیں جو اپنے بچوں کو ددھیال والوں سے دور رکھتی ہیں اور ان کے دل میں ان رشتوں سے محبت پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ مگر یہاں آ کر اسے یہ چار ہفتے کم لگنے لگے تھے۔
جس صبح انہیں واپس جانا تھا اس رات وہ دیر تک جاگتے رہے تھے۔ شہر سے ناہید باجی اور صالحہ آپی بھی اپنے بچوں اور شوہروں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ صبح انہیں صالحہ آپی کے شوہر حامد بھائی کے ساتھ ہی ایئر پورٹ جانا تھا ان کی گاڑی میں۔
مارچ کا پہلا ہفتہ تھا شاید دو یا تین تاریخ۔ موسم اچھا تھا۔ صحن میں بچھی چار پائیوں پر کھلے آسمان تلے بیٹھنا اسے بہت تصوراتی سا لگا تھا۔ ڈیڈ اور بابا اپنے بچپن کی اور اپنے والدین کی باتیں کر رہے تھے۔ ناہید اور صالحہ دونوں بہنیں کچن میں کمی خورشیداں کے ساتھ رات کا کھانا تیار کروا رہی تھیں۔
وہ حامد بھائی کے ساتھ چار پائی پر بیٹھا ڈیڈ اور بابا کو باتیں کرتا سن رہا تھا اور ماہی بڑی اماں کی گود میں سر رکھے لیٹی تھی۔ اسے شاید نیند آ رہی تھی لیکن وہ سونا نہیں چاہتی تھی اس لیے بار بار آنکھیں بند کرتی اور کھولتی تھی۔
''اپنوں کا ہجر بہت تکلیف دہ ہوتا ہے قاسم۔ تم نہیں جانتے کہ کیسے دن گن گن کر گزارتا ہوں۔ اتنا انتظار نہ کروایا کرو یار۔''
ہاشم ملک کی آنکھیں نم تھیں۔
''کوشش کروں گا بھائی جی کہ ہر سال آیا کروں۔'' قاسم ملک کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔
''اور عثمان کو بھی لایا کرو۔''
ہاشم ملک نے اس کی طرف دیکھا تھا۔
''اسے دیکھتا ہوں تو فاروق آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔''
''جی بابا! میں بھی ڈیڈ کے ساتھ ہر سال آؤں گا۔'' اس نے جیسے زبان سے ہی نہیں کہا تھا بلکہ دل میں بھی عہد کیا تھا۔
''یہ ہجر کیا ہوتا ہے بابا!'' ماہی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ اور سر اٹھا کر پوچھ رہی تھی۔ شاید وہ ابھی تک ہاشم ملک کے کہے ''ہجر'' میں الجھی ہوئی تھی۔
''جدائی!'' ہاشم ملک مسکرائے تھے۔
''ہجر جدائی ہوتی ہے بیٹا!''
''اور مجھے بھی صالحہ آپی، اور ناہید باجی کا ہجر تکلیف دیتا ہے۔ بابا۔'' اس نے ناراضی سے کچن کی طرف دیکھا۔
''آپ ان سے کہہ دیں گے نا۔ وہ اتنے زیادہ دنوں بعد آتی ہیں اور بس ایک یا دو دن رہ کر چلی جاتی ہیں۔ میں ان سے ناراض ہوں۔ آج ہی وہ آئی ہیں اور کل چلی بھی جائیں گی۔''
''اچھا کہہ دوں گا!'' ہاشم ملک مسکرائے تھے۔
''لیکن میری جان! بیٹیوں کا ہجر تو سب والدین کے نصیب میں لکھا ہوتا ہے۔''
''کیا میرا بھی؟'' وہ حیران آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ پھر جیسے خود ہی اس نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔
''نہیں، میں آپ کو ہجر کی تکلیف نہیں دوں گی۔''
اس نے بڑی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دی تھیں اور انہوں نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا تھا۔
''میں صالحہ اور ناہید باجی کی طرح شادی کر کے کبھی بھی آپ کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔''
اس کی آنکھوں میں نمی سی چمکی تھی۔ اور میں ماہی کو دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں کو جو سیاہ جھیلیں تھیں۔ جن کے سیاہ پانیوں کے نیچے قیمتی آب دار

موتی چھپے تھے۔

"اور چاچو! آپ نہ جائیں نا، یہاں ہی رک جائیں۔" وہ اب قاسم ملک کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"بابا آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ اور یاد کر کے روتے بھی ہیں۔"

"ڈیڈ! کیا ہم ایک ہفتہ مزید نہیں رک سکتے یہاں۔"

میں چاہتا تھا ڈیڈ ہاں کہہ دیں اور میں اس معصوم سی سادا سی ماہی کی آنکھوں میں خوشی کے ستارے دمکتے دیکھوں۔

"ابھی تو نہیں لیکن پھر جلد آئیں گے اور میں تمہیں بھی ساتھ لے کر آؤں گا۔"

قاسم ملک کی آنکھوں میں اس کی بات سے ایک حیران لیکن خوش کن سی چمک لہرائی تھی۔ جیسے انہیں امید نہ تھی کہ وہ کوئی ایسی بات کرے گا۔

پھر صالحہ اور ناہید نے اندر بڑے کمرے میں کھانا لگا دیا تو وہ سب اٹھ کر بڑے کمرے میں آ گئے اور کھانے کے بعد بھی دیر تک اندر ہی بیٹھے رہے تھے کہ اب صحن میں ہلکی خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن وہ صحن میں کھلے آسمان تلے گزارا وقت ہمیشہ کے لیے اس کے دل پر رقم ہو گیا تھا۔ ایئرپورٹ پر قاسم سے گلے ملتے ہوئے ہاشم ملک رو پڑے تھے۔

"جلدی آنا قاسم! آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترس جاتی ہیں۔"

"اب، اس بار جلدی آؤں گا بھائی جی..... یہ عثمان بھی تو اب ساتھ ہی آئے گا۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکرائے تھے۔

☆☆☆

لیکن یہ جلدی تو آٹھ سال پر محیط ہو گئی تھی، گو قاسم ملک نے بہت کوشش کی تھی سال بعد جانے کی لیکن ٹکٹ کے لیے پیسے جمع نہ کر سکے تھے۔ دراصل سلمیٰ بیگم ہر ہفتے ان سے تنخواہ لے لیا کرتی تھیں اور جیب خرچ کے لیے کچھ پونڈ انہیں دیتی تھیں۔ ان کا ذاتی خرچ نہ ہونے کے برابر تھا۔ سگریٹ تک پینے کی عادت نہ تھی انہیں۔ سو وہ یہ پیسے جمع کرتے رہتے تھے اور دو تین سال بعد پاکستان کا چکر لگا لیتے تھے جب دسمبر میں کرسمس پر سیل لگتی تو سب کے لیے تحائف بھی خرید کر رکھ لیتے تھے۔ لیکن اس بار جو پاکستان سے آئے تو اگلے تین چار سال تک وہ اتنی بچت نہ کر سکے کہ پاکستان جانے کے لیے ٹکٹ خرید سکتے۔ ہر سال ہی کچھ اضافی خرچ نکل آتے کبھی سلمیٰ بیگم کو نئی گاڑی خریدنا ہوتی کبھی پردے اور کبھی فرنیچر تبدیل کرنا ہوتا۔

پتا نہیں وہ ایسا دانستہ کرتی تھیں یا اتفاق تھا لیکن ان اضافی اخراجات کی وجہ سے قاسم ملک کی ساری بچت ختم ہو جاتی اور وہ پاکستان جانے کے لیے ٹکٹ نہ خرید پاتے۔ ہاشم ملک کے خط باقاعدگی سے آتے تھے کبھی کبھار فون بھی آ جاتا تھا۔ اگر وہ گھر پر ہوتا تو ان سے وہ اس کی بات بھی کرواتے تھے۔

تین منٹ کی کال میں زیادہ بات نہ ہو پاتی تھی۔ اس لیے وہ لمبے لمبے خط لکھتے تھے۔ ہر ایک کے متعلق تفصیل سے بتاتے تھے۔ حتیٰ کہ خورشیداں، ماسٹر نور خان اور شالی کے متعلق بھی لکھتے تھے۔ وہ اردو چونکہ پڑھ نہیں سکتا تھا اس لیے قاسم ملک اسے ان کے خط کا متن بتا دیتے اور اگر کبھی وہ فارغ ہوتا تو وہ خط پڑھ کر اسے سنا دیتے تھے۔

وہ بہت شوق اور دلچسپی سے سنتا تھا اور دل میں عہد کرتا کہ اپنی پڑھائی سے فارغ ہو کر وہ ضرور اردو لکھنا پڑھنا سیکھے گا اور سب سے پہلے بڑی اماں اور بابا کی کتابیں پڑھے گا۔ اور جب وہ پاکستان آیا تھا تو اس نے یہ بات بڑی اماں سے بھی کہی تھی۔ اور بڑی اماں نے خوش ہو کر کہا تھا۔

"میں تمہارے لیے اپنی کتابیں سنبھال کر رکھوں گی۔ اس وقت تک جب تم اردو لکھنا پڑھنا سیکھ جاؤ۔"

☆☆☆

وقت اپنی مخصوص رفتار سے چلتا رہا۔ قاسم ملک اتنی بچت نہ کر سکے کہ ٹکٹ خرید سکیں اور چھ سال گزر

گئے۔ چھ سال بعد ایک روز ہاشم ملک سے بات کرتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ ڈیڈ کو پاکستان گئے ایک لمبا عرصہ ہو گیا ہے اور وہ بہت خاموش بہت افسردہ رہنے لگے ہیں۔

''یار عثمان! اپنے ڈیڈ سے کہو، پہلے تو دو تین سال بعد چکر لگا جاتے تھے اب تو چھ سال ہو گئے۔ اتنا پتھر کیوں کر لیا ہے تم نے اپنے دل کو۔''

اور یہ بات تو وہ جانتا تھا کہ ڈیڈ کا دل پتھر نہیں ہوا۔ حالات نے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ رکھے ہیں۔ مہنگے علاقے میں چار بیڈ روم والا بڑا گھر سفید ہاتھی ثابت ہوا تھا ان کے لیے ٹیکس، بجلی، گیس کے بل ساری تنخواہ خرچ ہو جاتی تھی۔ اور وہ کچھ بچا نہ پاتے تھے اور ماما تو اپنی تنخواہ صرف اپنی ذات پر خرچ کرتی تھیں۔ تب اس نے دل ہی دل میں عہد کیا تھا کہ وہ اس سال ڈیڈ کو ضرور پاکستان بھیجے گا۔ سو وہ چپکے چپکے اپنے جیب خرچ سے کچھ پونڈ بچا کر رکھ لیتا تھا۔ وہ ہفتے میں دو دن شام کو وہ دو یا تین گھنٹے کے لیے ایک اسٹور پر کام بھی کرنے لگا تھا۔ اور یہ رقم بھی وہ جمع کر رہا تھا۔ اس کے پاس کمپیوٹر تھا لیکن گاؤں میں نیٹ کی سہولت نہیں تھی۔ فون بھی چند سال پہلے لگا تھا۔

ایک بار جب وہ صالحہ آپی کے گھر گئے تھے تو اس نے ان سے ڈیڈ کی بات کروائی تھی۔ وہ اسے بے حد کمزور لگے تھے۔ صرف چھ سالوں میں وہ بوڑھے لگنے لگے تھے۔

''یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے بابا؟'' اسے افسوس ہوا تھا۔

''کیا ہونا ہے بیٹا! اپنوں کی جدائی یوں ہی گھلا دیتی ہے۔ آدھا تو فاروق کی جدائی نے مار دیا تھا اور باقی کا ہولے ہولے تمہارے ڈیڈ کی جدائی مار رہی ہے۔'' وہ بے حد افسردہ تھے۔

''وعدہ بابا! اس سال دسمبر میں ڈیڈ اور میں آپ کے پاس ہوں گے۔''

لیکن اس کا وعدہ بھی بس وعدہ ہی رہا۔ نومبر میں جب وہ چپکے چپکے سب کے لیے گفٹ خرید رہا تھا۔ ڈیڈ اچانک بیمار ہو گئے۔ نہ جانے کتنے ٹیسٹ ہوئے۔ وہ چاہتا تھا جلدی ٹیسٹ ہوں رپورٹس ملیں اور علاج شروع ہو لیکن مختلف ٹیسٹوں کی ڈیٹس اتنی لیٹ مل رہی تھیں کہ وہ گھبرا گیا۔

وہ چاہتا تھا کہ جلد مرض کا پتا چلے اور علاج شروع ہو۔ تب گھبرا کر اس نے پرائیویٹ ڈاکٹرز سے رجوع کیا۔ اور بالآخر تشخیص ہوئی کہ کینسر ہے اور کافی پھیل چکا ہے۔ پرائیویٹ علاج مہنگا تھا لیکن اسے پرائیویٹ ہی کروانا تھا۔ گو برٹش سٹیزن ہونے کی وجہ سے ان کی میڈیکل انشورنس تھی لیکن وہی دو دو ماہ بعد کی تاریخ۔ سو اس کی ساری بچت ڈیڈ کے علاج پر لگ گئی۔ سلمٰی نے تو کبھی بچت نہیں کی تھی انہیں مہنگے اور برینڈڈ کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ وہ قیمتی میک اپ اور جیولری وغیرہ پر اپنی ساری تنخواہ خرچ کر دیتی تھیں پھر ہر سال انڈیا اپنے والدین سے ملنے جاتی تھیں۔ وہاں موجود عزیزوں کے لیے تحفے وغیرہ بھی خرید کے جاتے تھے۔

''مام! اس سال آپ انڈیا نہ جائیں۔'' اس نے سلمٰی بیگم سے کہا تھا۔

''کیوں۔''

''میں چاہتا ہوں میں اس بار ڈیڈ کو پاکستان لے جاؤں تاکہ وہ زندگی میں ایک بار تایا جان سے مل لیں۔''

''لیکن میری ممی بھی بیمار ہیں اور ڈیڈی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ مجھے تو ہر صورت جانا ہے۔''

''لیکن آپ تو ہر سال جاتی ہیں اس سال ڈیڈ کو جانے دیں پلیز۔''

وہ چاہتا تھا کہ ڈیڈ کی طبیعت کچھ بہتر ہے تو وہ انہیں پاکستان لے جائے۔ آخری کیمو کے بعد اب وہ کافی بہتر لگتے تھے۔

''آپ جانتی ہیں نا ڈیڈ کے پاس ٹکٹ کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ آپ ڈیڈ کے لیے ان پیسوں سے ٹکٹ خرید دیں جو آپ نے اپنے ٹکٹ کے لیے رکھے ہوئے ہیں۔''

''تمہارا تو دماغ خراب نہیں ہو گیا ہے عثمان!'' سلمیٰ بیگم کو غصہ آ گیا تھا۔ ''تمہارا باپ بیمار ہے۔ کینسر ہے اسے! ٹھیک ہے وہ کچھ بہتر ہو گیا ہے لیکن ابھی تک ڈاکٹرز نے ہمیں یہ نہیں کہا کہ وہ مکمل طور پر ٹھیک ہے اگر وہ وہاں جا کر بیمار ہو گیا تو وہاں بھلا کیا علاج ہوگا۔ یہاں اتنی سہولت ہے علاج کی۔ ذرا طبیعت خراب ہو تو ایک کال پر ایمبولینس گھر آ جاتی ہے۔ وہاں اس پسماندہ گاؤں میں تو تڑپ تڑپ کر مر جائے گا تمہارا باپ۔'' اور اس سے عثمان کو وہ بہت سفاک اور سخت دل لگی تھیں۔

''ٹھیک ہے میں کچھ اور بندوبست کرتا ہوں۔ میں نے سرچ کیا ہے پاکستان میں بھی کینسر کے علاج کے لیے سہولتیں موجود ہیں۔''

اس نے اپنی اور ڈیڈ کی گاڑی بیچنے کا فیصلہ کیا تھا۔

ڈاکٹر جوزف نے اسے صاف صاف بتا دیا تھا کہ ڈیڈ کے پاس زیادہ سے زیادہ ایک سال کا وقت ہے کہ کینسر کی تشخیص آخری اسٹیج پر ہوئی ہے۔ فی الحال انہوں نے سب کینسر زدہ حصہ ری موو کر دیا ہے لیکن کسی بھی وقت وہ پھر سے ہو سکتا ہے۔

اور تب ہی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ڈیڈ کو پاکستان لے کر جائے گا تا کہ وہ اپنی زندگی کے باقی دن اپنوں کے ساتھ، اپنی زمین پر گزاریں لیکن سلمیٰ نے اس کی بات مکمل ہوتے ہی چلانا شروع کر دیا تھا۔

''میں نے کہہ دیا ہے نا کہ قاسم پاکستان نہیں جائے گا تو نہیں جائے گا۔''

ان کی عادت تھی جب کوئی خلاف مرضی بات ہوتی وہ چلانے لگتی تھیں۔ شور سن کر قاسم ملک بھی اپنے روم سے باہر آ گئے تھے۔ اور بے بسی سے عثمان کو دیکھا تھا۔

''عثمان! جانے دو اپنی ماما کو انڈیا۔ کیوں بلاوجہ کی ضد کرتے ہو ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں تمہاری ماما میں اب جا کر کیا کروں گا۔ خوشی دینے کے بجائے الٹا انہیں تکلیف دوں گا۔''

وہ ڈیڈ سے بحث نہیں کرتا تھا۔ سو خاموش رہا۔ لیکن دل میں اس کا ارادہ پکا تھا کہ وہ ڈیڈ کو پاکستان لے جانے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ سلمیٰ اپنے پروگرام کے مطابق انڈیا چلی گئی تھیں۔ اور ان کے جانے کے صرف ایک ہفتے کے بعد قاسم ملک کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔ پھر وہی بھاگ دوڑ۔ یہ ٹیسٹ وہ ٹیسٹ اور آخر کار نتیجہ یہ کہ اندر کہیں پیٹ میں کینسر کا کچھ حصہ رہ گیا تھا۔ جو تیزی سے پھیلتا جا رہا تھا۔ اس بار اس نے قاسم ملک کے منع کرنے کے باوجود ہاشم ملک کو ان کی بیماری کے متعلق بتا دیا تھا۔

''تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا عثمان؟'' وہ تڑپ تڑپ کر رو دیے تھے۔

''ڈیڈ نے منع کر دیا تھا بابا! کہ آپ پریشان ہوں گے۔ تکلیف ہوگی آپ کو۔''

''تو کیا اب تکلیف نہیں ہو رہی مجھے۔'' وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔

''وہاں تم اکیلے کیسے سنبھالتے ہوں گے۔ میں آ رہا ہوں عثمان پریشان نہ ہونا۔'' قاسم ملک نے سنا تو منع کیا۔

''اب کیا فائدہ بھائی صاحب! خوامخواہ فضول خرچی۔ کینسر پورے پیٹ میں پھیل چکا ہے۔ میرے پاس اب وقت نہیں رہا۔ میں نے عثمان سے وعدہ لیا ہے کہ وہ مجھے آپ کے پاس لے آئے گا ہمیشہ کے لیے۔''

لیکن وہ ہاشم ملک جنہیں اپنے سے چھ سال چھوٹے اس بھائی سے اپنے بچوں کی طرح پیار تھا۔ ویزے کی کوشش میں لگ گئے لیکن یہ اتنا آسان نہ تھا۔ ان کے اختیار میں ہوتا تو وہ اڑ کر اپنے بھائی کے پاس پہنچ جاتے۔

''عثمان! حوصلہ رکھنا، خرچ کی پروا مت کرنا۔ اگر سب کچھ بیچ کر بھی قاسم کا علاج کروانا پڑا تو کروائیں گے۔ تم بڑے سے بڑے اور ماہر ڈاکٹر سے رجوع کرو۔'' انہوں نے بغیر اس کے کہے اسے

پیسے بھجوا دیے تھے۔

''امید ہے ویزا لگ جائے گا۔'' انہوں نے اسے تسلی دی تھی۔

اور وہ حیران ہوتا تھا ان محبتوں پر۔ ایک اس کی مام تھیں جنہوں نے کہا تھا۔

''اسی لیے پاکستان جانے سے منع کر رہی تھی اور تم......''

''آپ آ جائیں مام اسی ہفتے پھر ان کا آپریشن ہے۔'' اس نے اصرار کیا تھا۔

''اتنا خرچ کر کے آئی ہوں تو یوں ہی چلی آؤں تم ہوتا وہاں۔ ابھی تو ایک ہفتہ ہی ہوا ہے مجھے آئے ہوئے۔''

اور وہ خاموش ہو گیا تھا۔ ہاشم ملک مسلسل اس سے رابطے میں تھے۔ ایک بار پھر وہی سلسلہ آپریشن، کیمو۔ اس سے ڈیڈ کی تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی۔ سلمیٰ اپنے پروگرام کے مطابق ہی ایک ماہ بعد واپس آ گئی تھیں اور آتے ہی اپنی جاب میں مصروف ہو گئی تھیں۔

قاسم ملک گھر پر ہی تھے جب کیمو تھراپی ہوتی ہوتی تو ہاسپٹل جاتے تھے۔ وہ ہر وقت ڈیڈ کے پاس ہوتا۔

''یہ تم ہر وقت ان کی پٹی سے لگے رہتے ہو عثمان تمہاری جاب تو ابھی اسٹارٹ ہوئی تھی۔'' دو تین دن بعد وہ اس سے پوچھ رہی تھیں۔

''میں نے جاب چھوڑ دی ہے۔''

''کیوں؟'' وہ جیسے چیخی تھیں۔

''یہ پرائیویٹ ہسپتالوں کا اتنا خرچ، مجھ سے امید مت رکھنا میرے پاس ایک دھیلا بھی نہیں ہے اور تم تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی۔'' اب وہ مشکوک نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ''کہیں گھر کا سودا تو نہیں کر لیا؟''

''تایا جان نے بھجوائے ہیں!'' وہ ان کے رویے پر حیران تھا۔

''اوہ ہاں...... آخر تمہارے باپ کا بھی حصہ ہو گا وہاں کی پراپرٹی میں۔''

''میرا کوئی حصہ نہیں ہے۔'' قاسم ملک نے ان کی بات سن لی تھی۔

''میں نے اپنے حصے کی زمین فروخت کر کے وقتاً فوقتاً رقم منگوائی تھی۔ جب یہ گھر خریدا، جب تمہیں نئی گاڑی خرید کر دی۔ جب تمہیں بوٹ (کشتی) خریدنے کا شوق چرایا۔''

''ڈیڈ!'' انہوں نے سہارے کے لیے دیوار پر ہاتھ رکھا تو وہ بے چین ہو کر ان کے پاس آیا۔ ''آپ کیوں باہر آ گئے۔''

وہ انہیں سہارا دیتا ہوا ان کے بیڈ روم میں لے گیا تھا اور سلمیٰ لاؤنج میں بیٹھی کچھ دیر بڑبڑاتی رہیں اور پھر گاڑی کی چابی اٹھا کر گھر سے نکل گئیں۔

اور وہ کتنی ہی دیر تک سوچتا رہا کہ بھلا ڈیڈ کو مام میں کیا نظر آیا تھا کہ انہوں نے انہیں جیون بھر کا ساتھی بنا لیا۔ شاید تنہائی سے گھبرا کر دوسرا ہٹ کی خواہش میں ورنہ ان میں کچھ ایسا خاص نہ تھا وہ بالکل عام سی تھیں اور وہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہ تھیں۔

ڈیڈ نے اسے بتایا تھا کہ جن دنوں وہ پڑھ رہے تھے تو دوسرے اسٹوڈنٹس کی طرح اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے ہفتے میں دو دن ایک اسٹور پر جاب کرتے تھے اور سلمیٰ بیگم بھی وہاں ہی جاب کرتی تھیں ان کا تعلق انڈیا سے تھا اور وہ یہاں اپنی بہن کے پاس رہتی تھیں شاید بہن نے انہیں اسپانسر کیا ہو یا ایجوکیشن ویزا لے کر آئی ہوں۔ سلمیٰ بیگم شاید ڈیڈ کے دل کو بھا گئی تھیں کہ ڈیڈ نے انہیں اپنی زندگی میں شامل کر لیا تھا۔ اگر ڈیڈ نے پاکستان میں شادی کی ہوتی تو آج وہ ان کے ساتھ اکیلا نہ ہوتا۔ سب ہوتے حوصلہ دینے اور تسلی دینے والے۔

''کیا سوچ رہے ہو عثمان؟'' وہ نیم وا آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

''بابا کہہ رہے تھے منذے کو ایمبیسی والوں نے پھر انہیں بلایا ہے۔ امید ہے ویزا لگ جائے گا۔ آپ سو رہے تھے تو ان کا فون آیا تھا۔ اسی کے متعلق

سوچ رہا تھا کہ اگر ویزا نہ لگا تو۔ میں نے تو وہ سارے پیپرز بابا کو بھجوا دیئے تھے جو انہوں نے منگوائے تھے معہ آپ کی میڈیکل رپورٹ کے۔"

"اپنی مام کی باتوں کا برا مت مانا کرو عثمان۔"

اس کی ساری بات سن کر انہوں نے کہا تھا۔

"اور اپنا وعدہ یاد رکھنا مجھے یہاں دفن مت کرنا۔ مجھے میرے گاؤں لے جانا۔ تمہاری مام تمہیں روکیں گی۔ منع کریں گی لیکن بس یہ ایک بات تم ان کی نہ ماننا تم ایک فرماں بردار بیٹے ہو عثمان! تم نے کبھی میری یا اپنی ماں کی نافرمانی نہیں کی لیکن مجھے میری مٹی کے حوالے کرنا۔"

ان کی آنکھوں میں نمی پھیلنے لگی تو انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔

"ڈیڈ!" اس نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا تھا۔

"میں آپ سے کیا وعدہ ہر حال میں نبھاؤں گا۔ لیکن مجھے یقین ہے آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کی طبیعت ذرا سی سنبھل جائے تو ہم پاکستان چلیں گے۔ اب تو ٹکٹ کا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بابا نے میرے منع کرنے کے باوجود پھر میرے اکاؤنٹ میں پیسے بھجوا دیئے ہیں اور پھر کیا خبر، بابا کا ویزا لگ جائے اور وہ خود ہی آپ کو یہاں آ کر لے جائیں۔ وہ کہتے ہیں وہاں پاکستان میں بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ انہیں یہاں کے ڈاکٹروں پر زیادہ یقین نہیں ہے۔"

پتا نہیں وہ خود کو تسلی دے رہا تھا یا انہیں کیوں کہ ڈاکٹر نے اسے صاف بتا دیا تھا کہ زندگی کی امید نہیں۔ بس چند ہفتے، چند ماہ اور قاسم ملک ہر روز اس سے وعدہ لیتے اور وہ ہر روز روتے دل کے ساتھ وعدہ کرتا اور اسے وعدہ تو نبھانا ہی تھا۔ جس روز ہاشم ملک کا ویزا لگا۔ اسی روز قاسم ملک نے لندن کے ایک ہاسپٹل میں آخری سانس لی۔

"بابا! میں ڈیڈ کو لا رہا ہوں۔ سیٹ کنفرم ہوتے ہی آپ کو اطلاع دیتا ہوں۔" اس سے مزید بولا نہ گیا تھا۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے عثمان! جانتے ہو ڈیڈ باڈی کو پاکستان لے جانے کا کتنا خرچ ہوگا۔" سلمٰی بیگم نے سنا تو وہ چلانے لگی تھیں۔

"میں نے ڈیڈ سے وعدہ کیا تھا اور مجھے اپنا وعدہ پورا کرنا ہے مام.....!"

وہ نرمی سے کہہ رہا تھا لیکن سلمٰی بیگم کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

"وہ مر چکا ہے اور یہ دیکھنے کے لیے واپس نہیں آئے گا کہ تم نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے یا نہیں۔ مٹی تو ہر جگہ کی ایک جیسی ہوتی ہے یہاں کی ہو یا وہاں کی تمہارے پاس فالتو رقم ہے تو مجھے دے دو۔ ضرورت ہے مجھے۔"

"ڈیڈ کہتے تھے۔ ہر جگہ کی مٹی کی اپنی ایک الگ خوشبو ہوتی ہے اپنی مٹی کی خوشبو میں اپنائیت ہوتی ہے۔ غیر اور اجنبی زمینوں کی خوشبو میں ہمیشہ اجنبیت ہی رہتی ہے۔" وہ ڈیڈ کی باتیں بھولتا ہی نہ تھا۔

"اس کا تو دماغ خراب تھا تمہارا بھی خراب کر دیا ہے۔"

ماما کے جھنجلانے کے باوجود وہ ڈیڈ کی ڈیڈ باڈی لے کر پاکستان آ گیا تھا۔ ڈیڈ کو لینے ایئرپورٹ پر جیسے سارے گاؤں کے مرد آئے ہوئے تھے۔

"یہ قاسم نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ۔ عثمان! اتنی دیر لگا دی آنے میں۔"

اس کے گلے لگتے ہوئے بابا نے شکوہ کیا تو کتنے دنوں کے رکے آنسو بہہ نکلے تھے۔

☆☆☆

گھر میں کتنے ہی دن سوگ کی فضا طاری رہی۔ عورتیں صبح صبح آ کر برآمدے میں بیٹھ کر قرآن خوانی کرتیں۔ وہ بابا کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ کر قبرستان جاتا کبھی کوئی ان سے پہلے ہی قبر پر پھول ڈال کر پانی چھڑک جاتا، کبھی وہ گھر سے لائے ہوئے پھول قبر پر ڈالتا تو اسے لگتا جیسے اوپر آسمانوں پر کہیں ڈیڈ کی روح مسکرائی ہو۔ اسے ڈیڈ کو یہاں لا کر اپنے والدین کے قدموں میں مٹی کے سپرد کرنے کا اپنا فیصلہ

صحیح لگتا۔

ماما ابھی تک اس سے ناراض تھیں اور انہوں نے اس کے آنے کے بعد ایک بار بھی اسے فون نہیں کیا تھا۔ وہ یہاں اوپر چھت پر انہیں فون کرنے ہی آیا تھا کہ یہاں سگنلز کا مسئلہ تھا۔ گاؤں میں چند ماہ پہلے ہی دو موبائل کمپنیوں نے ٹاور لگائے تھے اور عبدالرحمٰن سے بابا نے اسے سم منگوا دی تھی۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ وہاں تو ابھی صبح کے پانچ بجے ہوں گے اور ماما سو رہی ہوں گی، اگر انہیں کام پر جانا ہوتا تو وہ چھ بجے تک اٹھ جاتی تھیں۔

اس نے کہنیاں منڈیر سے ہٹائیں اور سیدھا ہو کر کھڑا ہوا تو نظریں سامنے کھیتوں سے باہر نکلتی شالی اور ماہی پر پڑیں۔ وہ دونوں ساگ کی گٹھریاں اٹھائے گھر کی طرف آ رہی تھیں۔ سورج سامنے درختوں کے جھنڈ سے سر نکال رہا تھا۔ دھوپ ابھی یہاں چھت تک نہیں پہنچی تھی لیکن خنکی نہیں تھی حالانکہ فروری کا آخری ہفتہ تھا۔

وہ سیاہ گہری جھیل جیسی آنکھوں والی ماہی ان آٹھ سالوں میں ننھی بچی سے خوب صورت دوشیزہ میں ڈھل چکی تھی۔ ڈیڈی کو دفن کرنے کے پانچویں دن صبح اس نے ماہی کو یہاں آنے کے بعد پہلی بار دھیان سے دیکھا تھا۔ وہ برآمدے میں کھڑی طاق سے قرآن اٹھا رہی تھی۔ اس نے دوپٹا اچھی طرح سر کے گرد لپیٹا ہوا تھا۔ لگتا تھا جیسے ایک روشنی ایک نور نے اس کے چہرے کے گرد ہالہ بنایا ہوا تھا۔ وہ اسے دور جنگلوں میں اگنے والے اس پھول کی طرح لگی جسے کسی نظر تک نے چھوا نہ ہو۔ اسے دیکھ کر دور پہاڑوں میں بہتے شفاف پانیوں والے چشموں کا خیال آتا تھا وہ پہچان گیا تھا۔ وہ ماہی تھی جس کی آنکھیں اسے سیاہ جھیلیں لگتی تھیں۔ وہ شاید نماز سے فارغ ہو کر اب قرآن پڑھ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے سلام کیا تھا۔

''تم ماہی ہو نا؟'' اس کے سلام کا جواب دے کر اس نے پوچھا تو اس نے سر ہلایا۔

''میں آپ کو یاد ہوں؟'' ماہی کی آنکھوں میں تجسس تھا۔

''ہاں لیکن میرے تصور میں تم چھوٹی سی بچی تھیں۔ جو شروع شروع میں ہمیں دیکھ کر بڑی اماں کے پیچھے چھپ جاتی تھیں اور پھر جب تم سے دوستی ہوئی تو تم بہت باتیں کرتی تھیں۔ اپنی سہیلی شالی کی اس کے ڈوگی ڈبو کی۔''

اور اس کی پرتجسس آنکھوں میں روشنیاں سی جل اٹھی تھیں۔

''مجھے بھی آپ یاد تھے اور چاچو بھی۔ ہم بڑی اماں اور بابا اکثر آپ کی اور چاچو کی باتیں کرتے تھے۔ مجھے جب چاچو کا پتا چلا تو میں نے بہت دعا مانگی لیکن۔''

اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں اور اس روز وہاں برآمدے میں بیٹھ کر اس نے ماہی سے ڈیڈ کی بہت ساری باتیں کی تھیں۔

اس روز ہی ماہی نے اسے بتایا تھا کہ اس نے میٹرک کر لیا ہے اور اب بڑی اماں سے پڑھتی ہے اس کا ارادہ پرائیویٹ ایف اے کرنے کا ہے۔ ''بابا کہتے تھے کہ شہر میں کالج میں داخلہ لے لوں۔ یہاں تو میٹرک تک ہی اسکول ہے لیکن مجھے ڈر لگتا ہے۔ صالحہ آپی اور ناہید باجی نے بہت کہا بڑی اماں سے کہ مجھے ان کے پاس بھیج دیں۔ صالحہ آپی کا گھر تو بالکل کالج کے پاس ہے لیکن بڑی اماں اور بابا کو مناسب نہیں لگتا میرا وہاں رہنا۔ تو اب گھر پر ہی پڑھتی ہوں۔''

''اچھا ہے۔ بابا اور بڑی اماں کالج سے اچھا پڑھائیں گے۔''

وہ اتنی شفاف اور پاکیزہ سی تھی کہ شہر تو اس کی معصومیت کو نگل لیتے۔ وہ غیر ارادی طور پر اسی کے متعلق سوچتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیوں کا اختتام صحن میں ہوتا تھا، کشادہ کچا صحن جس میں دیوار کے ساتھ ساتھ پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ جامن، انار اور دھریک کے درخت تھے۔ پورے صحن میں بھینی بھینی سی خوشبو پھیلی رہتی تھی۔ شاید ڈیڈ اس سب کو ہی

محسوس کرتے ہوں گے اپنی بیماری کے دنوں میں وہ گزرا وقت بہت یاد کرتے تھے۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ گرمیوں میں سر شام ہی صحن میں چھڑکاؤ کر کے چارپائیاں بچھادی جاتی تھیں۔ رات کو باہر صحن میں سویا جاتا اور وہ اپنی چارپائی پر لیٹے اوپر آسمان پر چمکتے ستاروں کو دیکھتے اور گنتے ہوئے سو جاتے تھے۔ لیکن وہ جب پہلے ڈیڈ کے ساتھ آیا تھا تب بھی موسم قدرے سرد تھا اور سب کمروں میں سوتے تھے، اب بھی وہی فروری کا مہینہ تھا۔

دن میں جب دھوپ برآمدے میں بھر جاتی تو برآمدے میں بیٹھ کر دھوپ سینکنا اچھا لگتا تھا۔ بڑی اماں برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھے بیٹھے ڈھیروں کام نپٹا لیتی تھیں۔

یہاں زندگی کتنی سادہ اور خوب صورت تھی۔ کاش وہ ہمیشہ یہاں رہ سکتا۔ لیکن ماما تو کبھی بھی یہاں نہ رہنا چاہیں گی، وہ بغیر دیکھے ہی یہاں کی زندگی کو ناپسند کرتی تھیں اور وہ...... وہ بھلا ماما کو کیسے چھوڑ سکتا تھا اور پھر ڈیڈ نے اس سے کہا تھا کہ ہمیشہ اپنی ماما کا خیال رکھنا۔ وہ تھوڑی جذباتی اور زود رنج ہیں اگر کبھی ان کی کوئی بات ناگوار گزرے تو نظر انداز کر دینا۔ جانتے ہو نا ہمارے مذہب میں والدین کا خیال رکھنے کو کہا گیا ہے۔

اور اسے اپنی مام کا خیال رکھنا تھا اور یہ طے تھا کہ وہ کبھی یہاں آ کر رہنا نہیں چاہیں گی۔ دل ہی دل میں وہ یہاں کی زندگی کو سراہتا ہوا سیڑھیوں سے اتر کر صحن میں آیا۔ پھر برآمدے میں آ کر مڑ کر دیکھا وہ صحن کا بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہی تھی شانی بھی اس کے ساتھ تھی لمحہ بھر کے لیے اس کے اٹھتے قدم رکے تھے۔

سیاہ اوڑھنی میں اس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا پھر وہ اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر ہاشم ملک کے کمرے کی بڑھ گیا۔ وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے نیم دراز تھے آہٹ پر آنکھیں کھولیں اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

''بات ہوئی تمہاری عظمی بھابھی سے۔''

نہیں۔ مجھے خیال ہی نہیں رہا ابھی تو وہ سو رہی ہوں گی۔

وہ بیڈ کے قریب ہی پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

خیر میں نے عبدالرحمن سے کہا ہے کہ وہ آج پی ٹی سی ایل کے دفتر جا کو خود بندہ لے کر آئے فون ٹھیک ہو گیا تو پھر بات کر لینا، اب تو سہولت ہو گئی ہے ڈائریکٹ بات ہو جاتی ہے کال بک نہیں کروانی پڑتی۔

''جی''

اس نے سر اٹھا کر بغور انہیں دیکھا وہ پہلے کے مقابلے میں بہت کمزور اور بوڑھے لگ رہے تھے، آٹھ سال پہلے جب اس نے انہیں دیکھا تھا تو وہ ڈیڈ سے چھ سال بڑے ہونے کے باوجود ان سے چھوٹے ہی لگتے تھے۔ اتنے دنوں سے وہ اپنے ہی غم میں مبتلا تھا اور اس نے اتنے دھیان سے انہیں دیکھا ہی نہیں تھا پھر اتنا وقت ہی کہاں ملا تھا ان کے پاس بیٹھنے کا۔

سارا دن ادھر ادھر اور دور دراز سے لوگ ان کے پاس تعزیت کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان کے کولیگز اسٹوڈنٹ جس جس کو پتا چلتا آجاتا۔ ان کا زیادہ وقت ڈیرے پر ہی گزر رہا تھا اس کے لیے تو سب اجنبی تھے سو کچھ دیر بعد ہی اٹھ آتا دو دن سے آمد و رفت کا یہ سلسلہ کچھ کم ہوا تھا اس لیے آج ناشتے کے بعد وہ گھر ہی تھے۔

''آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں بابا!''

''عمر کا تقاضا ہے یار۔'' اب روز بروز کمزور ہی ہونا ہے۔

مدھم سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہو کر معدوم ہو گئی تھی۔

''خیر اب آپ اتنے بھی بوڑھے نہیں ہوئے۔''

اسے بڑی اماں نے بتایا تھا کہ ابھی ان کی ریٹائرمنٹ میں چھ سال رہتے ہیں۔ فی الحال تو انہوں نے یوکے جانے کے لیے چھٹی لے رکھی ہے دو ماہ کی۔

''ففٹی فورکوئی اتنی زیادہ عمر نہیں سمجھی جاتی یو کے میں، وہاں تو ریٹائرمنٹ کی عمر بھی سکسٹی فائیو ہے۔''

''عمر کا کیا ہے قاسم تو صرف اڑتالیس سال کا تھا اور مجھ سے پہلے چلا گیا۔'' ان کی آنکھیں نم ہوئیں۔

''دو سال سے تکلیف میں تھا بھی بتایا ہی نہیں۔ بتاتا تو۔ وہ خود نہیں آ سکتا تھا تو میں آ جاتا اور تم نے بھی تو نہیں بتایا۔''

انہوں نے ایک بار پھر شکوہ کیا تھا۔ نہ جانے کتنی بار پہلے بھی کر چکے تھے اور ہر بار کی طرح اس نے اس بار بھی وہی جواب دیا۔

''میں کیا کرتا بابا ڈیڈ نے منع کر دیا تھا بتانے کو۔''

''ہاں، وہ بچپن سے ایسا ہی تھا اپنا دکھ، اپنی تکلیف کسی سے نہ کہتا۔ خود ہی برداشت کرتا رہتا۔ پتا نہیں کتنی باتیں دل کی دل میں ہی رہ گئیں۔'' انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

''جب ٹھیک تھا تب بھی کچھ نہیں کہتا تھا۔ میں کہتا قاسم کب آؤ گے۔ وعدہ کیا تھا تم نے ہر سال آنے کا۔ وہ کہتا کچھ مسئلہ ہے ہاشم بھائی۔ فی الحال نہیں آ سکتا لیکن جلد آؤں گا۔ لیکن میرے پوچھنے پر بھی کبھی اپنا مسئلہ نہیں بتاتا تھا ذکر تو کرتا کہ معاشی پرابلمز ہیں تو میں پیسے بھجوا دیتا۔'' یہ بات کچھ دن پہلے ہی اس نے انہیں بتائی تھی کہ کس وجہ سے وہ نہیں آ سکے تھے۔

''تم سے آخری دنوں میں کیا باتیں کرتا تھا۔ میں تو سوچتا ہی رہ گیا کہ میں جاؤں گا تو دونوں بھائی ڈھیر ساری باتیں کریں گے وہ باتیں جو ہم کبھی کر نہ سکے دل میں رہ گئیں۔''

''اپنے آخری دو ماہ میں انہوں نے بہت باتیں کی، اپنے بچپن کی، گاؤں کی، اپنے والدین کی آپ کی، دوستوں کی، گاؤں کے خاص خاص لوگوں کی۔''

اور اپنے آخری دنوں میں تو انہوں نے اس سے بہت سارے وعدے بھی لیے تھے۔ پتا نہیں کیا کیا اسے تو سب یاد بھی نہیں رہے تھے۔ وہ سوچنے لگا کہ اس نے ڈیڈ سے اور کیا کیا وعدے کیے تھے۔ ایک وعدہ تو پورا ہو گیا تھا اور۔

''عثمان!''

''جی بڑے ابا!'' وہ چونکا۔

''ابھی کچھ دن رہو گے نا؟''

''زیادہ تو نہیں دو تین ہفتے مزید رک جاؤں گا۔'' اس نے مزید دو تین ہفتے رکنے کا ارادہ کیا۔

''ابھی میری گریجویشن مکمل ہوئی تھی۔ اب واپس جا کر کسی اچھی سی جاب کے لیے اپلائی کروں گا۔ پہلے تو ڈیڈ کی وجہ سے پارٹ ٹائم جاب ہی چل رہی تھی۔''

''دو ہفتے تو پلک جھپکتے میں گزر جائیں گے۔'' وہ افسردہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ ''عثمان! میرا جی چاہتا ہے تم ہمیشہ کے لیے یہاں ہی آ جاؤ میں قاسم سے بھی کہتا تھا کہ ساری عمر پردیس میں گزاری اب لوٹ آؤ۔ وہ کہتا تھا۔ بہت جی چاہتا ہے آنے کو لیکن آ نہیں پاتا۔ یہ کیسی زنجیریں ہیں جو آدمی خود اپنے قدموں میں ڈال لیتا ہے اور پھر بھی خود کو ان زنجیروں سے آزاد نہیں کر پاتا۔'' انہوں نے ایک آہ بھری۔

''مجھے تم سے ایک اور بات بھی کرنی تھی عثمان! تمہارے ڈیڈ کی خواہش تھی کہ......'' تب ہی کھلے دروازے سے ماہی نے اندر جھانکا تو وہ بات ادھوری چھوڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

''یہ تم اتنی دیر سے کہاں غائب تھیں۔''

''وہ شالی گندلیں توڑنے جا رہی تھی تو میں بھی چلی گئی کہ چلو، آج ہم بھی سرسوں کا ساگ پکاتے ہیں۔'' اس نے اندر قدم رکھا۔

''تمہارا دل چاہ رہا تھا تو خورشیداں سے کہتیں۔ وہ لے آتی۔'' بابا کو اس کا بہت خیال رہتا تھا۔ اس نے دیکھا تھا وہ شالی یا گاؤں کی دوسری لڑکیوں کی طرح کام نہیں کرتی تھی۔

''وہ میرا جی چاہ رہا تھا بابا، کہ میں خود شالی کے

ساتھ جا کر کھیت سے ساگ لے کر آؤں۔ پتا ہے بابا کھیتوں میں جا کر ساگ چننا، گندلیں توڑنا ایسا لگتا ہے جیسے ان کھیتوں میں ہل میں نے چلایا ہو اس مٹی میں میرا بھی پسینہ گرا ہو۔"

"جھلی نا ہو تو۔" ہاشم ملک مسکرائے۔ "تو پھر آج سرسوں کا ساگ پک رہا ہے۔"

"نہیں سرسوں کا ساگ پکانا آسان تھوڑا ہے۔ پہلے کاٹو پھر ابالو پھر۔"

اس نے نفی میں ادھر ادھر سر ہلایا تو اس کی ناک کی لونگ کا لشکارا اس کی سیاہ آنکھوں کی جھیلوں میں جھلملایا، وہ مبہوت سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

"آج تو بڑی اماں نے مرغا ذبح کروایا ہے۔ اور مرغے کے شوربے میں خالہ خورشیداں کو بڑیاں ڈالنے کا کہا ہے۔ اب پتا نہیں انگریزوں کے ملک سے آنے والوں کو پسند بھی آئے گا یا نہیں۔"

اس نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"کیوں پسند نہیں آئے گا۔ قاسم کو بہت پسند تھا عثمان کو بھی اچھا لگے گا۔ تم بتاؤ عبدالرحمن تمہاری کتابیں لے آیا تھا میں نے اسے لسٹ دے دی تھی۔" ہاشم ملک کو یاد آیا۔

"بہت بھلکڑ ہے وہ بابا، پتا نہیں آپ اسے اپنا ہونہار شاگرد کیوں کہتے ہیں۔" اس نے ناک چڑھائی۔

"چلو کوئی بات نہیں آج لے آئے گا۔" وہ مسکرائے۔

"تم ایسا کرو میرے اور عثمان کے لیے چائے لے آؤ۔ کیوں یار چائے چلے گی نا؟" وہ اب اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"اوہ ہاں، چائے تو ماسی خورشیداں بنا رہی ہے۔ ڈیرے پر مہمان آئے ہیں۔" اس نے سر پر ہاتھ مارا۔

"یہی تو بتانے آئی تھی۔ فضل چاچا آئے ہیں ڈیرے سے۔ ہے چک چوراسی سے چودھری سرور اور ان کے بھائی آئے ہیں اور بھول ہی گئی۔"

"ویسے ماہی! تم تو بھلکڑ نہیں ہو عبدالرحمن کی طرح۔" عثمان زیر لب مسکرایا۔

"ہاں تو میں کہاں بھلکڑ ہوں اس کی طرح وہ تو آج۔"

اور وہ جھینپ کر بات ادھوری چھوڑ کر باہر چلی گئی تو ہاشم ملک بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور تکیے کے پاس پڑی اپنی جناح کیپ سر پر رکھی۔

"تم چلو گے عثمان۔"

"میں جا کر کیا کروں گا بابا! مجھے تو کوئی نہیں جانتا۔" اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑا اخبار اٹھا لیا۔

"وہ تمہارے باپ کے افسوس کے لیے ہی تو آئے ہیں عثمان! فاتحہ کے بعد آ جانا۔ چودھری سرور تمہارے ڈیڈ کے دوست تھے۔ میٹرک تک دونوں نے ایک ہی اسکول میں پڑھا۔"

"جی!" وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اخبار واپس رکھ دیا۔

"مہمان دوسرے چک سے آئے ہیں تو کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ فضل کے ہاتھ ڈیرے پر بھجوا دینا۔"

ہاشم ملک نے باورچی خانے کے پاس رک کر خورشیداں سے کہا اور اسے ساتھ لے کر ڈیرے پر آ گئے۔ وہ کچھ ہی دیر وہاں بیٹھا تھا پھر گھر آ گیا۔ ماہی تخت پر بیٹھی ساگ کاٹ رہی تھی۔ شالی اپنے گھر چلی گئی تھی۔ اس نے سوچا۔ وہ بابا کی اسٹڈی سے کوئی کتاب لے آئے لیکن پھر ادھر جاتے جاتے یوں ہی غیر ارادی طور پر ماہی کے پاس تخت پر بیٹھ گیا اور ساگ اکٹھا کرنے لگا۔

"ارے ارے یہ کیا کر رہے ہیں عثمان بھائی! یہ کوئی آپ کے کرنے کا کام ہے۔" اس نے ساگ اس کے ہاتھ سے لیا۔

"اگر میں تمہاری کچھ مدد کر دوں گا تو کیا ہو گا۔ اچھا ہے نا کام جلدی ہو جائے گا۔" اس نے کچھ گندلیں اٹھائیں۔

"یہ سخت ڈنڈی توڑ دیں۔" وہ مسکرائی۔

"ٹھیک ہے لیکن یہ تو بتاؤ یہ اتنا زیادہ ساگ کیا

کروگی۔ کھانے والے تو ہم چار اور ماسی خورشیداں، بھافضل یہ ہوئے چھ بندے۔"

اس نے صاف صاف اور نرم ڈنڈیوں والی گندلیں اکٹھی کر کے مٹھی میں پکڑیں۔

ماہی نے یوں نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو اتنی سی بات بھی نہیں معلوم پھر مدھم سا مسکرائی۔

"دراصل ہمارے ہاں جب کسی کے گھر میں ساگ، کڑھی یا ایسی ہی کوئی چیز پکے تو آس پاس سارے گھروں میں بھیجی جاتی ہے۔"

"اچھا ہمارے لندن میں تو ایسا نہیں ہوتا۔" اس نے ہاتھ میں پکڑی گندلیں اسے پکڑائیں۔

"ہاں تو وہ بھی کوئی شہر ہے۔ ٹھنڈا، سردمہر اور بے حس۔" اس نے ناک چڑھائی۔

"کیا شہر بھی سرد مہر اور بے حس ہوتے ہیں ماہی۔" وہ حیران ہوا۔

"ہاں تو...... یہ تو قاسم چاچو کہتے تھے بابا سے کہ لندن بڑا ظالم اور سرد مہر شہر ہے۔"

ڈیڈ تو آٹھ سال پہلے آئے تھے اور تب وہ تو دس سال کی تھی اور اسے ڈیڈ کی کہی بات یاد تھی۔

"شہر یا جگہیں ظالم یا سرد مہر نہیں ہوتیں ماہی لوگوں کے رویے سرد مہر ہوتے ہیں۔ لوگ ظالم ہوتے ہیں۔" اس نے لندن کا دفاع کیا بہرحال وہ لندن میں ہی پیدا ہوا اور پلا بڑھا تھا۔

"تو شہر لوگوں سے ہی تو جانے جاتے ہیں عثمان بھائی! جیسے کوفہ مطلب کوفی ظلم کا استعارہ ہے۔ اب ظلم تو اہل کوفہ نے کیا۔ کوفہ شہر نے تو نہیں نا......"

پتا نہیں وہ کیا کہہ رہی تھی وہ سمجھ نہ پایا۔ شاید بڑی اماں اور بابا نے اپنا سارا علم گھول کر اسے پلا دیا تھا۔

"چلو مان لیا لندن سرد مہر ہے لیکن پھر بھی لوگ وہاں رہتے ہیں نا۔" اسے ماہی سے گفتگو کرنے میں مزا آرہا تھا۔

"تو۔" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"اور اگر تمہیں بھی ایسے ہی کسی سرد مہر شہر میں رہنا پڑا تو رہ لوگی۔"

بے ارادہ ہی اس کے لبوں سے نکلا اور دل کے اندر کہیں کوئی کلی سی چٹکی تھی اور کسی خیال کی کونپل پھوٹی تھی۔

"میں بھلا کیوں کسی ایسے شہر میں رہوں گی میری تو کوئی ایسی مجبوری نہیں ہے۔" وہ ذرا سا حیران ہوئی۔

"فرض کرو اگر ایسی کوئی مجبوری ہو جائے تمہارا کوئی اپنا جو تمہیں پیارا ہو یا تم جسے پیاری ہو تو کیا اس اپنے کی خاطر وہاں رہنا پڑے تو رہ لوگی؟" وہ خود نہیں جانتا تھا کہ وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا۔

"پہلی بات تو یہ کہ اگر میں اسے پیاری ہوں گی تو وہ میری خاطر اس شہر کو چھوڑ دے گا نہ کہ مجھے مجبور کرے گا۔"

ایک مبہم سی مسکان اس کے لبوں پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ سیاہ پانیوں والی جھیلوں میں جیسے لحہ بھر کے لیے قندیلیں سی جل اٹھی تھیں۔

"اور دوسری بات یہ کہ جب میرا اپنا وہاں ہوگا تو میرے لیے وہ شہر بھلا سرد مہر کہاں رہے گا۔"

اور اس روز عثمان کو پتا چلا تھا کہ سادا اور معصوم سی ماہی بولنے کا ہنر خوب جانتی ہے۔ بات سے بات نکالنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ یہ ہی نہیں اس کی گفتگو میں ایک خوب صورتی تھی، حسن تھا اور کیوں نہ ہوتا آخر بڑی اماں جیسی رائٹر کے زیر سایہ پل رہی تھی بابا اگرچہ کہانی نگار نہ تھے لیکن لکھنے پڑھنے کے ادب آداب سے واقف تھے اور بات کرنے کا ہنر جانتے تھے۔

ساگ کٹ گیا۔ ماسی خورشیداں اٹھا کر لے بھی گئی لیکن وہ وہاں ہی تخت پر بیٹھے باتیں کرتے رہے یہاں تک کہ دھوپ، صحن کی دیواروں سے اتر کر برآمدے میں آبیٹھی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ سرد ملک کا باسی زیادہ دیر تک دھوپ میں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ یوں بھی آج سردی نہیں تھی۔ ہاشم ملک

ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ انہوں نے مہمانوں کے ساتھ ہی کھانا کھانا تھا۔ ماہی کچن میں چلی گئی جہاں بڑی اماں بھی خورشیداں کی مدد کروا رہی تھیں۔

وہ بابا کی اسٹڈی سے کچھ کتابیں لے کر اپنے کمرے میں آ گیا لیکن پڑھنے کی طرف دل مائل ہی نہ ہوا۔

خیال ہاشم ملک کی ادھوری بات کی طرف چلا گیا تھا پتا نہیں بابا کیا بتانے والے تھے اور ڈیڈ نے کیا خواہش ظاہر کی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ کچھ دیر اس کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ لیکن کچھ اندازہ نہ لگا سکا، تب ہی ماہی اسے کھانے کے لیے بلانے آ گئی۔ فضل مہمانوں کے لیے کھانا ڈیرے پر لے گیا تھا۔ کھانا کھا کر وہ ایک بار پھر چھت پر چلا گیا۔ اتفاق سے اس وقت سگنل آ رہے تھے۔ مام نے فوراً ہی فون ریسیو کر لیا وہ اس وقت ناشتہ کر رہی تھیں۔

''یہ کیا عثمان! تم وہاں ہی چپک کر رہ گئے ہو۔ واپس کب آ رہے ہو۔'' اس کی آواز سنتے ہی انہوں نے کہا تو اس نے اپنا پروگرام بتایا۔

''شاید دو یا تین ہفتے مزید رک جاؤں۔''

''کیا؟'' وہ اتنی زور سے چیخی تھیں کہ غیر ارادی طور پر اس نے فون کان سے دور کیا۔

''تمہارا دماغ ٹھیک ہے عثمان! تمہیں جاب سے اتنی چھٹی نہیں مل سکتی۔''

''وہ جاب عارضی تھی مام! میں نے چھوڑ دی تھی۔ واپس آ کر اپنی ایجوکیشن اور شعبے کے مطابق جاب تلاش کروں گا۔ دو تین جگہ اپلائی کیا ہوا ہے۔''

اس نے بتایا تو لمحہ بھر کے توقف کے بعد قدرے کم بلند آواز میں وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولیں۔

''دیکھو عثمان! میں اس اتنے بڑے چار بیڈ روم کے گھر کو اکیلے مینیج نہیں کر سکتی۔ میں نے سوچا ہے کہ اس بڑے گھر کو سیل کر کے دو بیڈ روم کا ایک چھوٹا سا گھر یا اپارٹمنٹ لے لیتے ہیں۔''

''لیکن ڈیڈ نے بہت شوق سے یہ گھر خریدا تھا۔''

اسے مام کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

''بڑے گھروں کے اخراجات بھی بہت ہوتے ہیں۔ تمہارے باپ کو شوق تھا بڑے گھروں میں رہنے کا۔ میں نے پراپرٹی ڈیلر سے کہہ دیا ہے۔ تم آ جاؤ تو...... اب وہاں کیا باپ کی قبر کی پوجا کر رہے ہو یا مجاور بن کر بیٹھ گئے ہو۔''

وہ مسلسل بول رہی تھیں وہ فون بند کر کے نیچے آ گیا۔

مام پتا نہیں ایسی کیوں ہیں۔ بڑی اماں بھی تو ہیں نا بابا کی کتنی عزت کرتی ہیں۔ کتنی محبت کرتی ہیں ان سے اور کتنا خیال رکھتی ہیں ان کا۔ وہ غیر ارادی طور پر مام کا اور بڑی اماں کا موازنہ کرنے لگا۔

بڑی اماں اور بابا کی پسند کی شادی تھی۔ ڈیڈ نے اسے بتایا تھا کہ وہ بابا کی یونی ورسٹی فیلو تھیں۔ جنہوں نے شادی کے بعد پہلی بار گاؤں دیکھا تھا لیکن وہ گاؤں میں ایسی رس بس گئی تھیں جیسے گاؤں میں ہی ہمیشہ سے رہتی آئی ہوں۔ یہ ہوتی ہے محبت خود کو محبوب کے رنگ میں رنگ لینا۔

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اس نے صحن میں رک کر برآمدے کی طرف نظر دوڑائی۔ برآمدہ خالی تھا۔ اور کچن میں بھی خاموشی تھی۔ شاید بڑی اماں اور ماہی اپنے کمروں میں چلی گئی ہوں گی۔ وہ بھی اپنے کمرے میں آ گیا۔ اور ایک بار پھر بابا کی اسٹڈی سے لائی ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب اٹھالی۔

یہ کافی پرانا ناول تھا ''دی جنٹلمین آف فرانس'' لیکن کافی دلچسپ تھا وہ اس میں کھو گیا۔ شام کی چائے بھی ماسی خورشیداں اسے کمرے میں ہی دے گئی تھی۔ پھر وہ رات کے کھانے کے لیے کمرے سے نکلا تھا۔ رات کا کھانا عام طور پر ہاشم ملک کے کمرے میں ہی کھایا جاتا تھا۔ خورشیداں مغرب کے بعد چلی جاتی تھی۔ اس لیے رات کا کھانا ماہی ہی لگاتی تھی۔

☆☆☆

جب سے وہ آیا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ رات کے کھانے کے بعد وہ اس وقت تک ان کے کمرے

میں بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہتا جب تک بڑی اماں کچن سمیٹ کر اور عشاء کی نماز پڑھ کر کمرے میں نہ آ جاتیں۔

ماہی بھی ان کے ساتھ ہی کچن سمیٹنے میں ان کی مدد کرتی تھی۔ کبھی کبھار وہ جلدی فارغ ہو جاتی تو وہ بھی کچھ دیر کے لیے ان کے پاس آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ بابا زیادہ تر ڈیڈ کے بچپن کی باتیں کرتے تھے۔

اس رات بڑی اماں اور ماہی کے جاتے ہی اس نے ہاشم ملک سے پوچھا۔

''بابا! آپ دن میں کچھ بتا رہے تھے ڈیڈ کے متعلق۔ کیا خواہش تھی ان کی۔''

''ہاں قاسم نے اپنی وفات سے چند دن پہلے مجھ سے ایک خواہش ظاہر کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اگر ممکن ہو تو تمہاری اور ماہی کی شادی ہو جائے۔ بشرطیکہ تمہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہو۔ اس نے مجھ سے کہا تھا وہ تم سے بات کرے گا پتا نہیں اسے تم سے بات کرنے کا موقع ملا یا نہیں لیکن اس نے مجھے اس سلسلے میں ایک خط بھی لکھا تھا جو اس کی وفات سے دو دن پہلے مجھے ملا تھا۔''

وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا رہے تھے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بیڈ سائیڈ ٹیبل سے خط نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے خط پکڑ لیا۔

''آپ ہی بتا دیں بابا! ڈیڈ نے کیا لکھا ہے۔ آپ کو پتا تو ہے میرے لیے اردو پڑھنا مشکل ہے۔''

''یہ خط انگلش میں ہی ہے شاید قاسم چاہتا تھا کہ اگر تم پاکستان آؤ تو تم بھی یہ خط پڑھو۔''

اور اس نے ان سے خط لے لیا ڈیڈ نے لکھا تھا کہ ان کی شدید خواہش ہے کہ وہ عثمان کا رشتہ ماہی سے کریں اور یہ کہ ماہی کی تربیت بڑی اماں اور بابا نے کی ہے اور یہ عثمان کی خوش نصیبی ہوگی کہ ماہی اس کی رفیق حیات ہو۔

''عثمان بہت اچھا ہے ہاشم بھائی! یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ وہ سچ میں ایسا ہی ہے۔ محبت کرنے والا اور سب کا خیال رکھنے والا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے جیسی زندگی گزارے اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ اس کا رشتہ اس مٹی سے جڑا رہے جس میں میری جڑیں ہیں۔ ابھی میں نے عثمان اور اس کی ماں سے بات نہیں کی ہے۔ آپ کی اور بھابی جان کی رضامندی ہو تو بات کروں۔ مجھے یقین ہے ماہی عثمان کے ساتھ بہت خوش رہے گی۔''

لیکن ڈیڈ کو اس سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ کاش وہ ان کی زندگی کے آخری دنوں میں ہر پل، ہر لمحہ ان کے ساتھ ہوتا لیکن وہ اپنی مصروف زندگی میں سے زیادہ وقت نہ نکال پاتا تھا لیکن جو وقت بھی ملتا وہ ان کے پاس ہی رہتا۔

اس نے نم آنکھوں کے ساتھ خط پڑھ کر بابا کو دے دیا۔

''پھر آپ نے ڈیڈ سے کیا کہا؟'' بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا تھا۔

''اپنے مرتے ہوئے بھائی کی خواہش رد کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ وہ مجھ سے میری جان مانگتا تو بلا تردد دے دیتا۔ میں نے خط ملتے ہی اسے فون کیا تھا۔ میں اسے مرنے سے پہلے یہ خوشی دینا چاہتا تھا۔ وہ بہت خوش ہوا تھا لیکن اس سے زیادہ بات نہیں ہو پا رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ میں اسلام آباد جا رہا ہوں ان شاء اللہ اب روبرو بات ہوگی لیکن وہ آخری بار تھی جب میں نے اس کی آواز سنی وہ بار بار میرا اور تمہاری بڑی اماں کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔''

ہاشم ملک کی آواز بھرا گئی تھی۔

''اور اسی روز ان کی طبیعت بہت بگڑ گئی تھی اور انہیں ہاسپٹل لے جانا پڑا۔ مجھ سے انہیں بات کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ ہاسپٹل جاتے ہی وہ کومے میں چلے گئے تھے لیکن میرے لیے ڈیڈ کی خواہش، ہر شے سے اہم ہے اور پھر ڈیڈ صحیح کہتے ہیں کہ یہ میری خوش نصیبی ہے۔''

اس کی بات سن کر جہاں ہاشم ملک کے چہرے پر اطمینان نظر آیا تھا وہاں ان کی آنکھوں میں ہلکا سا اضطراب بھی تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں

دیکھا شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہ رہے تھے۔
"جی بڑے ابا! کیا کوئی اور بات بھی ہے۔"
"سلمٰی بھابی..... میرا مطلب ہے کیا قاسم نے سلمٰی بھابی سے اس رشتے کے متعلق بات کی تھی اور کی تھی تو انہوں نے کیا کہا؟" انہوں نے اپنے دل میں آنے والی سوچ ظاہر کی۔
"میرا خیال ہے نہیں، ورنہ وہ مجھ سے ضرور ذکر کرتیں۔ ماما بات دل میں نہیں رکھتیں۔ وہ کسی بھی بات پر فوراً ردعمل ظاہر کرتی ہیں۔" اسے یقین تھا کہ ڈیڈ نے ان سے بات نہیں کی ہوگی۔ وہ پہلے یقیناً اس سے بات کرتے۔
"سلمٰی بھابی نے کبھی خود یہاں آنا پسند نہیں کیا۔ ہوسکتا ہے وہ تمہارا رشتہ یہاں نہ کرنا چاہیں۔" انہوں نے خدشہ ظاہر کیا۔
"ہوسکتا ہے لیکن وہاں اولاد کی زندگیوں کے فیصلوں میں والدین دخل اندازی نہیں کرتے۔ میری کزن نے چند ماہ پہلے اپنی پسند سے ایک مصری نوجوان سے شادی کی ہے کسی نے اعتراض نہیں کیا اور میرے لیے جیسا کہ میں نے پہلے کہا، میرے ڈیڈ کی خواہش ہر بات سے بڑھ کر ہے لیکن بابا میں بہت جلد شادی نہیں کر پاؤں گا۔ کم از کم دو سال لگیں گے مجھے اسٹیبلش ہونے میں۔ اچھی جاب ملنے کے بعد میں ساتھ ہی اپنا ماسٹرز کروں گا اور پھر ماما کو ساتھ لے کر پاکستان آؤں گا اور باقاعدہ جیسا کہ پاکستان میں رواج ہے وہ آپ سے رشتہ مانگیں گی۔" اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
"جیتے رہو بیٹے!" انہوں نے محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ "میں بھی یہ ہی چاہ رہا تھا کہ سلمٰی بھابی خود تمہارے رشتے کی بات کریں۔ اور جہاں تک دو سال کی بات ہے تو میں خود بھی یہ ہی چاہتا ہوں۔ ماہی ابھی لاابالی سی ہے۔ چھوٹی ہے۔ وہ کم از کم بی اے کرلے۔ تھوڑی سمجھ دار ہو جائے اور ازدواجی زندگی کی نزاکتوں کو سمجھ سکے تب ہی اس کی شادی ہو۔"
"ٹھیک ہے بابا، میں واپس جا کر ماما سے بات

کرنا [illegible] اعتراض بھی کیوں ہوگا۔ ماہی سے اچھی بہو بھلا انہیں کہیں مل سکتی ہے۔"
وہ بے اختیار ہی کہہ گیا اور پھر جھینپ کر نظریں جھکالیں۔ ہاشم ملک بھی مسکرا دیے۔
"ٹھیک ہے لیکن ماہی سے ابھی اس کا ذکر مت کرنا۔ لڑکیاں بہت نازک دل ہوتی ہیں۔ اپنی آنکھوں میں خواب سجالیتی ہیں۔ اور اگر یہ خواب تعبیر نہ پاسکیں تو ان خوابوں کے ٹوٹنے کا دکھ برداشت نہیں کرسکتیں۔ میں چاہتا ہوں جب تک بھابی اس رشتے کو اوکے نہ کردیں۔ ماہی کو معلوم نہ ہو۔"
"جی.....!" اس نے ہاشم ملک سے وعدہ کرلیا تھا لیکن اپنی نگاہوں کی بے قراری اور بے تابی پر اسے اختیار نہیں تھا۔
نگاہیں اکثر ہی بے اختیار ہو جاتیں۔ نظریں جب بھی ماہی کی طرف اٹھتیں ان میں ایک استحقاق ہوتا۔ یہ لڑکی...... یہ خوب صورت جھیل جیسی آنکھوں والی لڑکی ایک روز اس کی زندگی میں شامل ہو جائے گی۔ اور اس کے سنگ زندگی کتنی خوب صورت ہو گی۔
وہ رات کو جب اپنے بیڈ پر سونے کے لیے لیٹتا تو گھنٹوں حیران ہو کر سوچتا رہتا کیسے چند دنوں میں یہ لڑکی اسے اپنی اپنی لگنے لگی ہے دل کے بے حد قریب، اتنی قریب کہ اس سے دور جانے کے تصور سے ہی دل ڈوبنے لگتا ہے اور وہ جو ہاشم ملک سے کہہ رہا تھا کہ وہ کم از کم دو سال تک شادی نہیں کر پائے گا۔ ایک رات اپنے بیڈ پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ وہ ماما سے بات کر کے جتنی جلدی ہوسکا انہیں لے کر پاکستان آئے گا۔ لیکن پتا نہیں ان کا ردعمل کیا ہوگا۔ انہیں تو ڈیڈ کا بھی پاکستان آنا پسند نہ تھا تو وہ بھلا اس کی شادی یہاں کرنے پر کیسے راضی ہوں گی۔
اس روز کے بعد اس کی صرف ایک بار ہی ان سے بات ہوئی تھی اور وہ مسلسل اسے فوراً واپس آنے کو کہہ رہی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان لوگوں کے پاس

جن سے وہ زندگی میں دوسری بار ملا ہے۔ رہ کر کیا کر رہا ہے۔ وہ انہیں سمجھا نہیں سکا تھا کہ یہ اس کے لیے اجنبی نہیں ہیں۔ بھلے وہ اپنی زندگی میں دوسری بار یہاں آیا ہے لیکن یہ اس کے اپنے تھے ان سے اس کا خون کا رشتہ تھا۔

وہ ماما کو تو قائل نہیں کر سکا تھا لیکن اپنے فیصلے پر قائم رہا اور مزید تین ہفتے رہا۔ یہ تین ہفتے اس کی زندگی کے چند خوب صورت دنوں میں سے تھے۔ پہلے دو ہفتے تو وہ ڈیڈ کے غم سے نکل ہی نہیں پایا تھا۔ گھر میں بھی سوگواری فضا تھی گو ڈیڈ کا غم اب بھی ایسا ہی تھا لیکن ان تین ہفتوں میں وہ نئے جذبوں سے آشنا ہوا تھا۔ اس نے محبت کو اپنے دل میں اترتے اور خون میں سرائیت کرتے محسوس کیا تھا۔ محبت کسی الہام کی طرح اس کے دل میں اتری تھی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ ڈیڈی کی خواہش خود اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش اور آرزو بن جائے گی۔ دل جذبوں کے اظہار کے لیے بے تاب تھا لیکن اسے بابا سے کیے اپنے وعدے کا احساس تھا لیکن نظریں جذبے لٹاتی تھیں۔ اور نظروں کی یہ بے اختیاری ماہی کے رخساروں کو گلگوں کر دیتی تھی۔ گھنی لمبی پلکوں کے سائے رخساروں پر لرزتے اور سیاہ جھیلوں کے پانیوں میں قمقمے جل اٹھتے تھے۔ جیسے وہ اس کی ان کہی سمجھتی تھی۔ تب ہی تو جوں جوں اس کے جانے کے دن قریب آ رہے تھے وہ اداس نظر آنے لگی تھی اور بیٹھے بیٹھے آنکھوں کے کونوں میں موجود کسی نامعلوم آنسو کو انگلی کی پوروں سے پونچھتی تھی۔

اس رات جس صبح اسے جانا تھا وہ دیر تک ہاشم ملک کے کمرے میں بیٹھے رہے تھے۔ سب کی آنکھیں باتیں کرتے کرتے بار بار بھیگ رہی تھیں اور سب ہی ایک دوسرے سے اپنی آنکھوں کی نمی چھپا رہے تھے۔

"رات بہت ہوگئی ہے۔ صبح جلدی اٹھنا ہے اب جا کر آرام کرو عثمان۔"

بڑی اماں نے ہاتھوں کی پشت سے اپنی بھیگی پلکیں صاف کیں وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ان کی اداس اور بھیگی پلکوں سے نگاہیں چراتا اور انہیں شب بخیر کہتا ہوا باہر نکل آیا۔ اس کی فلائیٹ دو بجے تھی لیکن انہیں صبح سویرے ہی نکلنا تھا۔ پہلے انہیں صالحہ آپی کے گھر جانا تھا اور وہاں گھنٹہ ٹھہر ٹھہر کر حامد بھائی کے ساتھ ایئرپورٹ کے لیے نکلنا تھا۔ عبدالرحمن کو اپنے کسی کام سے جہلم جانا تھا اس لیے وہ انہیں صالحہ کی طرف چھوڑ کر چلا گیا۔ اپنے کمرے کی طرف جاتے جاتے وہ برآمدے میں رک گیا۔ آسمان پر چمکتے پورے چاند کی روشنی نہ صرف صحن میں بکھری تھی بلکہ برآمدہ بھی روشن تھا۔

اس کا جی چاہا وہ صحن میں جائے اور سر اٹھا کر اوپر چمکتے چاند کو اور اس کے اردگرد بکھرے ستاروں کو دیکھے۔ ڈیڈ کی بیماری کے دنوں میں جب اس کا زیادہ وقت ان کے ساتھ گزرتا تھا۔ اپنے بچپن کی باتیں اسے بتایا کرتے تھے۔

ایک بار انہوں نے بتایا تھا کہ گرمیوں کی راتوں میں جب وہ صحن میں یا چھت پر سویا کرتے تھے تو اپنی چارپائی پر لیٹے اوپر آسمان پر چمکتے چاند اور ستاروں کو دیکھتے رہتے تھے۔ جن دنوں ستارے زیادہ روشن دکھائی دیتے تھے تو وہ اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے سب سے روشن ستارے کو تلاش کر کے بلند آواز میں اعلان کرتے تھے کہ وہ جو حیدر لالہ کی چھت کے عین اوپر ستارا ہے وہ میرا ہے۔ چارپائی پر لیٹ کر سات ستاروں کے جھرمٹ کو تلاش کرنا ان کا ایک مشغلہ تھا۔ ہاشم بھائی نے ہی پہلی بار انہیں یہ سات ستارے دکھائے تھے اور بتایا تھا کہ یہ "دب اکبر" اور انہیں ثریا بھی کہتے ہیں۔"

اسے بے اختیار ڈیڈ شدت سے یاد آئے وہ انہیں یہاں کی مٹی کے حوالے کر کے واپس جا رہا تھا۔ وہاں اب ڈیڈ نہیں ہوں گے ان کے کمرے میں ان کا بیڈ خالی ہوگا۔ اب وہ انہیں کبھی نہیں دیکھ سکے گا کبھی ان کی آواز نہیں سن سکے گا۔ اس کا دل بھر آیا اور

آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر گئیں تو وہ وہاں ہی بڑے تخت پر بیٹھ گیا آنسو آنکھوں کی زمین سے نکل کر رخساروں پر پھسل آئے تھے۔ رو رہا تھا۔ وہ ڈیڈ کو یاد کر کے رو رہا تھا۔

ماہی ہاشم ملک کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تو نظر تخت پر بیٹھے عثمان پر پڑی تو اپنے کمرے میں جانے کے بجائے تخت کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

''عثمان بھائی......!''

اس نے چونک کر سر اٹھایا اور ہاتھوں کی پشت سے چہرا پونچھا۔

''چچا جان یاد آ رہے ہیں۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اپنے پیاروں کو بھولنا آسان نہیں ہوتا۔ جانے والے اپنی یادیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں اور پیچھے رہ جانے والے ان کے پیارے عمر کی آخری سانس تک انہیں نہیں بھلا پاتے۔ میں بہت چھوٹی تھی جب میری اماں دنیا سے چلی گئیں۔ وہ مجھے بہت زیادہ یاد بھی نہیں ہیں نہ ان کی باتیں لیکن پھر بھی کبھی جب مجھے ان کا خیال آتا ہے تو میں راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جاتی ہوں۔ رونے لگتی ہوں۔''

وہ ہولے ہولے بول رہی تھی اور وہ حیران سا سن رہا تھا۔ اس کی زبان سے نکلے لفظ جیسے دل پر مرہم رکھ رہے تھے۔

''نیک اولاد صدقہ جاریہ ہوتی ہے آپ بھی اپنے ڈیڈ کے لیے صدقہ جاریہ بننا۔''

''تم بھی میرے ڈیڈ کے لیے دعا کرتی رہنا ماہی، ان کی مغفرت کے لیے۔ ان کے بلند درجات کے لیے۔''

اس نے نظریں اٹھائیں اور مبہوت سا ہو گیا وہ چاندنی میں نہائی کھڑی تھی۔ کتنے ہی لمحے وہ یونہی سر اٹھائے اسے دیکھتا رہا اس نے اپنی آج تک کی زندگی میں ماہی جیسی کوئی لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے اسکول کالج اور یونی ورسٹی میں اس کے ساتھ پڑھنے والی کئی لڑکیاں بے حد خوب صورت تھیں۔ لیکن ماہی جیسی تو کوئی نہیں تھی۔ وہ بے اختیار جذباتی ہوا۔

''ماہی......!''

وہ کہنا چاہتا تھا۔ ماہی میں تم سے بہت محبت کرنے لگا ہوں تم میرا انتظار کرنا۔ میں جلد آؤں گا تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا بنانے۔ لیکن اس نے خود کو روک کر بات بدل دی۔

''یہ تمہارا نک نیم ہے نا...... کتنی عجیب بات ہے میں نے کبھی تمہارا اصلی نام پوچھا ہی نہیں۔''

''میرا نام ماہ درخشاں ہے۔'' وہ مدھم سا مسکرائی۔

''اور یہ نام بڑی اماں نے رکھا تھا اور اس کا مطلب ہے چمکتا ہوا چاند۔''

''اور بڑی اماں نے تمہارا نام بالکل صحیح رکھا تھا ماہ درخشاں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

تم چمکتا ہوا چاند ہی تو ہو۔ اس کی نظروں نے اس کے چہرے کو اپنے حصار میں لیا۔ وہ اس کی نظروں کی تپش سے گھبرا گئی۔ پلکیں جھک گئیں اور گھنی پلکوں کے سائے رخساروں پر لرزنے لگے۔ اس کا جی چاہا وہ کہے ماہی پلکیں مت جھکاؤ مجھے ان سیاہ جھیلوں میں اپنا عکس دیکھنے دو۔ اور وہ گھبرائی گھبرائی سی کہہ رہی تھی۔

''آپ کو صبح جلدی جاگنا ہے۔ عبدالرحمٰن سات بجے تک گاڑی لے کر آ جائے گا۔ اب جا کے سو جائیں اور میں تو کبھی اتنی دیر تک نہیں جاگی بس آج......''

اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں اور پھر فوراً جھکا لیں۔

''مجھے یاد کرو گی ماہی؟'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ برآمدے کی دیوار سے ٹیک لگائے اس کی گھبراہٹ اور جھجک کو اس کی اٹھتی گرتی پلکوں کو بہت اشتیاق سے دیکھ رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے رابرٹ

برونگ کی نظم کا پہلا بند آ رہا تھا۔

تیری آنکھیں سیاہ جھیلیں ہیں
جہاں چاند ہمیشہ چمکتا رہتا ہے
اس کی سفید شعلہ ریز کرنیں
لہروں کو چھیڑتی ہیں
تو موسیقی کی دلکش آواز پیدا ہوتی ہے۔

گویا خوب صورت انگلیاں رباب کے تاروں کو چھیڑ رہی ہوں۔

ہاں تیری آنکھیں سیاہ جھیلیں ہیں
جس میں چاند اس وقت چمک رہا ہے
معلوم ہوتا ہے زمین پر ایک روشن ستارا گر پڑا ہے۔

ہاں تیری آنکھیں سیاہ جھیلیں ہیں
بیش بہا خزانوں اور سونے، جواہرات کی مالک
تیری آنکھیں سیاہ جھیلیں ہیں

☆☆☆

''تو اتنے دن تم وہاں اسی لیے ٹھہرے رہے۔ اس بڈھے نے تمہیں پھانس لیا۔ اپنی اس لے پالک بیٹی کو چارہ بنا کر تمہارے سامنے پھینکا..... اور تم احمق لڑکے تم نے اس چارے کو نگل لیا۔''

سلمٰی بیگم اس کی پوری بات سنے بغیر ہی چلا اٹھی تھیں۔

وہ لمحہ بھر کے لیے بالکل ساکت سا ہو کر انہیں دیکھتا رہا۔ جیسے اسے ان سے اس طرح کی کسی بات کی توقع نہ ہو۔

''تم ہمیشہ سے ایسے ہی ہو بے وقوف، جس نے جو کہا تم.....''

''مام پلیز.....!'' اس نے ذرا سا ہاتھ بلند کر کے انہیں مزید کچھ کہنے سے روکا اور اپنے ڈیڈ کی طرح نہایت تحمل سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

''ایسا کچھ نہیں ہے مام! میں جب یہاں سے ڈیڈ کو لے کر گیا تھا تو یہ سوچ کر گیا تھا کہ میں کچھ دن تایا جان کے پاس ٹھہروں گا۔ انہوں نے اپنا بھائی کھویا تھا۔ وہ بھائی جس سے بچھڑے انہیں آٹھ برس ہو گئے تھے۔''

''چلو مان لیا تم یہاں سے پروگرام بنا کر گئے تھے لیکن تمہارے اس ہوشیار تایا اور تائی نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اس لڑکی کو تمہارے پیچھے لگا دیا کہ اپنی ادائیں دکھا کر لڑکے کو پھانس لو۔''

''مام!'' اس نے بمشکل اپنی ناگواری کو چھپایا۔

''وہ ایسے لوگ نہیں ہیں اور نہ ہی ماہی ایسی لڑکی ہے وہ تو بے حد سادہ اور معصوم سی ہے۔''

''یہی تو ادائیں ہوتی ہیں مائی ڈیئر سن! سادہ اور معصوم بن کر پھانسنا۔'' وہ تمسخر سے ہنسی تھیں۔

''مام! میں نے آپ کو ڈیڈ کی خواہش بتائی ہے۔''

''تمہارے ڈیڈ کی خواہش۔'' وہ ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسیں۔ ''ایک خواہش تو تم نے لاکھوں خرچ کر کے پوری کر دی، اب مزید خواہش بھی ایک بار ہی بتا دو تا کہ مجھے بار بار شاک نہ لگے۔''

اور لمحہ بھر کے لیے اس کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ کاش یہ عورت میری ماں نہ ہوتی دوسرے ہی لمحے اس نے سر جھٹک کر سلمٰی بیگم کی طرف دیکھا جو ہونٹوں پر تمسخر بھری مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔

''ہاں ہاں بولو..... قبر وطن پاکستان میں دفن ہونے کی خواہش نمبر ٹو۔ تم نہاد بیٹی ہے شادی کی خواہش نمبر تھری۔''

''مام پلیز!'' وہ بے زار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''میں نے پہلی آپ کو ڈیڈ کی خواہش بتائی ہے۔ اور میں چاہتا ہوں آپ تایا جان سے بات کریں میرے رشتے کی جو روایتی طریقہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی میرے لیے تایا جان سے ماہی کا رشتہ مانگیں۔ کیوں کہ میں بہر حال ڈیڈ کی خواہش پوری کروں گا۔''

''ارے واہ.....!'' سلمٰی بیگم نے تالی بجائی۔

''ڈیڈ کی خواہش، وہ جو مر چکا ہے اس کی خواہش تمہارے لیے زیادہ اہم ہے اور جو زندہ ہیں

ان کی تمہیں پروا نہیں ہے۔ میں ماں ہوں تمہاری، کیا میرا حق نہیں ہے تم پر لیکن تمہیں تو نہ میری پروا ہے نہ خیال۔"

انہوں نے آواز میں رقت پیدا کرلی۔

"مام! مجھے آپ کی پروا ہے۔"

اس نے یک دم بیٹھتے ہوئے سلمٰی کے ہاتھ تھام لیے۔ "ڈیڈی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں ہمیشہ آپ کا خیال رکھوں اور میں نے ڈیڈ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کا خیال رکھوں گا۔"

"تو میرا دل دکھا کر تم اپنے ڈیڈ سے کیا وعدہ نبھا رہے ہو۔" سلمٰی نے شکایتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"میں آپ کا دل نہیں دکھا رہا مام! مجھے کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہے نا تو پھر اس لڑکی سے کیوں نہ کروں جسے ڈیڈ نے میرے لیے چنا۔"

اس نے ہولے سے ان کا ہاتھ دبایا جیسے اپنی محبت کا یقین دلایا ہو۔

"اور وہ اس لڑکی کا کیا ہوگا جسے میں نے تمہارے لیے چن رکھا ہے اور جس نے تمہارے حوالے سے کتنے خواب دیکھ رکھے ہوں گے۔" سلمٰی نے آواز میں مزید رقت پیدا کرلی تھی۔

"کون؟"

اس کی سوالیہ نظریں سلمٰی بیگم کی طرف اٹھیں۔

"سونی..... جب تم اسکول میں تھے تو تب ہی میں نے آپا سے بات کرلی تھی۔"

"سونیا... اوہ نو... ہرگز نہیں۔ میں اگر ماہی سے شادی نہ بھی کروں تو بھی سونی..... نہیں... ہرگز نہیں۔" اس نے سلمٰی کے ہاتھ چھوڑ دیے تھے۔

"کیوں کیا برائی ہے سونی میں؟" سلمٰی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"نہیں کچھ نہیں..... مگر یہ میری زندگی ہے اور مجھے کس کے ساتھ زندگی گزارنی ہے اور میرے خیال میں مجھے اس کا فیصلہ کرنے کا حق ہے۔"

سونیا اس کے ساتھ ہی اسکول میں تھی اور وہ اس کی عادتوں کی

تھا۔ ہر ہفتے وہ اپنا بوائے فرینڈ بدل لیتی تھی۔

"آپا کی کتنی خواہش تھی کہ سونی کی شادی اپنے جیٹھ کے بیٹے سے کرلے لیکن سونی نے اپنی پسند سے شادی کرلی اور اب وہ کتنا خوش تھیں کہ سونی تو خاندان میں جائے گی۔ کتنی دکھی ہوں گی، وہ عثمان! اور تم نہیں جانتے آپا کے کتنے احسان ہیں مجھ پر۔"

وہ ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں رگڑنے لگیں۔

یہ ان کا طریقہ تھا بلیک میل کرنے کا لیکن وہ نظر انداز کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔ سلمٰی بیگم اب دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سوں سوں کررہی تھی۔

اس نے ایک نظر سلمٰی کو دیکھا اور ڈیڈ کے کمرے کی طرف بڑھا وہ جب سے آیا تھا۔ ڈیڈ کے کمرے میں ہی سو رہا تھا۔ اسے وہاں ڈیڈ کی خوشبو آتی تھی۔ اسے لگتا جیسے ڈیڈ وہاں اس کے آس پاس ہی کہیں ہیں۔ کاش وہ اتنی جلدی نہ جاتے۔ کاش وہ ان کے ساتھ بہت سارا وقت گزار سکتا۔ احساس زیاں دل کو اذیت دیتا۔ ڈیڈ نہیں تھے اور وقت پلٹ نہیں سکتا تھا۔ بس اب تو صرف یادیں تھیں۔ پچھتاوے تھے اور۔

"سنو..... سنو عثمان! تمہیں ہر صورت سونی سے ہی شادی کرنی ہے۔"

عثمان نے دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے رکھے مڑ کر دیکھا۔ سلمٰی اب چہرے سے ہاتھ ہٹائے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان کی نظروں میں مان تھا یقین تھا جیسے وہ جانتی ہوں کہ عثمان ان کی بات کو رد نہیں کرسکے گا۔ کیونکہ عثمان نے کبھی ان کی کوئی بات رد نہیں کی تھی۔ سوائے قاسم ملک کی ڈیڈ باڈی کو پاکستان نہ لے جانے کی بات۔ وہ بچپن سے ہی بہت فرماں بردار قسم کا بچہ تھا اور وہ اپنی دوستوں سے بڑے فخر سے کہا کرتی تھیں۔

"میرا بیٹا اس ملک میں رہ کر اٹھارہ سال کی عمر میں بھی میری ہر بات مانتا ہے۔"

"سوری مام!" اس نے سلمٰی سے نظریں چرائیں۔ "میں سونیا سے شادی نہیں کرسکتا۔"

''سونیا کی شادی تمہارے ساتھ ہی ہوگی۔اس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے نام کے ساتھ تمہارا نام سنا ہے۔''

اسے سلمیٰ کی بات پر حیرت ہوئی تھی کہ سونیا نے کبھی اسے لفٹ نہیں کروائی تھی۔

''میں سونی کا دل نہیں توڑ سکتی۔وہ بہت حساس ہے۔''آواز میں قدرے رقت پیدا ہوگئی تھی۔

''بے فکر رہیں مام!سونی کا دل نہیں ٹوٹے گا۔ میرا ابھی دو سال تک شادی کا کوئی ارادہ نہیں اور سونی اسی سال اپنے عرب بچی فرینڈ سے شادی کرنے والی ہے۔''

اسے اچانک ہی یاد آیا تھا کہ جب ڈیڈ ہاسپٹل میں تھے تو جیکب نے اسے بتایا تھا کہ سونیا کی آج کل مائیکل سے بہت دوستی ہے۔مائیکل سونیا کا کلاس فیلو تھا اور ساؤتھ افریقہ سے آیا تھا۔اس کا باپ عرب بچی تھا۔

''ویسے تمہاری کزن نے خوب ڈھونڈ کر امیر لڑکے بوائے فرینڈ بنائے ہیں۔سنا ہے جلد ہی دونوں شادی کرنے والے ہیں۔'' یہ جیکب کے ساتھ ہاسپٹل آنے والے فراز نے کہا تھا۔

''کیا.....کیا کہہ رہے ہو عثمان!تم دو سال تک شادی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے واقعی۔''

''انہوں نے جیسے اس کی پوری بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔وہ یہ سن کر ہی خوش ہوگئی تھیں کہ وہ دو سال تک شادی کا ارادہ نہیں رکھتا۔

''ہاں شاید دو سال سے بھی کچھ وقت زیادہ ہوجائے۔میں پہلے اسٹیبلشٹ ہونا چاہتا ہوں۔ابھی مجھے اپنی تعلیم مکمل کرنی ہے اور''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے پہلے اپنی تعلیم مکمل کرو۔ شادی کی جلدی بھی کیا ہے۔''

سلمیٰ بیگم خوش ہوگئی تھیں۔دو سال بہت ہیں۔ عثمان کو آہستہ آہستہ منالیں گی اور عثمان بھی کون سا ضدی قسم کا لڑکا تھا۔مان ہی جائے گا۔لیکن یہ عثمان کیا کیا کہہ رہا تھا کہ سونی کسی عرب بچی سے شادی کرنے والی ہے۔''

انہیں اچانک خیال آیا تھا۔

''بھلا کون.....ہوگا کوئی فرینڈ.....آپا اور سونی کو پتا تو ہے کہ میری کتنی خواہش ہے کہ عثمان اور سونی پھر بھی۔یہ عثمان بھی نرا بدھو ہے۔اب یہاں اس ملک میں یہ فرینڈ شپ وغیرہ تو چلتی رہتی ہے۔''

مدھم سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر نمودار ہوئی اور وہ مطمئن سا ہوکر،اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہوگئیں تو عثمان نے ایک نظر انہیں دیکھا اور کمرے میں چلا گیا۔سامنے ڈیڈ کا بیڈ خالی تھا۔ڈیڈ نہیں تھے اور اب ڈیڈ نے کبھی نہیں ہونا تھا۔اس کی آنکھوں میں نمی پھیلتی چلی گئی۔

وہ جب سے آیا تھا۔اس کے ساتھ ایسا ہی ہورہا تھا۔ڈیڈ کے کمرے میں آتے ہی دل موم ہوکر پگھلنے لگتا تھا۔فرسٹ فلور پر ماما اور ڈیڈ کا مشترکہ ماسٹر بیڈ روم تھا جبکہ گراؤنڈ فلور پر تین بیڈ روم تھے۔ایک اس کا،ایک ڈیڈ کا اور ایک گیسٹ روم تھا۔فرسٹ فلور پر بھی ماسٹر بیڈ روم کے علاوہ بھی دو بیڈ روم تھے لیکن ڈیڈ جب سے بیمار ہوئے تھے۔مستقل اسی کمرے میں رہ رہے تھے۔وہ ہولے ہولے چلتا ہوا ان کے بیڈ پر آکر بیٹھ گیا۔

کمرے میں ڈیڈ کے پرفیوم کی مانوس سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو اس نے بیڈ سائیڈ ٹیبل پر پڑے ان کے پرفیوم کی بوتل اٹھا کر ہلکا سا اسپرے کیا تھا۔اس مانوس سی خوشبو کے ساتھ ہی ڈیڈ کی وہ مدھم مدھم ٹھہری ٹھہری آواز اس کی سماعتوں میں زندہ ہوگئی۔وہ جیسے انہیں سن رہا تھا۔وہ ہولے ہولے ان کے تکیے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔وہ اب بھی جیسے اس تکیے پر ان کا لمس محسوس کرتا تھا۔

☆☆☆

اسے پاکستان سے آئے ایک ہفتہ ہوگیا تھا لیکن ابھی تک وہ اپنی اس کیفیت سے باہر نہیں آسکا تھا۔حالانکہ پاکستان میں وہ کچھ سنبھل گیا تھا۔ لیکن یہاں قدم قدم پر ان کی یادیں بکھری ہوئی تھیں

وہ خود کو سنبھال ہی نہیں پا رہا تھا۔ اس ایک ہفتے میں دو تین بار اس کی ہاشم ملک اور بڑی اماں سے بھی بات ہوئی تھی۔ ایک بار ماہی سے بھی۔ ماہی کی وہی معصومیت بھری باتیں۔ عبدالرحمٰن کی شکایتیں جو اس کی چیزیں شہر سے لانا بھول جاتا تھا اور شالی کے رشتے کی باتیں۔

"اتنے سارے رشتے آرہے ہیں شالی کے لیکن میں نے بتایا تھا نا آپ کو شالی کے اماں ابا کا خیال اس کی شادی اس کے کزن سے کرنے کا ہے۔"

"لیکن وہ تو اتنی چھوٹی سی ہے پھر بھی رشتے آرہے ہیں۔"

"ہاں تو یہاں گاؤں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

اس کا مخصوص لاپرواسا انداز۔

"پھر تو تمہارے بھی آتے ہوں گے۔" اس نے یوں ہی اسے چھیڑا تھا۔

"ہاں تو...... آتے رہتے ہیں لیکن بابا اور بڑی اماں کہہ دیتی ہیں کہ ابھی ماہی پڑھ رہی ہے۔ چھوٹی ہے۔ ابھی خیال نہیں ہے ہمارا۔" وہ ہنسی تھی۔

وہی جھرنوں کی آواز جیسی ہنسی۔ وہ مسحور سا ہو گیا تھا۔ تب ہی اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ماما سے بات کرے گا کہ وہ تایا جان اور تائی جان سے ماہی کے لیے اس کے رشتے کی بات کریں تاکہ وہ سب کو بتا سکیں کہ انہوں نے ماہی کی بات طے کردی ہے لیکن ماما تو اس کی بات سنتے ہی بھڑک اٹھی تھیں۔ خیر یہ اس کی زندگی تھی اور فیصلہ بھی اسے خود ہی کرنا تھا۔ وہ بہرحال اس کے ساتھ زبردستی نہیں کرسکتی تھیں۔ بہت ہوا تو وہ تھوڑا واویلا کریں گی لیکن ہوگا وہی جو وہ چاہے گا۔

اس نے تکیے سے ہاتھ ہٹا کر کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ کچھ ہفتوں بعد یا شاید کچھ مہینوں بعد یہ گھر فروخت ہوجائے گا اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ یہ گھر کبھی فروخت نہ کرتا۔ یہاں اس گھر میں قدم قدم پر ڈیڈ کی یادیں بکھری تھیں۔ جب ڈیڈ نے یہ گھر خریدا تھا تو وہ بارہ سال کا تھا۔ سلمٰی کو تب بھی اعتراض ہوا تھا۔ "یہ اتنا بڑا گھر لے کر کیا کرنا ہے۔"

"چھوٹے اور تنگ تنگ کمروں والے گھر میں میرا دم گھٹتا ہے۔"

تب ڈیڈ نے کہا تھا لیکن وہ انہیں مشکوک نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"کہیں تمہارا ارادہ اپنے بھائی اور اس کی فیملی کو تو یہاں بلوانے کا نہیں۔"

"وہ میری طرح بے وقوف نہیں ہیں کہ اپنی جنت چھوڑ کر یہاں آجائیں۔" ڈیڈ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"لیکن یہ بہت مہنگا ہے قاسم" سلمٰی کی اور بھی فکریں تھیں۔

"مجھ سے کوئی امید مت رکھنا کہ میں اپنی جیولری وغیرہ فروخت کردوں گی، بہتر ہے کہ نسبتاً چھوٹا گھر لے لو۔"

"بے فکر رہو میرے حصے کی زمین فروخت کرکے ہاشم بھائی نے رقم میرے اکاؤنٹ میں بھیج دی ہے۔"

ڈیڈ نے سلمٰی کو اطمینان دلایا تھا۔

"کتنی...... کتنی رقم بھجوائی ہے۔"

سلمٰی متجسس ہوئی تھیں اور وہ جیسے بند آنکھوں سے ماما اور ڈیڈ کو باتیں کرتا دیکھ رہا تھا۔ پھر اس گھر کو مکمل طور پر فرنشڈ کرنے میں ایک سال لگ گیا تھا۔ ان دنوں سلمٰی بے حد خوش تھیں۔ اپنی فرینڈز کو اپنا گھر دکھانے لاتیں اور فخر سے گردن اونچی کیے ایک ایک چیز دکھاتی تھیں اور اب یہ گھر فروخت ہوجائے گا۔

اس نے ایک آہ بھری۔ اسے لگا جیسے اس کے دل کو کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچا ہو۔ وہ جانتا تھا کم از کم ماما نے گھر کی فروخت کا صحیح فیصلہ کیا تھا۔ اتنے بڑے گھر کے اخراجات برداشت کرنا مشکل تھا۔ ماما کی تنخواہ بہت اچھی نہیں تھی۔ خود اس کے پاس کوئی نوکری نہیں تھی۔ ڈیڈ کی جاب بہت شاندار تھی اور تنخواہ بہت اچھی، ان کے لیے اس بڑے گھر کو مینج

کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ ساری تنخواہ سلمیٰ کے ہاتھ پر رکھ دیتے تھے اور بجلی، پانی، گیس، ٹیکس وغیرہ کے بل ادا کر کے بھی وہ تنخواہ میں سے کچھ نہ کچھ بچالیتی تھیں۔ یہ الگ بات تھی کہ اضافی اخراجات وہ ہمیشہ ڈیڈ کی بچت سے وصول کرتی تھیں اور خود بے دردی سے خرچ کرتی تھیں کہ بچت کی وہ قائل ہی نہ تھیں ان کا نظریہ تھا کھاؤ پیو اور عیش کرو۔

صبح سلمیٰ نے اسے دو پراپرٹی ڈیلرز کے کارڈ دیے تھے اور تاکید کی تھی کہ وہ کسی وقت فون کر کے ان کے ساتھ وقت طے کر کے انہیں بتادے کہ وہ کب اپنے کسٹمر کے ساتھ گھر دیکھنے آئے۔ سلمیٰ اس کے آنے سے پہلے ہی نہ صرف یہ کہ گھر کی فروخت کے لیے آن لائن اشتہار دے چکی تھیں بلکہ ایک دو پراپرٹی ڈیلرز سے بھی رابطہ کر چکی تھیں جنہوں نے اسے بتایا تھا کہ کچھ لوگ اس علاقے میں گھر لینے میں انٹرسٹڈ ہیں۔

اس نے صبح وہ وزیٹنگ کارڈ بے دلی سے بیڈ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیے تھے۔ اس نے بے حد بھاری دل کے ساتھ ڈیلر کو فون کرنے کے ارادے سے دراز کھولی لیکن وہ خالی تھا۔ کارڈ اس میں نہیں تھے۔

''تو کیا میں نے انہیں کہیں اور رکھ دیا تھا۔''

آج کل اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔

اس نے دوسری دراز کھولی۔ اس میں ڈیڈ کی چیزیں تھیں۔ ان کا ایک رومال، لیٹر پیڈ، قلم کچھ پاکستان سے آئے ہوئے ڈاک کے لفافے اور اسے یک دم یاد آیا کہ اس نے وہ کارڈ دوسری سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھے تھے تو لیٹر پیڈ دراز میں رکھتے ہوئے نیچے گرا۔ اس نے جھک کر لیٹر پیڈ اٹھایا تو اس میں سے ایک لفافہ نیچے گر پڑا۔ بے دھیانی سے اسے اٹھاتے ہوئے اس کی نظر اچانک ہی لفافے پر پڑی تھی جس پر ڈیڈ کی خوب صورت رائٹنگ میں لکھا تھا۔

جان سے عزیز عثمان کے لیے۔

میرے لیے..... ڈیڈ نے یہ خط میرے لیے لکھا

اس کے دل کی کیفیت عجیب سی ہوگئی جیسے وہاں اندر کہیں پانی کے چشمے پھوٹ پڑے ہوں۔ اس نے لرزتی انگلیوں سے لفافہ چاک کیا۔ اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ خط نکالا۔

''عثمان میرے بیٹے! جب تم یہ خط پڑھ رہے ہوگے تو میں تمہارے پاس نہیں ہوں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تمہاری مام میرے بعد جلد ہی اس گھر کو فروخت کر دیں گی۔ تو میرا کمرا خالی کرتے ہوئے یہ خط ضرور تمہاری نظر سے گزرے گا۔ میرے پیارے بیٹے! شاید میں نے تمہیں بہت بار بتایا ہو کہ میں یہاں اپنے ساتھ بہت سارے خوابوں کی پوٹلی باندھ کر لایا تھا۔ بہت سارے خوابوں کی تعبیر ملی اور کچھ خواب بے تعبیر بھی رہ گئے۔ میں تمہیں بس یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں یہاں بھی خوش نہ رہ سکا۔ میں اپنی مٹی، اپنی زمین، اپنے لوگوں کو نہ بھلا سکا اور واپس ان کے پاس جانے کو تڑپتا رہا۔

عثمان، میرے بیٹے تم اس کرب کا اندازہ نہیں کر سکتے جس سے میں ان بیتے سالوں میں گزرا۔ اس عالم کرب میں ایک خواہش بار بار دل میں پیدا ہوتی کہ تمہارا رشتہ اس زمین اس مٹی سے جڑ جائے جسے میں چھوڑ آیا تھا۔ اور ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ کیسے اور کس طرح کہ موت نے کینسر کے ہاتھ اپنا سندیسہ بھیج دیا اور سب مٹی میں مل گیا۔ میرا منصوبہ، میرا خیال، اب جس سفر پر جانا تھا وہ تو سفرِ آخرت تھا۔ اب کہاں۔''

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں اس نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے اور پھر سے خط پڑھنے لگا۔

''لیکن اس روز ہاشم بھائی سے بات کرتے ہوئے مجھے اچانک ہی ماہی کا خیال آیا۔ ماہی جو آٹھ سال پہلے تو دس سال کی بچی تھی اب اٹھارہ سال کی ہو چکی ہوگی۔ بھابھی جان اور ہاشم بھائی اکثر اس کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ شاید یہ میری خود غرضی تھی کہ میں نے چاہا کہ میرے بعد بھی تمہارا رشتہ میری مٹی

اور میرے اپنوں سے جڑا رہے اور میں بے اختیار ہاشم بھائی سے تمہارے لیے ماہی کا ہاتھ مانگ بیٹھا۔ شاید ان کا دل اس پر راضی نہ بھی ہو لیکن وہ اپنے چھوٹے لاڈلے مرتے ہوئے بھائی کی خواہش رد نہ کر سکے۔ انہوں نے ہمیشہ میرے لیے اپنی خواہشات کو قربان کیا اور میری خود غرضی تو دیکھو عثمان، کہ میں اپنی ایک خواہش کے لیے ایک اور ہجر ان کا مقدر بنا رہا تھا۔ انہوں نے تو میری خواہش کا مان رکھ لیا تھا لیکن پھر میں نے بھی سوچا کہ ان کو ایک خط بھی لکھ دوں۔ دراصل وہ خط تمہارے لیے تھا کہ تم جب مجھے وہاں لے کر جاؤ تو وہ خط پڑھ کر یقین کر سکو کہ ہاشم بھائی نے تم سے میری آخری خواہش کی جو بات کی ہے وہ حقیقت ہے۔

دراصل مجھے یہ وہم بھی ستانے لگا تھا کہ کہیں میں تمہارے اور ماہی کے ساتھ زیادتی تو نہیں کر رہا۔ جانتا تھا کہ تم میری خواہش کو رد نہیں کرو گے بھلے تمہیں خود پر جبر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ تو آج اس وقت بار بار یہ خیال آرہا ہے کہ یہ سراسر میری خود غرضی ہے۔ تم یہاں پیدا ہوئے۔ یہاں ہی پلے بڑھے۔ تمہیں بھلا کھیتوں سے، پیپل اور دھریک کے درختوں سے کیسے محبت ہو سکتی ہے اور اس زمین سے جہاں صرف چند دنوں کے لیے تم گئے تھے۔

نہ جانے کس جذبے سے مغلوب ہو کر میں ہاشم بھائی کے سامنے دامن دراز کر بیٹھا اور تم سے پوچھا بھی نہیں کیا خبر تم کسی کو پسند کرتے ہو۔ کوئی تمہارے دل کو بھا گئی ہو۔ تو تم خود کو میری خواہش پورا کرنے کے لیے مجبور مت کرنا۔ تم آزاد ہو جہاں تمہارا دل چاہے اور جسے ہمسفر بنانا چاہو بناؤ۔

رات کے اس پہر جب تم سو رہے ہو۔ میں تمہیں جگا کر یہ سب نہیں کہہ سکتا کہ سارا دن ڈاکٹروں کے پاس بھاگ بھاگ کر تم تھکے ہارے سوئے ہو اور نہ ہی اس وقت ہاشم بھائی سے بات ہو سکتی ہے۔ پہلے سوچا ہاشم بھائی کو خط لکھ دوں یا ان سے کل فون پر بات کر کے اپنی خود غرضی پر معذرت کرلوں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا ہے کہ میرا وقت پورا ہو گیا ہے اور شاید میں کل کا سورج نہ دیکھ سکوں۔ اگر مجھے کچھ مہلت مل گئی تو میں ہاشم بھائی سے بات کرلوں گا اور تم جان ہی نہ سکو گے کہ میں نے کوئی خواہش کی تھی اور یہ خط پھاڑ دوں گا لیکن اگر ایسا نہ ہو سکا تو ایک بار پھر میں کہہ رہا ہوں عثمان، کہ تمہیں اجازت ہے کہ تم اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرو۔

اور تم یہ نہ سمجھنا کہ اگر میں ہوتا تو تم سے ناراض ہوتا نہیں میں تم سے بہت خوش ہوں میرے بچے!"

زندگی نے انہیں مہلت نہ دی تھی۔ رات کے آخری پہر ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی ایک پھر اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ہاتھوں میں منہ چھپائے وہ کچھ دیر تک گھٹ گھٹ کر روتا رہا اور پھر خط واپس لفافے میں ڈال کر اس نے دراز میں رکھ دیا۔

دل ہی دل میں ان سے مخاطب ہوا۔

آپ کو کیا پتا ڈیڈ! آپ کی خواہش آپ کے عثمان کے دل کی اولین خواہش بن چکی ہے۔ وہ ماہی جسے آپ نے نو دس سال کی عمر میں دیکھا تھا۔ وہ ماہی اب ایک خوب صورت دوشیزہ میں ڈھل چکی ہے اور اس کی آنکھیں سیاہ جھیلیں ہیں اور آپ کا عثمان ان سیاہ پانیوں والی جھیلوں میں ڈوب گیا ہے۔ مجھے آپ کا فیصلہ دل و جان سے منظور ہے۔ تھینک یو ڈیڈ، کہ آپ نے میرے لیے ماہی کو منتخب کیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ماہی کا سراپا لہرایا تو وہ کھو سا گیا اسے لگا جیسے اس کے چار سو ان دو سیاہ جھیلوں والی آنکھوں کا پہرہ ہے اور ان آنکھوں کی جگمگاہٹ اس کے پورے وجود کو روشن کر رہی ہو۔

اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بھول گیا کہ وہ دراز میں کیا تلاش کر رہا تھا کچھ دیر وہ یونہی بیٹھا رہا پھر اسے چائے کی طلب ہوئی تو وہ اٹھا۔ سلمٰی ابھی تک لاؤنج میں بیٹھی اور بے حد خوش گوار موڈ کے ساتھ اپنے سیل فون پر کسی سے باتیں کر رہی۔ باتیں کرتے کرتے انہوں نے سر اٹھا کر اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑے عثمان کی طرف دیکھا۔

"مجھے آج اپنی فرینڈ کے ساتھ باہر ڈنر کرنا ہے۔ تم چاہو تو باہر سے کچھ آرڈر کر لینا۔"

دراصل وہ ماریہ نے ڈنر کا پروگرام بنایا ہے تاکہ میرا دل بہل جائے اور میں اس غم کی کیفیت سے باہر نکل سکوں۔ اسے خاموشی سے اپنی طرف تکتے دیکھ کر سلمیٰ بیگم نے وضاحت کی "تو کیا ماما غم کی کیفیت میں ہیں۔"

دل ہی دل میں سوچتے ہوئے وہ اثبات میں سر ہلا کر واپس کمرے میں آ گیا۔ وہ پھر بھول گیا تھا کہ وہ باہر کیوں گیا تھا۔ جب سے وہ واپس آیا تھا سلمیٰ اگرچہ گھر سے باہر نہیں گئی تھیں لیکن اسے کبھی نہیں لگا تھا کہ وہ غم میں ہیں۔ وہ اس پورے ہفتے میں ماما کو فون پر مسلسل باتیں کرتے اور قہقہے لگاتے دیکھتا رہا تھا ہاں جب ہاسپٹل میں ڈاکٹر نے ان کی موت کے متعلق بتایا تھا تب اس نے ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ اب واپس آ کر جو اس نے دیکھا ان میں غم یا دکھ کی کوئی کیفیت نظر نہیں آئی تھی وہ واپس بیڈ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔

اسے یاد آیا کہ ابھی جب وہ ڈیڈ کو لے کر گیا تھا تو ایک روز بڑی اماں کچن میں کام کرنے والی لڑکی سے پوچھ رہی تھیں کہ خورشیداں کی عدت کب ختم ہو رہی ہے۔ اور پھر اسے وہاں کھڑا دیکھ کر بتایا کہ "خورشیداں عدت میں ہے اس لیے اس کی بہو آ رہی ہے آج کل۔ تمہیں یاد ہے نا خورشیداں جب پہلے تم آئے تھے تو وہ ہی ادھر آئی تھی کام کے لیے۔" اسے کچھ اتنا زیادہ یاد نہیں تھا پھر بھی اس نے سر ہلا دیا تھا۔

"بے چاری کا خاوند چند ماہ پہلے فوت ہو گیا ہے۔ ایک دو روز میں عدت ختم ہو گی تو آ جائے گی۔ تمہیں بہت یاد کرتی تھی اور قاسم کو بھی، چھوٹا سا تھا جب اس گھر میں آئی تھی۔"

اور تب اس کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا تھا کہ عدت کیا ہوتی ہے۔ اسلام کے متعلق اس کی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں اور اس نے سوچا تھا کہ وہ واپس جا کر اسلام کے حوالے سے اچھی کتب کا مطالعہ کرے گا تاکہ اچھے دین کے متعلق جان سکے۔

ماہی نے اسے قرآن کی تفسیر اور احادیث کی کتابیں پڑھنے کا بھی مشورہ دیا تھا اسے اردو لکھنا پڑھنا بھی سیکھنا تھا کہ ماہی کو اردو سے بہت محبت تھی ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا وہ کبھی ڈیڈ کے متعلق سوچنے لگتا کبھی بابا، بڑی اماں اور ماہی کے متعلق، کبھی اپنی جاب کے متعلق واپس آنے کے دو دن بعد ہی اس نے مختلف جگہ جاب کے لیے اپلائی کر دیا تھا۔

ماما کے جانے تک وہ یونہی آنکھیں موندے لیٹا رہا جب دروازہ بند ہونے کی آواز آئی تو وہ اٹھا۔ سلمیٰ بیگم ان کے پاس اپنی چابی تھی۔ اب وہ واپس جب بھی آتیں لاک کھول کر اندر آ جاتیں۔

ابھی ڈیڈ کو دنیا سے رخصت ہوئے چار ماہ دس دن نہیں ہوئے تھے اور ماما گھر سے باہر جا رہی تھیں۔ اور کیا خبر جب وہ پاکستان میں تھا تب بھی وہ باہر جاتی رہی ہوں۔

اس نے اپنے لیے کافی اور سینڈوچ بنائے اور ماما کے متعلق سوچتا ہوا لاؤنج میں آ گیا پھر کافی پیتے اور سینڈوچ کھاتے ہوئے اسے کشادہ صحن والا وہ بڑا گھر یاد آ گیا جس کے صحن کے ایک کونے میں تندوری بنی ہوئی تھی اور مغرب کے بعد خورشیداں تندور میں آگ جلا دیتی تھی اور جب تندور تپ کر تیار ہو جاتا تو ماسی خورشیداں تندور میں روٹیاں لگاتی اور کچھ دیر بعد ہی سارے گھر میں روٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیل جاتی تھی۔

پہلی بار جب وہ ڈیڈ کے ساتھ گیا تھا تو اس نے صحن میں ماسی خورشیداں کے پاس کھڑے ہو کر بڑی دلچسپی سے روٹیاں تندور میں لگاتے اور نکالتے دیکھا تھا۔ اور پہلی بار ہی اسے پتا چلا تھا کہ روٹی کی خوشبو بھی ہوتی ہے اتنی سوندھی سوندھی سی۔

ماسی خورشیداں گرم گرم روٹیاں تندور سے نکال کر چنگیر میں رکھتی جاتی اور ماہی بڑے کمرے میں چٹائی پر دستر خوان بچھا کر کھانا لگا دیتی۔ یوں اس ہی

بڑے کمرے میں ایک کونے میں آٹھ کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل بھی تھی شاید شہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے۔ لیکن اسے چٹائی پر بیٹھ کر کھانا اچھا لگتا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی وہ ابھی تک خود کو اس گھر کے ہجر سے باہر نہ نکال سکتا تھا۔ اس گھر میں زندگی کتنی سادا اور خوب صورت تھی۔

یکا یک اس کا جی چاہنے لگا کہ وہ یہاں سے چلا جائے اور وہاں جا کر رہے، ڈیڈ کے گاؤں میں جہاں وہ جا کر نہیں رہ سکتے تھے۔ اپنی شدید خواہش کے باوجود۔ وہاں ماہی کے سنگ، بابا اور بڑی اماں کے سائے میں زندگی کتنی خوب صورت ہوگی۔ وہ بابا کی طرح جب اپنے کام سے واپس آئے گا تو ماہی اس کا انتظار کرتی ہوگی کبھی چھت پر جا کر شہر سے آتی سڑک کو دیکھے گی کبھی باہر کے دروازے کو کھول کر باہر گلی میں جھانکے گی، اس نے ماہی کو بابا کا ایسے ہی انتظار کرتے دیکھا تھا جب بھی جو وہ لیٹ ہو جاتے تھے۔ شام کو چھت پر سے سورج کے سرخ گولے کو درختوں کے پیچھے ماہی کے ساتھ کھڑے ہو کر۔ غروب ہوتے دیکھنا۔

کبھی کبھی گرمیوں کی حبس بھری راتوں میں صحن میں چارپائیاں بچھا کر سونا اور آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھتے ہوئے سات ستاروں کے جھرمٹ کو تلاش کرنا۔

اس خوب صورت جھیل جیسی آنکھوں والی لڑکی نے اسے اسیر کر لیا تھا اور وہ اسیر ہو چکا تھا اس نے دل ہی دل میں اعتراف کیا۔

لیکن اس وقت صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے خواب دیکھتے ہوئے نہیں جانتا تھا کہ ہر خواب تعبیر نہیں پاتا۔

☆☆☆

اگلے بہت سارے دن بے حد مصروفیت کے تھے۔ پرانے گھر کو فروخت کرنا اور نیا گھر لینا اتنا آسان نہ تھا کئی لوگ ان کا گھر دیکھنے آئے خود انہوں نے بھی کئی دیکھے، اپنی پسند کا گھر لینے اور موزوں

قیمت پر اپنا گھر فروخت کرنے میں کافی وقت لگ گیا۔ پھر جاب کی مصروفیات اور ساتھ میں پڑھائی۔ لیکن ان مصروف شب و روز میں بھی ماہی کا خیال اس کے دل کی دنیا کو روشن کیے رکھتا تھا۔

ہفتے میں ایک دو بار ہاشم ملک اور بڑی اماں سے بھی بات ہو جاتی تھی۔ کبھی وہ فون کر لیتا کبھی ان کا فون آ جاتا۔ کبھی دس پندرہ دن بعد ماہی سے بھی بات ہو جاتی اور وہ روز اس کے لیے ہر روز سے زیادہ روشن اور چمکیلا ہوتا۔ دو بیڈ روم کے نئے گھر میں شروع شروع اس کا دل بہت گھبرایا۔ اسے اپنا وہ شان دار گھر یاد آتا تو اداس ہو جاتا لیکن سلمٰی بیگم بے حد خوش تھیں کہ جتنی رقم میں گھر فروخت ہوا تھا اس سے آدھی سے بھی کم قیمت میں یہ چھوٹا گھر خریدا گیا تھا۔ سلمٰی بیگم وہ رقم کہاں اور کیسے خرچ کرنے والی تھیں اس نے اس پر غور نہیں کیا تھا اور بچ جانے والی رقم ان کے اکاؤنٹ میں جمع کروا دی تھی۔

”تم چاہو تو کچھ رقم لے لو جب تک تمہیں جاب نہیں ملتی وہ خرچ کر لینا۔“

سلمٰی نے جیسے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اس نے کچھ بھی لینے سے انکار کر دیا تھا۔ اپنی گاڑی کی فروخت سے اسے جو رقم ملی تھی وہ اس کے ان بے کار دنوں کے لیے کافی تھی۔ ڈیڈ کی گاڑی اس نے اپنے استعمال کے لیے رکھ لی تھی اور سلمٰی نے کوئی اعتراض بھی نہیں کیا تھا۔

جلد ہی اسے جاب بھی مل گئی گو اس کی مرضی اور اہلیت کے مطابق نہیں تھی لیکن ٹائمنگ کے لحاظ سے اس کے لیے، بہت مناسب تھی کہ وہ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھ سکتا تھا، جیسا کہ ڈیڈ کی خواہش تھی کہ وہ ماسٹر ضرور کرے۔

وہ اس نئے گھر میں بہت سارے دن بہت اداس اور بے چین رہا۔ وہ گھر جہاں ڈیڈ کی یادیں تھیں وہاں اسے اتنی تنہائی محسوس نہ ہوئی تھی۔ اسے لگتا تھا جیسے ڈیڈ اس کے آس پاس ہی کہیں ہوں اور یہاں وہ خود کو اکیلا اور تنہا محسوس کرتا جیسے کسی نے اس سے ڈیڈ کی یادیں چھین لی ہوں۔

”یادیں۔ چیزوں اور جگہوں سے مشروط نہیں ہوتیں عثمان، وہ تو دل میں ہوتی ہیں تمہارے ڈیڈ کی یادیں بھی ہمیشہ تمہارے دل میں رہیں گی۔“

ایک روز بڑی اماں نے سمجھایا تھا۔

”ہاں یادیں تو دل میں ہوتی ہیں۔ میں جہاں بھی جاتا ہوں یہ یادیں میرے ساتھ ہوتی ہیں۔“

اس نے تائید کی تھی اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ اس کا دل اس نئے گھر میں لگ ہی گیا لیکن زندگی بے حد مصروف ہوئی تھی۔ اپنی پڑھائی اور جاب کے علاوہ گھر کی ذمہ داریاں بھی سلمٰی بیگم نے اس کے کندھوں پر ڈال دی تھیں، گیس، بجلی، پانی کے بل اور ٹیکس جمع کروانا۔ گھر کے لیے گروسری وغیرہ کی خریداری اب سب وہ ہی کرتا تھا۔

سلمٰی ہفتے میں صرف تین دن جاب پر جاتیں اور باقی کے دن اپنی فرینڈز کے ساتھ گھومتی پھرتیں، لنچ اور ڈنر کرتیں، فلم دیکھتیں اور عثمان جب تھکا ہارا گھر آتا تو اپنے لیے خود ہی کچھ نہ کچھ بنا لیتا۔ بے حد مصروف دن گزار کر جب وہ رات کو بستر پر لیٹتا تو خود کو یہاں سے دور کشادہ صحن والے بڑے سے گھر میں پاتا جہاں بابا تھے بے حد شفیق اور بڑی اماں تھیں محبت کا پیکر اور سیاہ جھیل جیسی آنکھوں والی ماہی تھی۔

اس کی زندگی کے افق پر چمکنے والا ماہ درخشاں، جو مسکراتی تو اس کی آنکھوں میں ہزاروں قمقمے جل اٹھتے تھے اور جس کی آواز میں پہاڑوں سے بہہ کر آنے والی چشموں کا ترنم تھا۔ وہ ان سب کو سوچتے سوچتے پرسکون نیند سو جاتا تھا۔ سلمٰی اپنی زندگی میں بہت خوش اور مطمئن تھیں۔ وہی برانڈڈ قیمتی لباس میچنگ جوتے، بیگ، فرینڈز کے ساتھ لنچ، ڈنر، گھومنا پھرنا، سیر سپاٹے،

ان کی زندگی میں ڈیڈ کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا اور ایک وہ تھا جسے لگتا تھا کہ ایک ڈیڈ کے نہ ہونے سے اس کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے اور یہ خلا کبھی بھرنے والا نہیں۔

ماما کو ہنستے اور قہقہے لگاتے دیکھ کر وہ حیران ہوتا کہ ماما اپنے شریک زندگی کو کھو کر کیسے ہنس لیتی ہیں۔ کیا انہیں ڈیڈ کے ساتھ گزرا ہوا وقت یاد نہیں آتا۔ تیئس سالہ سفر کا کوئی ایک لمحہ بھی یاد آ کر انہیں اداس نہیں کرتا۔ کوئی ایک لمحہ......

☆☆☆

اس روز جب وہ گھر لوٹا تو خلاف معمول وہ لاؤنج میں اداس بیٹھی تھیں۔

''کیا ہوا مام؟'' وہ انہیں سلام کر کے اپنے کمرے میں جاتے جاتے رک گیا۔ ''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''سونی شادی کر رہی ہے کسی مائیکل نامی شخص سے۔'' اس نے مام کو اس سے پہلے اتنا سنجیدہ نہیں دیکھا۔

''تو...... یہ تو خوشی کی بات ہے۔''

''کیا مطلب...... کیا تم نہیں جانتے میں نے ہمیشہ سے سوچ رکھا تھا کہ تم اور سونیا۔'' انہوں نے ایک نظر اس پر ڈال کر ہاتھوں کی پشت سے اپنے نامعلوم آنسو پونچھے۔

''میں نے تو پہلے ہی آپ کو بتا دیا تھا کہ وہ جلد ہی شادی کر لے گی۔''

''لیکن آپا اور بھائی صاحب بہت پریشان ہیں اس شادی کے حق میں نہیں ہیں لیکن سونیا ان کی بالکل نہیں سن رہی۔''

''کیوں؟'' اس نے سلمیٰ کو پھر آنکھیں رگڑتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔

''ان کی باقی اولادوں نے بھی تو پسند کی شادیاں کی ہیں پھر سونی کے لیے کیوں پریشان ہیں۔''

''اور جیسے تمہیں تو علم ہی نہیں کہ وہ لڑکا جس سے سونی شادی کرنے والی ہے۔ وہ غیر مسلم ہے۔'' سلمیٰ نے ہاتھ ہلاتے ہوئے طنزیہ انداز میں اسے دیکھا۔

''لیکن وہ کہتی ہے کہ وہ اسلام قبول کر لے گا۔ شادی سے پہلے سو نام کا ہی مسلمان ہو گا۔

اور اسے ہنسی آ گئی تھی سونیا اور ماما کی فیملی بھی تو بس نام کے ہی مسلمان تھے۔ ہاں فرق یہ تھا کہ وہ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور مائیکل کرسچن گھرانے میں۔

''آپا اور بھائی صاحب تو بہت ناراض ہیں۔''

وہاں آپ کے انڈیا میں بھی تو ایسی شادیاں ہوتی رہتی ہیں ہندو لڑکا مسلمان لڑکی، مسلمان لڑکا ہندو لڑکی۔''

''یہ جائز نہیں بلکہ سرے سے یہ شادی ہوتی ہی نہیں ہے۔ لیکن وہاں تو جیسے آج کل لوگوں کو علم ہی نہیں۔ پروا ہی نہیں رہی مذہب کی، چھوٹی آپا کے دیور نے ایک ہندو لڑکی سے شادی کر لی تو ان کے سسر نے اسے گھر سے نکال دیا۔''

اسے حیرت ہوئی کہ ماما کو کم از کم مذہب کے متعلق اتنا علم تو تھا ہی ''خیر چھوڑو۔'' سلمیٰ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''تمہیں ٹونی یاد ہے۔ وحید بھائی کی بیٹی۔ وہی میرے ماموں جان کے بیٹے جن کا وہ بڑا سا بنگلہ ہے بمبئی میں، میں تمہیں لے کر تو گئی تھی ان کے گھر میں سوچ رہی ہوں ٹونی کو تمہارے لیے مانگ لوں۔ وحید بھائی کا اتنا بڑا بزنس ہے لیدر کا۔ اکثر جب یہاں آتے ہیں تو آپا کے ہاں ضرور آتے ہیں۔ دو ہی بچے ہیں ان کے ٹونی اور پرویز سب کچھ ان کا ہی ہے۔''

''مام!'' وہ بے زار ہوا۔ ''میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں ماہی سے شادی کروں گا دو سال بعد کروں یا تین سال بعد۔''

''لیکن میں تمہاری شادی اس دیہاتن سے ہرگز نہیں کروں گی۔'' سلمیٰ کی آواز غصے سے بلند ہو گئی۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فائزہ بھٹی

آج پانچ سال بعد، میری زندگی کے نہیں میری شادی کے پانچ سال بعد میرے شوہر نے مجھے دیکھ کر کہا۔

"طیبہ یار! بہت کام کرتی ہو تم۔"

اور میں کتنی دیر تک حیران پریشان ان کا منہ تکتی رہ گئی۔ اور اتنی دیر تک کہ انہیں میرے چہرے کے آگے ہاتھ ہلا کر مجھے متوجہ کرنا پڑا کہ کیا ہوا۔

اب جبکہ میں نے یہ الفاظ سننے کی توقع ہی چھوڑ دی تھی۔ مجھے لگتا تھا یہ الفاظ اپنی زندگی میں سننا میرے نصیب میں نہیں، اب جا کر یہ الفاظ میرے کانوں کو سننا نصیب ہوئے تھے۔

اسی وقت مجھے اندازہ ہوا وہ الفاظ جن کو کان ترستے ہوں۔ اگر وقت پر ادا نہ ہوں تو ان کا ادا نہ ہونا ہی بہتر ہوتا ہے ورنہ وہ الفاظ ہمارے بہت سے زخم ہرے کر جاتے ہیں۔ ان سے لہو رسنے لگتا ہے۔ اور تکلیف نا قابلِ برداشت ہوتی ہے۔

میں پانچ بہنوں اور تین بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی۔

میرے بڑے دو بھائیوں اور ایک بہن کے بچے مجھ سے تھوڑے ہی چھوٹے تھے۔

حالانکہ میں بھی چھوٹی تھی۔ مگر پھر بھی ان کے بچوں کو سنبھالنے کی ذمہ داری ان کی ماؤں سے زیادہ مجھ پر عائد کر دی گئی۔

"طیبہ! اذان کو دیکھو۔ گر نہ جائے، طیبہ! ثمر رو کیوں رہا ہے۔"

"فریحہ کو فیڈر پلایا کہ نہیں، مہک چپ نہیں ہو رہی۔ یقیناً تم نے مارا ہوگا۔"

مجھے ہر طرف سے ایسی آوازیں سننے کو ملتی تھیں اگر وہ چپ نہ ہوئے تو اس میں بھی میرا ہی قصور تھا۔

اس جرم کی سزا میں بعض دفعہ مجھے دو چار تھپڑ بھی پڑ جاتے تھے۔

اور لیٹنے سے پہلے تو ایک بات طعنہ کی طرح مجھے لگتی۔

"سارا دن ویلی پھرتی رہتی ہے۔ اگر دو منٹ کو بچوں کو کھلانے کے لیے کہہ دو تو جان پر بن آتی ہے اس لڑکی کی۔"

میرا بچپن ان ہی طعنوں میں نکل گیا۔

ذرا بڑی ہوئی تو مجھے کچن کے کاموں میں دل چسپی ہونے لگی۔ ان کاموں کو کرنے کی کوشش کی تو مجھے زندگی میں پہلی بار نرمی سے پیچھے ہٹا دیا گیا۔

"طیبہ! گڑیا تم ابھی چھوٹی ہو۔ تم کھانا نہیں بنا سکتیں۔ ابھی بڑی باجیاں اور بھابیاں ہیں۔ بس تم اوپر کے کام کر دیا کرو۔"

پھر اوپر کے کاموں کے نام پر سب نے مجھے ایسا دوڑایا کہ میری ٹانگیں تختہ ہو گئیں۔

"طیبہ پانی تو بھر دو۔"

"طیبہ! نمک مرچ کے ڈبے پکڑانا۔"

"طیبہ بھاگ کے چھت سے لکڑیاں تو اتار کر لا دو۔"

"طیبہ! آندھی آرہی ہے تمام کھڑکیاں دروازے بند کر دو۔"

میں بھاگ بھاگ کر سارے گھر کے کھڑکیاں دروازے بند کرتی رہ جاتی جو کہ اتنا بڑا تھا کہ ٹانگیں جواب دے جاتی تھیں۔

"طیبہ ساتھ والی دوکان سے بوتل پکڑ لاؤ" طیبہ! مہمانوں کے آنے سے پہلے سموسے، نمکو بسکٹ لا دو۔

"طیبہ دیکھو دودھ والا آیا کہ نہیں؟"

قصہ مختصر رات تک میری ٹانگیں چلنے سے انکاری ہو جاتیں۔ پھر بھی رات کو جلدی لیٹنے پر سب

منہ بناتے۔

"سارادن ویلی رہ کر بھی تھک جاتی ہے۔ ایک ہم ہیں، سارادن جانوروں کی طرح کام کرنے کے باوجود رات کو سب کے سونے کے بعد سوتے ہیں۔"

میری شادی تک مجھے یہی کچھ سننے کو ملتا رہا۔ شادی کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

سارادن کام کر کے میری کمر دکھ جاتی مگر اللہ بخشے میری ساس کو ہر آئے گئے کے سامنے کہتیں۔

"آج کل کی لڑکیاں سارا سارا دن آرام کرتی ہیں۔ جیسا کہ میری بہو رانی۔ ایک ہم تھے کہ شادی کے دوسرے دن ہی کام سنبھال لیا تھا۔" ساس تو ساس، شوہر کے سامنے کہہ دیتی کہ میں تھک گئی ہوں تو وہ خفا ہونے لگتے۔

"ایسے کون سے پہاڑ توڑ رہی ہو۔ جب دیکھو، فارغ بیٹھی ہوتی ہو۔ پھر بھی میڈم تھک جاتی ہیں۔"

میں چپ، منہ دیکھ کر رہ جاتی۔ ہر ایک کی زبان پر ایک ہی بات سن سن کر تو مجھے بھی پختہ یقین ہو چکا ہے تھا کہ میں ویلی رہتی ہوں اور اب جبکہ میں اس یقین کی آخری حد پر کھڑی تھی تو میرے شوہر کو یاد آیا کہ طیبہ بھی کام کرتی ہے۔

اور اب میں سارے کام چھوڑ کر یہ سوچ رہی ہوں کہ آج ایسا میں نے کیا کر دیا جو فرید نے یہ الفاظ کہے۔

"واشنگ مشین میں کپڑے ڈالنے کے ساتھ فرش پر پوچھا لگا رہی تھی۔ چھوٹا عثمان مسلسل رو رہا تھا جسے اپنی کمر پر بٹھا کر پوچا لگا رہی تھی۔ اس سے بڑی عنیزہ بھی رو رہی تھی کیونکہ اسے بھی میری کمر پر چڑھنا تھا۔

دوپہر کے سالن کے لیے سبزی لا کر میز پر رکھی ہوئی تھی۔

یہ کام اور اس جیسے اور بہت سے کام تو میں ہر روز کرتی تھی اور کئی سالوں سے کرتی آ رہی تھی۔ پھر اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد آج ہی کیوں فرید کو لگا کہ میں کام کرتی ہوں۔

اگر میں کام کرتی تھی تو پھر فرید کو پہلے دن ہی یہ الفاظ بولنے چاہیے تھے۔

اتنے عرصہ بعد کیوں کیوں...... کیوں؟

اگر کبھی آپ کے ساتھ ایسا ہوا ہے تو پلیز آپ مجھے بتا دیں ایسا کیوں ہوا۔

ورنہ مجھے تو یقین آ چکا تھا کہ میں ویلی ہوں۔

☆☆

"اکیلی کیوں آئی ہو، آصف کہاں ہے؟"
اسے بیگ گھسیٹ کر لاتے دیکھ کر نسیمہ بیگم نے فوراً ٹھٹک کر پوچھا۔

ان کے سوال پر نا جیہ نے ہانپتے ہوئے بیگ چھوڑا تھا اور پھولی ہوئی سانسیں لیتی اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔

میز پر دھرا جگ اٹھا کر پانی گلاس میں ڈال وہ غٹا غٹ دو گلاس چڑھا گئی تھی۔

"ارے کچھ پھوٹو گی بھی منہ سے، کیوں میرا کلیجہ ہلا رہی ہو۔"

اس کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوتے ہوئے نسیمہ بیگم نے جھنجلا کر کہا۔

"آپ کا کلیجہ تو صرف ہلا ہے جبکہ میرا کلیجہ تو جل کر کوئلہ ہو گیا ہے۔"

صوفے کی پشت پر سر رکھتے ہوئے اس نے آنکھیں موند لیں۔

کسی انہونی کے خدشے سے پریشان ہو کر اسمہ بیگم نے پوچھا۔

"تمیز طریقے سے بتا کیا آخر ہوا کیا ہے۔"

"اماں! وہ شخص اس لائق نہیں ہے کہ اس کے ساتھ زندگی گزاری جائے، مجھے اپنی چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترسا کر رکھ دیا ہے اس نے، سارا پیسہ ماں اور بہنوں پر لٹاتا ہے، بیوی کے لیے نہ اس کے پاس پیسے ہیں، نہ محبت ہے اور نہ وقت ہے۔"
ان کے گلے لگ کر سسکتے ہوئے وہ بتانے لگی۔

اس کی بات پر کچھ لمحوں کے لیے تو وہ صدمہ میں چلی گئیں مگر پھر ہولے سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اسے دلاسا دینے لگیں۔

"میں کب سے برداشت کر رہی ہوں مگر اب نہیں ہوتا، بہنوں کے کالج میں کوئی فنکشن ہو یا پارٹی، جھٹ پیسے نکال کر تھما دیتے ہیں اور میں ایک سوٹ کے لیے پیسے مانگ لوں تو صاف انکار کر دیتے ہیں کہ اتنے سارے پڑے ہیں۔ وہی پہن لو، کئی بار ایسا ہو چکا ہے اور اب تو مجھ سے بات بھی نہیں کرتے۔

دفتر سے آتے ہی سیدھا ماں بہنوں کے پاس چلے جاتے ہیں، کہتے ہیں کہ تم چخ چخ کرتی ہو، میرا سکون برباد ہوتا ہے، چار ماہ ہو گئے ہیں مجھے بھی محسوس نہیں ہوا کہ انہیں مجھ سے محبت ہے۔"

بری طرح روتے ہوئے وہ خود کو ہلکان کر رہی تھی۔

نسیمہ بیگم نے غصے سے کھولتے ہوئے نتھنے پھلائے تھے۔

"تیرے بھائی آتے ہیں تو میں بات کرتی ہوں ان سے، تو فکر نہ کر، میری نازوں میں پلی بچی کو رول کر رکھ دیا۔"

اسے تسلیاں دیتے ہوئے وہ بیٹوں کے آنے کا انتظار کرنے لگیں۔

شام کو جب یوسف اور یونس آئے تو سب سے چھوٹی لاڈلی بہن کو چیخوں پکھوں روتا دیکھ کر گھبرا

گئے۔

"ارے میری بہنا رومت، ہم اس سے بات کرتے ہیں کہ آخر وہ چاہتا کیا ہے، کیوں ہماری بہن کو تنگ کیا ہوا ہے۔"

اسے بانہوں میں لے کر پیار سے سر تھپکتے ہوئے بڑے بھائی یوسف نے کہا۔

بڑی بھابھی نے سر جھٹک کر یہ منظر دیکھا تھا۔

چھوٹی بھابھی بھی منہ بنائے یہاں وہاں گھوم رہی تھیں۔ جانتی تھیں بھائیوں کے لاڈ شروع ہو چکے ہیں، اس لیے نظر انداز کیے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئی تھیں۔

☆☆☆

اگلے روز آصف سے بات کرتے ہوئے وہ دونوں خاصے غصہ میں تھے۔

وہ بھی کم نہ تھا، ان کی ہر بات کا پر زور دلائل کے ساتھ جواب دے رہا تھا، بات بڑھتے بڑھتے بہت آگے نکل گئی۔

دونوں نے الگ گھر کی شرط رکھ دی جس پر آصف بھڑک اٹھا وہ اپنی ماں اور بہنوں کو چھوڑنے کے لیے قطعی تیار نہ تھا۔

معاملہ بے نتیجہ رہا اور وہ دونوں حجت اور جرح کے بعد طیش میں گھر لوٹ آئے۔

ان کے انتظار میں کھڑی ناجیہ نے ساری گفتگو سن کر پھر سے رونا شروع کر دیا تھا۔

نسیمہ بیگم نے یوسف اور یونس کو ان کے کمروں میں بھیج کر اس کا ہاتھ پکڑا تھا اور کمرے میں لے آئی تھیں۔

"اس طرح رو کر کیوں بھائیوں کو پریشان کرتی ہے، جب اسے تیری پروا نہیں ہے تو کیوں ہلکان ہو رہی ہے تو اس کے لیے۔"

ماں کی بات پر وہ آنسو پونچھنے لگی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہیں امی! اس شخص نے کبھی مجھ سے محبت نہیں کی۔ نہ میرا خیال رکھا، پتا نہیں شادی کیوں کی تھی۔"

اس نے بجھے دل سے کہا۔

بیٹی کی حالت دیکھ کر نسیمہ بیگم پھر سے آصف کو کوسنے لگیں۔ مسلسل آنسو بہانے سے اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔

رات کو بستر پر لیٹتے ہوئے وہ کچھ دیر تک آنکھوں پر ہاتھ رکھے رہی پھر نہ جانے کب نیند نے اسے آن گھیرا۔

صبح اس کی آنکھ بھائیوں کے زور زور سے بولنے پر کھلی تھی۔

نیم وا آنکھوں سے کمرے کے باہر جھانک کر دیکھتے ہوئے وہ حیران رہ گئی تھی۔

"رات بھی تم نے ڈھنگ سے بات نہیں کی اس سے اور اب بھی اپنا اپنا ناشتہ بنا کر چل دیں، میری بہن کس حال میں ہے، تم لوگوں نے کھانے تک کا پوچھنا گوارا نہ کیا۔"

بھائی اس کی حمایت میں اپنی بیویوں پر برس رہے تھے۔

اسے ایک دم ان کی محبت پر فخر ہوا تھا۔

کمرے میں واپس آ کر اس نے گہری سانس بھری تھی اور دوپٹہ اٹھا کر مسکراتے ہوئے باہر آ گئی تھی۔

"آج آپ لوگوں کو دیر نہیں ہو گئی ہے کام سے۔"

باہر آ کر اس نے بشاشت سے کہا۔

"ہاں بس جا رہے ہیں، تم ناشتہ کر لینا اچھے سے، کل سے کچھ نہیں کھایا ہوا، فرح اسے اس کی پسند کا ناشتہ بنا کر دو۔"

چھوٹے بھائی نے اس کا سر تھپتھپا کر بیوی کو اشارہ کیا اور باورچی خانے سے باہر نکل گئے۔

دونوں بھابھیوں نے چبھتی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"بھابھی! آپ رہنے دیں، میں خود بنا لوں گی۔"

خلاف توقع نرمی سے ان کا شانہ تھام کر انہیں پیچھے کرتی وہ خود چولہا جلانے لگی. جانتی تھی ہمیشہ کی طرح بھائیوں کے حکم پر بھابیاں اس کی خوب آؤ بھگت کریں گی مگر دل سے نہیں .... اور ایسے کام کا کیا فائدہ جو دل سے نہ کیا گیا ہو۔

فرح اور لاریب نے حیرانی سے اس کے اندر اس تبدیلی کو دیکھا تھا۔

"میں بنا دیتی ہوں، تمہارے بھائی کو خبر ہوئی تو بہت خفا ہوں گے۔"

فرح بھابھی نے تاثرات سپاٹ کرتے ہوئے جلدی سے اس کے ہاتھ سے بیلن لیا۔

"ارے بھابھی! بھائی چلے گئے ہیں، انہیں کون بتائے گا آپ اسامہ اور رمشا کو اسکول جانے کے لیے تیار کریں، میں اپنا اور امی کا ناشتا خود بنا لوں گی۔"

اس کی اتنی نرم خوئی کو بمشکل ہضم کرتے ہوئے وہ دونوں کندھے اچکاتی باہر چلی گئی تھیں۔

ان کے جاتے ہی ناجیہ نے ہاتھ میں پکڑا بیلن

پیچھے رکھا تھا۔ آنکھوں کے آگے دھند کی چادر تن گئی تھی۔

"تاجو!" نسیمہ بیگم کی آواز پر اس نے جھٹ سے آنکھیں صاف کی تھیں مگر چہرا سارا بھید کھول گیا تھا۔

انہوں نے تیوریاں چڑھا کر اسے گھورا تھا۔

"خبردار! جو تو نے اس کے لیے آنسو بہائے اگر یوں رونا ہی ہے تو اپنے گھر چلی جاواپس......"

اس کی شکل دیکھ کر وہ ایک دم بگڑ گئیں۔

"اب تو نے رونا نہیں ہے اس کے لیے، ارے اپنی وہی بیٹیاں اتنی عزیز ہیں کہ آنچ بھی نہ آئے اور دوسروں کی بیٹیوں کو جلتے توے پر بٹھا دیتے ہیں۔" وہ پھر سے شروع ہو گئی تھیں۔

تاجیہ نے دکھ سے سر ہلا کر پیلا ہوا پیڑا توے پر ڈالا تھا اور پراٹھا سینکنے لگی تھی۔

☆☆☆

اسے آئے ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا تھا مگر آصف نے پلٹ کر پوچھا تک نہ تھا وہ ہر روز اس کے آنے کا انتظار کرتی تھی مگر شام ڈھلتے ہی مایوس ہو کر رو پڑتی تھی۔

آج بھی وہ دل کو لاکھ سمجھانے کے باوجود اس کے انتظار میں بیٹھی تھی کہ عمرانہ کی آمد ہو گئی۔

عمرانہ اس کی دیرینہ دوستوں میں سے ایک تھی۔

اس کے میکے واپسی کی خبر سنتے ہی دوڑی چلی آئی تھی۔

"وہ تمہیں لینے نہیں آئیں گے اور تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے خود سے واپس جانے کی، پتا نہیں تم نے ایسے گھٹے ماحول میں چار ماہ کیسے گزار دیے، میں اگر تمہاری جگہ ہوتی تو ایک پل نہ رہتی۔"

ساری بات سن کر غصے سے بولتے ہوئے عمرانہ نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"اپنے لیے اسٹینڈ لو، کیسے رہو گی ان کے ساتھ، میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ میرے کزن سعد سے شادی کر لو، وہ کھرا بندہ ہے بیوی اور گھر والوں کو ان کی جگہ پر رکھنے والا وہ تم سے محبت بھی کرتا ہے مگر تم نے بھائیوں کی بات مان کر ایک ایسے شخص کے لیے ہامی بھر لی جو بیوی اور ماں بہنوں کے درمیان پتنگ کی طرح ڈولتا ہوا نظر آ رہا ہے بلکہ وہ پتنگ ہے جس کی دوڑ ماں بہنوں کے ہاتھوں میں ہے، بیوی تو صرف بیٹھ کر اس کی اڑان دیکھے اور محبت تو دور پسندیدگی کی رمق تک نہیں ہے اس شخص کے اندر تمہارے لیے......"

تلخی سے کہتے ہوئے وہ اس کے دل کو مزید بددل کر گئی تھی۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو یار!"

تھکے تھکے انداز میں کہتے ہوئے اس نے صوفے کی پشت سے سر لگایا۔

"اچھا چلو اٹھو، کرن کی طرف چلتے ہیں، مزا آئے گا، تمہارا مزاج درست ہوگا اور ملنا ملانا بھی ہو جائے گا"

اس کا ہاتھ کھینچ کر اٹھاتے ہوئے وہ جوش سے بولی تو تاجیہ نے بے دلی سے نفی میں سر ہلا دیا مگر وہ زبردستی اسے کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئی۔

اور پھر واقعی دوستوں سے ہوئی ملاقات نے اس پر خاصا خوشگوار اثر ڈالا اور وہ ساری پریشانیاں کچھ لمحوں کے لیے یکسر فراموش کر گئی۔

عمرانہ نے فون کھڑکا کر سمیرا اور صبا کو بھی بلا لیا تھا۔

کئی گھنٹے گزارنے کے بعد رات کھانے کے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔

نسیمہ بیگم نے اس کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر شکر ادا کیا تھا ورنہ جب سے وہ آئی تھی اس کی آنکھ کا پانی نہیں سوکھ رہا تھا۔

تھک ہار کر بستر پر لیٹتے ہوئے اس نے بازو آنکھوں پر رکھے تھے کہ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

یک لخت چونک کر بے تابی سے اس نے موبائل اٹھایا تھا مگر انجان نمبر سے خوب صورت شعر

کی صورت میں جگمگاتا پیغام دیکھ کر ہی ہوگئی تھی۔
ذرا وقفے کے بعد پھر سے نیا پیغام موصول ہوا تھا۔
اب کی بار اپنا تعارف پیش کیا گیا تھا۔ عمرانہ کے کزن سعد کا پیغام تھا۔
یقیناً عمرانہ اسے ناجیہ کے حوالے سے باخبر کر چکی تھی۔ سر جھٹک کر موبائل سرہانے رکھتے ہوئے وہ اب کروٹ بدل گئی۔ یکے بعد دیگرے نہ جانے کتنے پیغام چکے تھے مگر چونکہ وہ ان کی اطلاعی گھنٹی کا گلا گھونٹ چکی تھی اس لیے ڈسٹرب نہ ہوئی۔
"تمہیں ایسے شخص کے لیے جوگ لینے کی ضرورت نہیں ہے جسے تمہاری پروا نہ ہو۔"
"واپس جانے کا سوچنا بھی مت جب تک وہ خود الگ گھر کی شرط کے ساتھ لینے کے لیے نہ آجائے، ایسے بخیل اور حسن مختص کے ساتھ رہ کر کب تک اپنی جان مارو گی۔"
غنودگی میں دوستوں کی ہدایتیں اور باتیں یاد کرتے ہوئے اس کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔
"میں نہیں جاؤں گی۔"
سر ہلاتے ہلاتے نیند نے اسے دبوچ کر اپنی آغوش میں بھر لیا۔
آج اتنے دنوں میں پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ بنا آنکھیں نم کیے سوئی تھی۔
صبح صادق کے وقت بیدار ہو کے وہ خود کو تر و تازہ محسوس کر رہی تھی۔
کل کے گزرے خوش گوار وقت کی مہربانی تھی۔
نماز ادا کر کے اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تھا۔
ڈھیروں پیغامات ایک دوسرے کے آگے پیچھے ترتیب سے پڑے تھے
تجسس سے کھولتے ہوئے اسے زور دار ہنسی آئی تھی۔
وہ دیوانوں کی طرح اظہار محبت کر رہا تھا۔

"جب دل کو اور اک ہوا کہ اسے آپ چاہئیں تو آپ کسی اور کے حصے میں لکھ دی گئیں۔"
"کیا یہ اذیت کے سب سے اوپری درجے والی بات نہیں، آج اس اذیت کا مداوا چاہیے آپ سے طبیب!"
آخری پیغام پڑھتے ہوئے اس نے مسکراتے لب بھینچ کر بند کیے تھے۔
"میری اذیت بھی مداوا مانگ رہی ہے سعد! مگر کیسے کروں۔"
ہولے سے بڑبڑا کر موبائل ایک طرف رکھتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔
خلاف توقع گھر میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔
باورچی خانے میں آ کر اس نے دیکھا تو سب کچھ صاف ستھرا اور چولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔
وہ الٹے قدموں لوٹ آئی۔
"بھابیاں کہاں ہیں امی!"
کمرے میں جھانک کر اس نے نسیمہ بیگم سے پوچھا۔
"اپنے میکے گئی ہیں کل شام سے۔"
چشمہ ناک پر ٹکائے سورہ یٰسین پڑھتے ہوئے انہوں نے مختصراً جواب دیا۔
ان دونوں کے اکٹھے میکے جانے پر وہ حیرانی سے سر ہلاتی پلٹ کر پھر سے باورچی خانہ میں چلی آئی۔
بھائیوں کے لیے ناشتہ تیار کرنے کے بعد انہیں بلانے کے لیے وہ باہر آئی تو انہیں کام کے لیے نکلتے دیکھ کر فوراً پکار بیٹھی۔
"بھائی! ناشتہ کر کے جائیں، میں نے بنا لیا ہے۔"
دونوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔
"مجھے کہہ دیتیں، میں بازار سے لے آتا، تم نے کیوں بنایا۔"
بڑے بھائی یوسف نے شگفتگی سے کہا۔

"کیوں بھئی! میں کون سا بدمزہ ناشتہ بناتی ہوں۔"

مصنوعی خفگی سے کہتے ہوئے اس نے ناک سکوڑی۔

"ارے نہیں! ہماری گڑیا کے ہاتھ کے ناشتے میں جو سواد ہے وہ باہر کے کھانے میں کہاں، چلو شاباش جاؤ لے کر آؤ۔"

اسے بانہوں کے حلقے میں لے کر سر پر بوسہ دیتے ہوئے انہوں نے پیار سے کہا وہ تو نہال ہی ہوگئی۔

فوراً باورچی خانے کی جانب دوڑ لگائی۔

پھر ان چاروں نے مل کر ناشتہ کیا تھا۔

"کتنے دنوں بعد میرے تینوں بچوں نے ساتھ یوں اکٹھے بیٹھ کر کچھ کھایا ہے۔ یقین کرو دل خوش ہوگیا ہے۔"

بھائی ناشتہ کر کے کام پر چلے گئے تو چائے پیتے ہوئے نسیمہ بیگم خوشی سے بولیں۔

تاجیہ نے بھی خوش ہوتے ہوئے سر ہلایا تھا۔

اندر رکھا موبائل بار بار تھرتھرا کر خاموش ہو رہا تھا مگر اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ باورچی خانے سے فراغت کے بعد کام والی آگئی۔

نسیمہ بیگم اسے تفصیلی صفائی کے بارے میں سمجھانے لگیں اور وہ کمرے میں آکر موبائل اٹھا کر بیٹھ گئی۔

بٹن دباتے ہی سامنے پیغامات منہ چڑا رہے تھے۔

باری باری تمام پیغامات پڑھتے ہوئے پیچھے تکیہ رکھ کر نیم دراز ہوتے ہوئے اس نے موبائل الٹا کر کے سینے پر دھرا تھا اور چھت کو گھورنے لگی تھی۔

جس روز اس نے سعد کی بولتی نگاہ کا پیام پڑھا تھا اس روز وہ خوش کن احساس کے زیر اثر سو نہ سکی تھی چاہے جانے کا گدگداتا احساس روح میں سرشاری کی سی کیفیت دوڑا رہا تھا۔

دل نے پسندیدگی کی جانب پہلا قدم بڑھایا تھا۔

مگر یہ قدم وہیں ٹھٹھر کر رہ گئے تھے جب نسیمہ نے آصف کا رشتہ قبول کر کے فوراً بات پکی کر دی تھی۔

اور یوں وہ اپنے قدموں کو واپس موڑ گئی تھی۔

کتنی ہی دیر یوں سوچتے ہوئے گزری تھی۔

باہر ہوتی کھٹ پٹ نے اسے متوجہ کیا تو وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے موبائل اٹھا کر اسکرین کو گھورنے لگی۔

کچھ سوچنے کے بعد اس کی انگلیاں موبائل کی اسکرین پر لکھتے ہوئے متحرک رہی تھیں۔

راحت جاں!

محبت میں انتظار کے معنی اذیت سے جا ملتے ہیں جتنی اذیت اس عرصے میں، میں نے سہی ہے یقیناً آپ بھی اس سے دوچار ہوئے ہوں گے۔

اس اذیت کے خاتمے کی خواہش ہے۔

آپ سے مل کر سارے دکھ مرجھا جائیں گے۔

روح کی شادابی کے لیے آپ سے ملاقات لازم ہوگئی ہے۔

آپ کی منتظر

تاجیہ

پیغام بھیجنے کے بعد اس نے موبائل کو مٹھی میں بند کر کے پیشانی سے لگایا تھا۔

لبوں پر ہلکا سا تبسم ابھر کر معدوم ہو چکا تھا۔

چت لیٹ کر گہری سانس لیتے ہوئے وہ خود کو کافی حد تک پرسکون محسوس کر رہی تھی۔

یوں لیٹے نہ جانے کتنا وقت گزرا تھا کہ گھنٹی بجی جھٹ سے پیغام کھولتے اس کے ہاتھ اک لمحے کے لیے کانپے تھے۔

جان حیات!

زمین کے نظاروں میں سب سے خوب صورت نظارہ تمہارا مسکراتا چہرہ ہے جسے دیکھنے کی خواہش میں یہ فرقت کا تھوڑا سا عرصہ صدیوں کے مترادف لگ رہا ہے۔

تمہیں روح کی شادابی چاہیے اور مجھے وجود میں روح جو کہ ہمارے ملنے سے مشروط ہے۔
اس انتظار کا اختتام بہت جلد ہوگا۔
تیار رہنا!
تمہارا صاحب!
محبت بھری چند سطریں پڑھتے ہی وہ اندر تک شاد ہوگئی تھی۔
مشام جاں میں مفرح احساس دوڑنے لگا تھا۔
وہ ہنسی اور ہنستی چلی گئی تھی۔
اتنے دنوں سے بوجھل دل یک لخت ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔
"خیر ہے آج بہت کھلی ہوئی ہو۔"
نسیمہ بیگم اندر داخل ہوتے ہوئے اسے دیکھ کر حیران ہوگئی تھیں۔
"جی امی!"
انہیں جواب دے کر وہ مسلسل مسکراتے ہوئے بار بار ان الفاظ کو پڑھ رہی تھی۔
"کھانے میں کیا بنے گا آج" انہوں سے سرسری سا پوچھا۔
"کھانا آج میں بناؤں گی" وہ پھر سے موبائل پر جھکتے ہوئے بولی تو نسیمہ بیگم چند لمحے اسے دیکھنے کے بعد سر جھٹکتے ہوئے باہر نکل گئیں۔
کچھ دیر میسج میں مصروف رہنے کے بعد وہ دوپہر کے کھانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
چونکہ بھابیاں گھر پر موجود نہ تھیں، اس لیے اس نے بھائیوں کے لیے دل جمعی سے کھانا تیار کیا تھا۔
دوپہر کے کھانے سے فراغت کے بعد وہ لمبی تان کر سوگئی تھی۔
شام کو باہر سے آنے والی آوازوں نے اس کی نیند میں خلل ڈالا تھا۔
بھائی واپس آچکے تھے اور لاؤنج میں بیٹھے کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ وہ اٹھتے دوپٹے کو سمیٹ کر کاندھے پر ڈالتی باہر کی طرف آئی تھی مگر پھر ایک دم رک گئی تھی۔
چند لمحے وہیں کھڑے رہنے کے بعد وہ سیدھی باورچی خانے میں چلی آئی تھی۔
چائے بنا کر لاؤنج میں آئی تو موضوع گفتگو اس کی ذات تھی۔
دونوں بھائی آصف سے خاصے برگشتہ دکھائی دے رہے تھے جس نے پلٹ کر پوچھا تک نہ تھا۔
"بھائی! آپ دونوں جا کر بھابیوں کو لے آئیں۔"
چائے کے کپ انہیں تھماتے ہوئے اس نے خلاف توقع دھیرے سے کہا تو وہاں بیٹھے تینوں نفوس ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔
"میں اس گھر میں رہ رہی ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ گھر کے معاملات کس نہج پر جارہے ہیں۔"
نسیمہ بیگم کے ساتھ بیٹھتے ہوئے اس نے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔
جن کے چہرے پر صاف لکھا تھا کہ انہوں نے اس سے اس بات کو چھپایا تو اسے معلوم کیسے ہوا۔
"صبح جب میں نے امی سے پوچھا تو اس طرح بھابیوں کی اچانک اور اکٹھے غیر موجودگی پر ٹھٹھک گئی تھی، حال احوال کے لیے دوپہر میں انہیں فون کیا تو جو سننے کو ملا وہ معاملے کی تہہ تک پہنچنے کو کافی تھا۔"
اس کی بات سن کر نسیمہ بیگم نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کپ لبوں سے لگایا تھا۔
"ہم ہرگز انہیں لینے کے لیے نہیں جائیں گے، یہ کیا بے ہودہ شرط ہے کہ ہم تمہیں تمہارے گھر بھیج دیں تو وہ شہزادیاں واپس آئیں گی۔"
یوسف نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے غصے سے کہا۔
"ہماری بہن سے محبت کھٹکتی ہے انہیں، اپنی مرضی سے گئی ہیں تو اپنی مرضی سے آئیں گی۔"
اب کی بار یونس جلال سے بولا تھا۔
"جو انہوں نے کہا، وہ بالکل درست کہا، میں

سمجھتی ہوں اگر وہ یہ سب نہ کہیں تو مجھے سمجھنے میں زمانے لگ جاتے اور یہ زمانے میری ازدواجی زندگی نگل جاتے۔"

ان کے لب ولہجے پر وہ ایک دم تیزی سے بولی۔

"میں آپ کی چھوٹی بہن ہوں، آپ مجھ سے کتنی محبت کرتے ہیں، میری ذرا سی تکلیف آپ لوگوں کے لیے ناقابل برداشت ہوتی ہے، میری ہر ضرورت کا خیال بنا پوچھے رکھتے ہیں بھی مجھ سے بے رخی نہیں برتتے، اونچی آواز میں بات نہیں کرتے، مجھے جھڑکتے نہیں، کوئی اور شخص مجھے ایذا پہنچائے تو اس سے باز پرس ہوتی ہے۔

بھائی! بالکل ایسی ہی محبت آصف بھی اپنی بہنوں سے کرتے ہیں، وہ اگر بہنوں سے محبت کرتے ہیں تو بیوی سے محبت میں بھول چوک کر جاتے ہیں آپ کی طرح انہیں بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ کب کہاں کتنی محبت بانٹنی ہے، ہر رشتہ توازن مانگتا ہے بھائی! بگڑے توازن رشتے بھی بگاڑ دیتے ہیں۔"

ٹھنڈی ہوتی چائے کا کپ میز پر دھرتے ہوئے وہ خود کو نارمل کرتی لب بھینچ گئی تھی۔

"وہ بالکل میری طرح آپ لوگوں سے اپنا حق مانگ رہی ہیں وہ حق جو انہیں کبھی نہیں ملا۔

ماں بہنوں کی محبت میں بیوی کو نظر انداز کرنا یا بیوی کو دیکھ کر باقی رشتوں سے منہ پھیر لینا بے وقوفی ہے بھائی! آپ جائیں اور بھابھیوں کو لے کر آئیں۔"

وہ ان کی طرف التجائیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

پیوستہ لبوں اور سیاہ آنکھوں میں رضامندی جھلک رہی تھی۔ وہ دونوں خاموشی سے اپنی جگہ سے اٹھے تھے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھتے باہر چل دیے تھے۔

اس کے بھائیوں کی یہی بات اچھی تھی کہ احساس دلانے سے فوراً اپنی غلطی مان جاتے تھے۔

"گھر واپس جانا چاہتی ہو؟"

نسیمہ بیگم نے ان کے جانے کے بعد بیٹی سے پوچھا۔

تو اس نے ہولے سے سر ہلا کر ہاں کا عندیہ تھا۔

اگر رشتوں میں احساس باقی ہو تو انہیں پنپنے سے کوئی نہیں روک سکتا اس نے غیر جانب داری سے اپنا احتساب کیا تھا بہت سی باتوں میں اس کا ردعمل جذباتی اور شدید تھا اور کئی جگہوں پر اس کی حق تلفی بھی ہوئی تھی۔

اپنے حصے کے احساس کو بیدار کرتے ہوئے اس نے آصف کو پیغام بھیجا تھا۔

میاں بیوی کے رشتے میں کچھ دوسرے کی ماننے اور کچھ اپنی منوانے والی بات تعلق کو مضبوط کرتی ہے اگر اس رشتے کو چلانا مقصود ہو تو خامیوں کو پس پردہ اور خوبیوں کو اجاگر کرنا پڑتا ہے۔

کیونکہ اس فرقت کے عرصے میں اتنا تو وہ جان گئی تھی کہ اسے اپنے شوہر سے شدید محبت ہے۔

گھر کے داخلی دروازے کی بجتی گھنٹی سے اس کے خیالات کا تسلسل ایک دم ٹوٹا تھا۔

چونکتے ہوئے وہ دروازہ کھولنے اٹھی تو اس سے پہلے نسیمہ بیگم جا چکی تھیں۔

آصف کو ان کے ہمراہ اندر آتا دیکھ کر وہ کچھ پل کے لیے ساکت ہوئی تھی۔

"السلام علیکم!"

آواز کا من پسند گھمبیر پن جسے سننے کے لیے وہ کتنے دنوں سے بے قرار تھی۔

نظروں میں نرمی اور محبت کی جوت تھی۔

اس نے دھیرے سے سر ہلا کر سلام کا جواب دیا تھا۔

نسیمہ بیگم چائے بنانے چلی گئی تھیں۔

"مزاج بخیر ہیں۔" آواز میں شرارت واضح

تھی۔
ناجیہ نے مصنوعی خفگی سے انہیں گھورا تھا۔
"خراب ہیں بہت، درست کریں گے؟"
ذرا سا جھک کر سرگوشی کرتے ہوئے اس نے ابرو اچکائی۔
"صرف درست نہیں، اعلا کردوں گا۔"
وہ بھی اسی کے انداز میں بولا۔
ان کی بات پر ہنستے ہوئے وہ ایک دم سیدھی ہوئی تھی۔
آصف نے بھی مسکرا کر ملاحت سے اس کے چہرے کو تکا تھا۔
"اگر میں نہ پکارتی تو............"
یک لخت سنجیدگی سے کہتے ناجیہ نے بات بدلی تھی۔
"تو میں پکار لیتا۔"
اس کی بات پر مسکراہٹ نے لبوں پر دستک دی تھی۔
"جھوٹ بھی بے تکا بولتے ہیں۔" مسکراہٹ دباتے وہ ان کے الگ گھر کا مطالبہ نہ ماننے والی بات پر چوٹ کرگئی۔
"میں نے مطالبہ ماننے سے انکار کیا تھا، تم سے دستبرداری کا نہیں۔"
اس کی بات کا مفہوم سمجھتے ہی آصف نے وضاحت دی تھی۔
"اب گھر چلیں؟"
"بھائیوں کو آنے دیں، میں نے کھانا بنایا ہوا ہے۔
سب مل کر رات کا کھانا کھائیں گے اور پھر گھر چلیں گے۔"
اس کی بات کا جواب دے کر وہ نظریں جھکا گئی تھی۔
"بہت شکریہ!"
وہاں سے اٹھ کر وہ باورچی خانہ میں آئی تو چائے تقریباً تیار تھی۔

باقی لوازمات رکھتے ہوئے نسیمہ بیگم نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔
"بہت سمجھ داری کا مظاہرہ کیا ہے تم نے، تمہیں سمجھانے کی ذمہ داری میری تھی جو میں ٹھیک سے ادا نہیں کر پائی۔"
اسے سراہتے ہوئے انہوں نے اپنے لیے تاسف کا اظہار کیا تھا۔
"اولاد کو تکلیف میں دیکھ کر سب والدین تڑپ اٹھتے ہیں پھر وہ نہیں جانتے کہ غلطی ان کی اولاد کی ہے یا دوسرے کی، انہیں صرف اپنے بچے کی تکلیف دکھائی دے رہی ہوتی ہے، مجھے اندازہ ہے کہ تھوڑے دن اور گزرتے تو آپ نے تشویش میں مبتلا ہو کر مجھے ضرور سمجھانا تھا۔"
ان کے ہاتھ تھام کر اپنے ہاتھوں میں لیتے ناجیہ نے ان کی پشیمانی کو دور کیا تھا۔
"اپنی بھابھیوں سے بدگمان مت ہونا بیٹا! اس وقت ان کا دل دکھا ہوا ہے اس لیے کچھ تلخ کہہ گئی ہیں۔"
وہ اپنی بہوؤں کی جانب سے اس کا دل صاف کرنے کی کوشش کرنے لگی۔
ناجیہ کو ایک دم ہنسی آگئی۔
"میری بھولی امی! اگر میں بھابھیوں سے بدگمان ہوتی تو بھائیوں کو انہیں لینے کے لیے نہ بھیجتی، وہ حق بجانب ہیں، آہستہ آہستہ دلوں کی ساری کدورت دھل جائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"
اس کی بات پر وہ سر ہلا گئی تھیں۔
"تمہاری ساس کا رویہ کیسا ہے۔"
انہوں نے اچانک پوچھا۔
"بس ٹھیک ہے نہ بہت زیادہ اچھا ہے اور نہ برا۔"
ابلتی چائے کو کپوں میں ڈالتے ہوئے اس نے بتایا۔
"اب کوشش کرنا کہ اپنی ساس اور نندوں کے ساتھ مل جل کر رہو، گھر والوں اور گھر والے

سے بنا کر رکھو گی تو سکھ لے گا۔"

"جی امی!"

اس نے تابع داری سے سر ہلایا۔

نسیمہ بیگم لوازمات اٹھائے باہر آصف کے پاس چلی آئی تھیں جبکہ وہ سیدھا کمرے میں آئی تھی جہاں مسلسل موبائل کی اسکرین جل بجھ رہی تھی۔

"معذرت سعد صاحب! مجھے جس محبت کی تلاش تھی وہ آپ سے کبھی نہیں مل سکتی تھی۔

کیونکہ محرم کی جانب سے ملا محبت کا "م" غیر محرم کی محبت کے چاروں حروف پر بھاری ہوتا ہے"

تواتر سے آتے سعد کے پیغامات بنا پڑھے ڈیلیٹ کے کھاتے میں ڈالتے وہ سکون سے اس کا نمبر بلاک لسٹ میں ڈال کر باہر آ گئی تھی۔

اکٹھے مل کر چائے پیتے ہوئے تینوں نے اچھا وقت گزارا۔

شام ڈھلتے ہی دونوں بھائی اپنی بیویوں اور بچوں کو لے کر آ گئے تھے۔ آصف کو دیکھتے ہی دونوں جھجکے تھے مگر بہن کا خوش باش چہرہ دیکھ کر آگے بڑھ کر گلے لگا لیا تھا۔

بھابیوں نے بھی اچھے انداز میں سعد سے علیک سلیک کی تھی۔

پھر رات گئے خوش گوار محفل اختتام کو پہنچی تھی۔

بھابیوں نے اپنے کھنچے رویے پر معذرت کرتے ہوئے اسے واپسی پر تحائف دے کر رخصت کیا۔ گاڑی چلاتے ہوئے آصف نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا جو چہرہ ہتھیلی پر ٹکائے باہر کے دوڑتے مناظر دیکھنے میں محو تھی۔

گاڑی سگنل پر رکی تو ہمیشہ کی طرح گجرے والے گاڑیوں کے شیشے بجانے لگے۔

آصف نے ایک نظر ناجیہ کو دیکھا جو گاڑی رکنے پر بھی نہیں چونکی تھی۔

اشارے سے گجرے والے کو بلاتے ہوئے اس نے ناجیہ کے لیے پہلی بار گجرے لیے تھے۔

جونہی وہ گجرے لے کر نرمی سے اس کا دایاں ہاتھ تھام کر پہنانے لگا تو وہ ایک دم چونک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"رشتے کی خوب صورتی برقرار رکھنے کے لیے گو کہ یہ چونچلے اضافی ہیں مگر خوش گوار ہیں۔"

دوسرے ہاتھ میں بھی گجرا پہنا کر اسے دیکھ کر چھیڑتے ہوئے آصف نے کہا جس پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"اگر آپ یہ چونچلے نہیں کریں گے تو ہم پھر بھی اس رشتے کی خوب صورتی برقرار رکھیں گے۔"

اس نے چنبیلی کی خوشبو سونگھ کر اپنے شریک حیات سے تائید چاہی۔

جس پر پرزور انداز میں سر ہلا کر وہ مسکراتے ہوئے اشارہ کھلنے پر گاڑی کو گیئر لگا گیا تھا۔

ناجیہ کی جتنی حق تلفی ہوئی تھی اس نے پہلا چھوٹا سا ازالہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

انہیں اب اپنے تعلق کو تعلق کی اس نوعیت کے حساب سے پروان چڑھانا تھا۔

جس میں خلوص محبت اور احساس کا مادہ شامل ہو۔

زندگی کی شاہراہ سڑک کے شفاف پانی کی طرح واضح ہو کر درست منزل کا تعین کر گئی تھی اور وہ دونوں اس سفر میں ایک دوسرے کے ساتھ مسرت کا نغمہ گنگنا کر مسکرا اٹھے تھے۔

☆☆

مُکمل ناول

فرح بخاری

شامِ شہرِ ہجر

میانذم کا گھرانہ ہے جہاں ایک گھر میں دو خاندان رہتے ہیں۔ رضوانہ کی تین بیٹیاں ہیں۔ شوہر مر چکے۔ نعمہ
ندرت بھاوج ہیں ان کا ایک بیٹا ہے مومن جس کی منگنی رضوانہ کی بیٹی تحریم سے طے تھی۔ وسیلہ نے ایل ایل بی
کیا تھا لیکن ماں کی بیماری کی وجہ سے پریکٹس نہیں کر سکی تھی۔ چھوٹی ایلیا کالج کی طالبہ ہے۔
تھانہ میں حویلی میں رہنے والی دادی منصب پر بہت مہربان ہیں وہ ان کے منشی کا بیٹا ہے۔ حویلی میں کوئی
اس کا آنا پسند نہیں کرتا۔ دادی اس کی تعلیم کا خرچہ اٹھاتی ہیں وہ پولیس آفیسر بن جاتا ہے اس کا ٹرانسفر میانذم
ہو جاتا ہے۔ منصب کی دو بہنیں ہیں میمونہ اور رمشہ، میمونہ شادی شدہ ہے۔
حویلی میں رہنے والی شہناز اور کمال جان کا بیٹا ارحم ہے جو ضدی اور بددماغ سا ہے۔ شہناز بی بی کی بہن
گلناز ہے جو نیم پاگل ہے۔ ارحم شادی کرنا چاہتا ہے۔
رضوانہ اور ندرت مومن کے ساتھ شاپنگ پر جاتی ہیں دو گاڑیوں میں قافلہ جاتا ہے ایک گاڑی وسیلہ ار
دوسری مومن چلا رہا ہے راستے میں بارش اور طوفان کا سامنا کرنا پڑتا ہے منصب بھی اس طوفان کا شکار ہوتا۔۔۔

دوسری قسط

"چائے پی لو ثانیہ۔ آرام ملے گا۔" ذکیہ بیگم نے ہولے سے اس کا کندھا چھوا تو اس نے ہاتھ آنکھوں سے ہٹایا۔

"اسی لیے کہتی ہوں، زیادہ گہرائی سے مت لیا کرو ان باتوں کو۔ اب کیا ہر مریض کی کہانی اسی طرح دل سے لگا کر بیٹھ جاؤ گی۔ وہ ڈاکٹر بھرا چھے ہوئے نا۔ جسمانی تکلیف کی دوا دے کر ایک کو رخصت کیا اور دوسرے کو آواز لگا دی۔ کسی کی ذاتی زندگی جاننے کا جھنجھٹ ہی کوئی نہیں۔" ذکیہ بیگم کا ایک ہی شکوہ تھا۔ ثانیہ نے مسکرا کر گرم چائے کا کپ

ہاتھ میں لیا۔

"مجھے لگتا ہے، مجھ سے زیادہ آپ میرے پیشنٹس کی لائف پر سوچنے لگتی ہیں؟"

"ہاں تو اور کیا۔" ذکیہ بیگم نے منہ بنایا "اب ایسی دردناک کہانیاں سناؤ گی تو جی لگے گا کسی اور کام میں؟"

"سوری۔ مجھے احتیاط کرنی چاہیے، آپ بلاوجہ اسٹریس نہ لیں۔" ثانیہ کو حقیقی دکھ ہوا۔ اس نے دل میں طے کیا کہ آئندہ وہ سوچ سمجھ کر ان سے اپنے مریضوں کے قصے شیئر کیا کرے گی۔

آج اس کے کلینک پہ ایک بزرگ آئے تھے۔ زندگی درس وتدریس میں گزری تھی، اب ریٹائرڈ تھے۔ ان کا مسئلہ یہ تھا کہ ان کے چار بیٹے جواب بڑے بڑے عہدوں پر تھے اور اپنی اپنی خوش حال زندگی گزار رہے تھے، وہ ان کی بات کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اُن کے رویے سے ایسا ظاہر ہوتا جیسے وہ انہیں زندگی کے ہر معاملے میں ریٹائرڈ ہی سمجھتے تھے۔۔ ڈاکٹر ثانیہ سے ان کی گزارش بس اتنی تھی کہ انہیں کسی کے دل میں اپنی اہمیت اور قدر پیدا نہیں کرنی، صرف اپنی حساس طبیعت کو مارنا ہے۔۔ اس کے لیے کوئی مشورہ کوئی دوا اگر کام کرتی ہو تو وہ انہیں ہر قیمت پر چاہیے تھی۔ ثانیہ نے ان کی باتوں پر اپنے آنسوؤں کو بڑی مشکل سے ضبط کیا تھا۔ بزرگوں کی بے بسی پر ہمیشہ ہی اسے بڑی تکلیف دہ سی گھٹن محسوس ہوتی تھی۔

"تو پھر کیا مشورہ دیا تھا انہیں؟" امی نے آہستہ سے پوچھا تو ثانیہ چونک کر خیالات سے باہر آئی۔

"جی۔ کچھ دوائیں تو ہوتی ہیں سکون کی۔ انہیں لکھ دی تھیں۔ ساتھ ساتھ ان کے مشاغل پوچھ کر انہیں اپنی لائف کو معروف رکھنے کے مشورے بھی دیے تھے۔ پریشان کن سوچوں سے چھٹکارے کا واحد حل اپنے ذہن کو کسی اور طرف مصروف رکھنے میں ہے۔"

"تو کہنا مانیں گے وہ تمہارا؟"

"جب میں نے ان کے مشاغل پوچھے تو انہوں نے کہا کہ وہ تاریخ سے بہت دلچسپی رکھتے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ تاریخی کتب کی دستیابی میں میں ان کی مدد کردوں گی، بس وہ اپنی پسندیدہ تاریخی کتب سے مطالعے کا آغاز کریں اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ آج کل وہ اسلامی تاریخ پہ کام بھی کررہے ہیں اور بہت مگن ہیں۔"

"ویسے تو، تمہارا کام ہے بڑا دلچسپ۔"

"جی...... عام ڈاکٹرز کی طرح نہیں کہ ایک کو دوا دی اور دوسرے کو آواز لگادی۔" ثانیہ نے ان ہی کے جملے سے حساب برابر کیا تو وہ ہنس کر اس کے کندھے پر دھپ لگاتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ثانیہ بھی کھل کر ہنستے اپنے سر کے درد کو کم ہوتا محسوس کرنے لگی۔

☆☆☆

"وسیلہ۔ او وسیلہ۔" رضوانہ ریسیور ہاتھ میں پکڑے وسیلہ کو اونچی آواز میں پکار رہی تھیں۔

"جی امی......؟" وہ کمرے سے نکلی تھی۔ تحریم کی اگلے روز مہندی کا فنکشن تھا۔ جہیز کا بھاری سامان ندرت کے ہاں سیٹ ہوچکا تھا۔ صرف تحریم کے سوٹ کیس تیار ہونا باقی رہ گئے تھے۔ وہ خود تو ایلیا کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوئی تھی۔ پیچھے وسیلہ ہی کپڑوں کی پیکنگ کا کام سنبھال رہی تھی۔

"بیٹا! تمہاری کسی ٹیچر آصفہ کی کال ہے۔" انہوں نے ریسیور وسیلہ کو تھمایا اور عجلت میں وہاں سے چلی گئیں۔

"میم آصفہ......" وسیلہ نے حیرت آمیز خوشی سے زیر لب دہرایا۔

"جی وسیلہ! میم آصفہ بات کررہی ہوں، آپ کی انگلش کی ٹیچر۔" سامنے سے مسکرا کر وضاحت کی گئی اور وسیلہ شرمندہ ہوگئی۔

"میم آپ کا نام ہی کافی ہے۔ میں تو بس حیران ہورہی تھی کہ۔"

"آپ کی حیرت بجا ہے وسیلہ۔" آصفہ سنجیدہ ہوئیں۔ "دراصل میں آج کل سید شریف میں ہوتی ہوں۔ میاں دم چھوڑے قریب اڑھائی سال ہوگئے۔"

"جی میم، کچھ پرانی کلاس فیلوز سے پتا چلا تھا کہ

آپ وہیں پر شفٹ ہوگئی ہیں۔کیسی ہیں میم آپ؟"
"الحمد اللہ، آپ بچوں کی دعائیں ہیں۔وسیلہ مجھے آپ سے کچھ کام ہے۔"
"پلیز میم! آپ حکم کریں، میں ہر وقت حاضر ہوں۔"
"جب میں میاندم میں تھی تو چوکیدار اشرف یاد ہے نا؟"
"جی میم اشرف چاچا بالکل یاد ہیں۔"
"جب ان کی ڈیتھ ہوگئی تو ان کی فیملی کی میں کبھی کبھار امداد کردیا کرتی تھی۔لیکن اس ماہ منی آرڈر کی رقم واپس گھر آگئی ہے، پوسٹ مین کو بتایا گیا کہ انہوں نے وہ گھر چھوڑ دیا ہے۔ مجھے کافی پریشانی ہے کہ اب ان کو کیسے تلاش کروں۔انہوں نے بھی مجھ سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔"
"اوکے میم، میں آپ کو پتا کر کے بتاتی ہوں۔ آس پڑوس سے معلوم کرتی ہوں۔"
"تھینک یو وسیلہ! مجھے اندازہ تھا کہ آپ میرا کام کرسکتی ہیں۔"
"شکریہ کی کوئی بات نہیں میم۔میرے لیے خوشی اور اعزاز کی بات ہوگی اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں۔"

☆☆☆

"اُف خدایا، کوئی تو میری پرابلم سمجھے۔" تحریم بے چینی سے برآمدے میں چکر کاٹتے مسلسل ہتھیلی پہ موبائل بجائے جارہی تھی۔ندرت ممانی کو وہ تین چار مرتبہ کالیں ملا چکی تھی۔تحریم کا مسئلہ ایک وہی حل کرسکتی تھیں لیکن یقیناً وہ اپنے مہمانوں کی آمد کی وجہ سے بزی تھیں۔دوسرا نمبر مومن کا تھا لیکن وہ تو کارڈ بٹتے ہی جیسے آپ مایوں بیٹھ گئے تھے۔تحریم کو خود تو بالکل ان رواجوں سے کچھ لینا دینا نہیں تھا لیکن مومن ان رواجوں کی مکمل پاس داری کررہا تھا' تحریم کو شادی سے پہلے ہر حال میں اپنا کمرہ دیکھنا تھا۔وسیلہ نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے صبح ہر اینگل کی تصویریں اسے لا کر دکھائیں لیکن انہیں دیکھ کر تو تحریم اور بھی زیادہ تڑپ اُٹھی۔اسے کمرے کی سیٹنگ پہ شدید اعتراض تھے۔بیڈ اس دیوار کے ساتھ کیوں رکھا۔صوفہ فلاں جگہ ہونا چاہیے تھا۔ڈریسنگ ٹیبل یوں کیوں ہے، میز، دوں کیوں۔
"میری توبہ تحریم۔" وسیلہ ہاتھ جوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی" مجھے میم آصفہ کے ایک بہت ضروری کام سے نکلنا ہے۔میں جارہی ہوں۔"
"ایلیا......اے ایلیا۔" تحریم نے باہر نکلتی ایلیا کو بازو سے پکڑ کر روکا" کہاں جارہی ہے میری بہن؟"
"ندرت مامی کی ہیلپ کرنے، مہمان کافی ہیں، لنچ میں انہیں دقت نہ ہوتو۔"
"سنو یار......میرا ایک کام کردو۔" ریم نے لہجہ سرگوشیانہ کیا اور ایلیا کو تب ہی خطرے کی بُو آگئی۔ تنگ کر بہن کو دیکھا جس پر ریم نے بے ساختہ سر کھجایا۔
"وہ۔مجھے۔مجھے اپنا کمرا دیکھنا ہے۔" بالآخر جھجک ترک کرتے اس نے فٹ سے کہہ دیا۔
"مطلب آپ چوری چوری اپنا کمرہ دیکھنا چاہتی ہیں۔
تو آپ کے وہ ہونے والے۔وہ کدھر ہیں۔ اُن کی مدد لونا۔"
"یہ لو، وہی تو دغا باز نکلے۔کچھ سننے کو تیار ہی نہیں ہیں۔"
ریم نے کسی طرح ایلیا کو منا ہی لیا تھا۔
ایلیا جالی والا دروازہ کھول کر برآمدے سے ہوتی کوریڈور میں آئی، یہاں کا سب سے پہلا روم ہی مومن اور تحریم کے لیے سیٹ کیا گیا تھا۔ایلیا نے اندر جھانکا تو وہاں بھی کوئی نہیں تھا۔
"آجاؤ آپی" اس نے باہر نکل کر آواز دی اور ریم خوشی سے اچھلتی ہوئی دوڑی۔
تحریم کا کمرے کی سجاوٹ دیکھ کر منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔وسیلہ نے تو صبح سویرے اسے تصویریں دکھائی تھیں۔اس بیچ مومن نے پھر کچھ تبدیلیاں کی تھیں۔کمرہ کافی خوب نارمل ہوا، دیکھ کر ریم کو بیچ بیچ ہی ایلیا سے شرم آگئی۔

"ہوں۔ اب ہو مطمئن؟" ایلیا نے بازو پھیلا کر کمرے کی سیٹنگ کی جانب اشارہ کیا۔

"تم بلاوجہ" الفاظ ایلیا کے منہ میں ہی رہ گئے اسے دروازے کے باہر مومن کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ کسی سے موبائل فون پر بات کرتا ہوا آرہا تھا۔

"مومن......" ریم نے بھی آنکھیں پھیلائیں اور پھر غڑاپ کر کے کھڑکی کے بھاری براؤن پردوں کے پیچھے چھپ گئی۔ ایلیا منہ کھولے کچھ کہنے کی کوشش میں کھڑی رہ گئی جب مومن اچانک کمرے میں داخل ہوا۔

"تم۔ یہاں؟" مومن کا ایلیا کو اپنے بیڈروم میں دیکھ کر ماتھا ٹھنکا۔ "کوئی کام ہے؟" اس نے بمشکل لہجے کو نرم کیا کہ وہ اور وسیلہ مسلسل اس کی امی کے ساتھ کاموں میں لگی تھیں۔

"جج جج جی بھیا۔ وہ۔ وہ میں بیڈشیٹ دیکھنے آئی تھی۔"

"ریم آپی نے پوچھا تھا نا۔" اس نے بات سنبھالی۔

"تو۔ دیکھ لیا؟" مومن نے موبائل والے ہاتھ سے نہایت بدمزاجی سے بیڈ کی جانب اشارہ کیا۔ مومن کمرے کو لاک کرنے کی نیت سے آیا تھا۔

"جی۔" اس نے سر تو ہلایا لیکن ٹس سے مس بھی نہیں ہوئی۔

"ہوں، آجاؤ، میں کمرا بند کردوں۔" اس نے ایلیا کو ہاتھ سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا وہ تھوک نگلتے ہوئے ہلتے پردے کو دیکھنے لگی۔

"بھیا! میں تصویریں بنالوں؟ ریم آپی کو دکھانے کے لیے؟" اس نے اپنی طرف سے بہانا سوچا۔

"موبائل کہاں ہے؟" وہ اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ ایلیا نے شرمندگی سے آنکھیں بھینچیں۔

"چلو۔" مومن نے اس بار سیدھے سبھاؤ نکلنے کا اشارہ کیا اور وہ بے بسی سے پھر پردے کو دیکھے گئی۔ ریم آپی لاک ہونے والی تھیں۔ دل میں سوچا ہونے دو لاک، ایک بار مومن بھیا یہاں سے چلے جائیں، وہ ندرت ممانی کے ساتھ آکر ریم کو نکال لے جائے گی۔ بلکہ زیادہ امکان تو یہی تھا کہ آپی خود ہی اندر سے لاک کھول کر باہر آسکتی تھیں۔ وہ مطمئن انداز میں باہر نکلی، مومن نے دروازہ بند کیا اور ریم تڑپ کر دروازے تک پہنچی۔

"کھولو کھولو۔" اس نے دیوانہ وار دروازہ پیٹنا شروع کردیا۔ مومن نے ایک حیرت بھری نگاہ ایلیا پر ڈالتے ہوئے دروازہ کھولا تو گھبرائی بوکھلائی ریم۔

"تم۔؟" مومن نے غصے سے گھورا لیکن آگے سے ریم پیارا سا مسکرادی، مومن نے گڑبڑا کر ایلیا کی طرف دیکھا اور وہ بری طرح خجل ہوتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

اشرف کے گھر والوں کا ایڈریس وسیلہ کو اس کے پڑوس سے ہی مل گیا تھا۔ اور وسیلہ اب اشرف کے بیوی بچوں کا نیا ایڈریس لے کر وہاں تک آگئی جہاں وہ اب رہ رہے تھے۔ ہاں لیکن آگے کی لوکیشن سمجھنا اب ذرا مشکل لگ رہا تھا۔ سامنے کچھ دکانیں تھیں۔ اس نے ابھی چلنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ دکانوں سے چند قدم پہلے ایک پولیس جیپ آکر رکی اور ایک پولیس والا جیپ سے اتر کر پشت کیے دوسری سیٹ سے کچھ سامان اٹھانے لگا۔

"ایکسکیوزمی۔" وسیلہ نے بنا سوچے اسی کو آواز دے ڈالی۔

"ہوں۔" منصب چونک کر پلٹا تو بے ساختہ حیرت سے دوچار ہوا۔ وہ طوفانی رات اور چند روز پہلے پھولوں کے بکے والی لڑکی، آج تیسری مرتبہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ براؤن اور بلیک کڑھائی والی چادر اپنے گرد ایسے مکمل اوڑھے کہ بال تک دکھائی نہ دے رہے تھے۔ منصب نے پھر بھی اسے پہچان لیا۔ کیونکہ وہ ہر بار اسی طرح باوقار حلیے میں کوئی نہ کوئی چادر اوڑھے ہی اسے دکھائی دی تھی۔ وسیلہ کی آنکھوں میں پیدا ہوتی حیرت بھی جلد شناسائی میں تبدیل ہوئی۔ وہ طوفانی رات والا لڑکا،

"آپ۔؟" وہ ایک دم ٹھٹکی۔

"ارے۔ آپ۔" وسیلہ کی آپ میں اگر حیرت تھی تو منصب کے آپ کہنے میں ایک دوستانہ سا ہلکا پھلکا پن تھا۔

"آں جی۔ وہ۔ مجھے یہ ایڈریس جاننا تھا۔" وسیلہ نے عام سے انداز میں اس کی جانب پتے کی پرچی بڑھائی۔

"آپ میرے ساتھ آیئے' ہمیں وہاں اوپر تک جانا ہے۔" منصب نے پتا دیکھ کر ہاتھ سے اونچائی کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ جانتے ہیں اس ایڈریس کے بارے میں؟" وہ پتا نہیں کیوں بے یقین سی تھی۔

"جی جی آجایئے۔" منصب نے پرچی وسیلہ کو واپس دے کر اپنے تھیلے اٹھائے اور آگے چل دیا۔ وسیلہ نے بھی پیش قدمی کی۔ منصب نے بجائے گھاس سے گزرنے کے چند قدم آگے جاکر پتھروں کا راستہ اپنایا اور اوپر چڑھنے لگا۔ وہ اپنے گھر اپنے علاقے سے کافی دور ایک تقریباً انجان جگہ پر ایک اجنبی پہ بھروسا کرتے اندھوں کی طرح آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ دل میں اچانک ہی ایک خیال آیا کہ اشرف کے پڑوسیوں نے اسے کافی تفصیل سے پتا سمجھایا تھا اور اس تفصیل میں کہیں کسی چڑھائی چڑھنے کا کوئی ذکر نہیں تھا جبکہ یہ پولیس والا۔ اس نے آگے چلتے منصب کو دیکھا، جس سے اس طوفانی رات کی مصیبت میں بس کچھ دیر کا ساتھ رہا تھا، وہ اس پر بلاوجہ بھروسا کرکے اس کے قدموں پر چلتی جا رہی تھی۔ دل میں شک کے بیج نے زور پکڑا۔

"ہمیں کہاں تک جانا ہے۔" وہ ایک دم اپنی جگہ پر ڈٹ گئی۔

"بس اب تو پہنچ گئے سمجھیں۔ یہیں چھ اسٹیپ کے بعد۔"

"وہ۔ میں کسی اور ٹائم آجاؤں گی۔ ابھی مجھے جانا ہے۔" وہ تیزی سے بتا کے نیچے اترتی چلی گئی۔ اور منصب اپنی بات منہ میں لیے دیکھتا رہ گیا۔ وہ جھٹ پٹ نیچے کہیں غائب ہو گئی تھی۔ منصب کندھے اچکا کر مسکراتے ہوئے بڑھ گیا۔

وسیلہ اکیلے چلے آنے پر اب دل ہی دل میں شدید پچھتا رہی تھی۔ سوچا اس بار مطلوبہ گھر نہ ملا تو اگلی بار ایلیا کو ساتھ لائے گی۔ لیکن بہرحال اللہ نے اس کی سن لی تھی۔ دکان والوں نے جس مکان کے متعلق بتایا وہی اشرف چوکیدار کا نکلا۔ چاچے کا تیرہ چودہ سالہ بیٹا حفیظ دروازے پر آیا اشرف چوکیدار کا گھر مل گیا تھا اور وسیلہ نے دل ہی دل اس پولیس والے کو کوسا جو اسے بھٹکا کر اوپر کہیں اکیلے میں لے جا رہا تھا۔

☆☆☆

"منصب، کہاں ہو؟ بیل بج رہی ہے، تم جاتے ہو یا للی کو بھیجوں؟"

رمشہ نے کچن سے ہانک لگائی۔ صفورہ کپڑے دھونے میں مصروف تھی۔ للی کو اس نے لکھنے کا کام دے لگا کر اندر بٹھایا تھا۔ دروازے پر معلوم نہیں کون آیا تھا۔

"ہاں ہاں جا رہا ہوں۔" منصب نے ڈریس چینج کرکے چپلیں پیر میں پہنیں اور دروازے پر پہنچا۔

"آپ۔؟" دروازہ کھلتے ہی وسیلہ کو پولیس والا دکھائی دیا تو اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ حالانکہ حفیظ کی معیت میں دوبارہ اوپر چڑھتے وہ شرمندہ سی تھی کہ پولیس والا ابھی کچھ دیر پہلے اسے یہیں لا رہا تھا لیکن یہ تو اس نے بالکل نہیں سوچا تھا کہ پولیس والا اسے اپنے ہی گھر لے جا رہا تھا۔ منصب کو البتہ زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔ اس نے چہرے کو بمشکل سنجیدہ رکھتے لڑکی کو اندر آنے کی اجازت دی۔ لڑکی کے پیچھے صفورہ کا بیٹا حفیظ جھانک رہا تھا۔

"صاب...... اماں ابھی ادھر ہی ہے نا؟"

"ہاں۔ اندر ہیں۔"

"او کے صاب۔ ان باجی کو اماں سے کچھ کام ہے۔ میں جاتا ہوں۔ گھر اکیلا ہے۔" حفیظ تو اپنی کہہ کر فوراً ہی واپس پلٹ گیا۔ اور وسیلہ نچلا لب شرمندگی سے دانتوں میں دبائے آگے بڑھی تو چہرے پر ہلکی مسکراہٹ بھی تھی۔

"آئی ایم سوری۔ وہ اصل میں ایڈریس بتانے والوں نے کسی پہاڑی وغیرہ پر گھر ہونے کی کوئی بات نہیں کی تھی اس لیے میں گھبرا گئی۔"

"جی، بتانے والے بھی اپنی جگہ ٹھیک تھے کیونکہ ان لوگوں کا گھر تو نیچے سڑک پر ہی ہے۔ لیکن یہاں وہ کام کرتی ہیں اور اس وقت یہیں پر تھیں۔"

"تو آپ نے بھی نہیں بتایا کہ وہ آپ کے گھر میں ہیں۔"

"ابھی میں یہ بھی کہتا کہ آپ کو "اپنے" گھر لیے جا رہا ہوں۔" منصب نے شگفتگی سے اپنے پر زور دیا تو وسیلہ پہلی مرتبہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ منصب نے جب ایڈریس میں حفیظ ولد اشرف مرحوم دیکھا تو فوراً ہی سمجھ گیا کہ وہ اشرف کی بیوی صفورہ سے ملنا چاہتی ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ صفورہ اور لبنیٰ ان ہی کے گھر کام کر رہی ہیں۔ وہ اسے لیے لاؤنج میں آیا، اسے بیٹھنے کا کہہ کر رمشہ کو آواز دی اور خود اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

"السلام علیکم۔" رمشہ کو کچن سے نکلتے دیکھ کر وسیلہ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آ..... آپ.....؟" رمشہ کی آنکھوں میں اس سامنے کھڑی پیاری سی لڑکی کو دیکھ کر حیرت اُتر آئی۔ سلام کا جواب بھی دینے کا خیال نہیں آیا۔

"آپ مجھے جانتی ہیں؟" وسیلہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ خوش اخلاقی سے پوچھا۔

"آں..... وہ، ایگزیکٹلی نہیں۔" رمشہ اپنی عجلت پر نادم تھی۔ منصب نے اسے پھولوں والی بات کا ذکر کرنے سے منع کیا تھا۔

"اچھا، مجھے لگا شاید آپ نے مجھے پہچان کر ایسا کہا۔"

"جی، بس کسی کے جیسی لگیں آپ۔" رمشہ نے خود ہی بات سمیٹ لی

"ایگزیکٹلی مجھے صفورہ بی بی سے ملنا ہے۔ میری ٹیچر ہیں آصفہ شاہ، ان کا پیغام ہے۔"

"او ٹھیک..... آپ بیٹھیے..... میں صفورہ کو بلاتی ہوں۔" رمشہ نے فوراً کچن میں اگر گلاس میں جوس ڈالا اور پچھلے صحن سے صفورہ کو آواز دے کر بلایا۔ چھوٹی ٹرے ہاتھ میں لیے لاؤنج میں آئی تو لبنیٰ کمرے سے نکل کر تعجب سے انگلیاں منہ پہ رکھے اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی۔

"رمشہ باجی..... یہ تو پھولوں والی لڑکی ہے نا؟"

"جی۔؟؟" وسیلہ بے چاری ایک بار پھر حیرت سے اٹھ کھڑی ہوئی، جبکہ رمشہ کی آنکھوں کے اشارے لبنیٰ کے سر پر سے گزر گئے۔

"وہ اُس دن ہم نے منصب بھیا کا پھولوں کا بکے غلطی سے آپ کو بھجوا دیا تھا۔" لبنیٰ نے دانت نکال کر وضاحت کی۔

اس مرتبہ رمشہ نے جوس پیش کرتے خود ہی سجاد سے ساری کہانی بیان کر دی۔

"اوہ......" وسیلہ گلاس لیتے ہوئے ہنس کر واپس صوفے پر بیٹھ گئی۔ "اچھا ہوا آپ نے مجھے تفصیل بتا دی، پچھلے کئی دنوں سے میں تجسس سے زیادہ پریشانی میں تھی کہ آخر وہ پھول کس کی طرف سے آئے، مجھے تو اپنی دو بہنوں کے علاوہ تیسرا بندہ ہی اب تک نہیں سوجھا تھا۔

"تو سمجھیں وہ آپ کی تیسری بہن تھی۔" رمشہ نے خوش دلی سے اضافہ کیا تو وسیلہ مسکرا دی۔

"کیا میں اپنی تیسری بہن کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

"اوہ سوری، میرا خیال ہے ہم تعارف کرانا بھول ہی گئے" میرا نام رمشہ ہے۔ یہ لبنیٰ ہے، صفورہ بی بی کی بیٹی۔"

"میرا نام وسیلہ ہے۔"

"تو آپ کی بھی اس دن برتھ ڈے تھی وسیلہ؟" رمشہ بے یقین تھی۔

"جی، ورنہ میں دکان دار سے وہ پھول لیتی ہی کیوں۔ اس نے باقاعدہ اعلان کر کے کہا کہ شاپ میں موجود جس بندے کی آج برتھ ڈے ہے یہ بکے اس کے لیے ہے۔"

"یہ واقعی عجیب بات ہے ویسے۔"

''جی۔'' وسیلہ نے اس کے بھائی کے موضوع پر بولنے سے گریز کیا۔ کچھ ہی دیر میں صفورہ اپنا کام نمٹا کر اندر آ گئی۔ اب سے پہلے شاید ان لوگوں کے پاس موبائل نہیں تھا۔

''اوکے، میں اب چلتی ہوں، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی رمشہ۔'' وسیلہ نے ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

''مجھے آپ سے زیادہ خوشی ہوئی ہے وسیلہ، کیونکہ ہمیں یہاں آئے ابھی بہت کم وقت ہوا ہے۔ سوائے صفورہ بی بی کی فیملی کے کسی سے کوئی جان پہچان نہیں۔''

''او، پھر تو آپ کو ہمارے گھر آنا چاہیے۔ ہمارا عورتوں سے بھرا گھر آپ کو یقیناً بہت اچھا لگے گا۔'' صفورہ بی بی، لبنیٰ اور وسیلہ بات کرتے کرتے گیٹ تک آ گئیں۔

رمشہ سے اجازت لے کر تینوں ایک ساتھ باہر آئیں۔ ڈھلان اتر کر نیچے آتے صفورہ اور لبنیٰ اپنے گھر کے راستے کو مڑ گئیں اور وسیلہ جب شاپس کے نزدیک پہنچی تو دکانیں بند ہو چکی تھیں اور جیپ کا بونٹ کھولے منصب وہاں کھڑا تھا۔ وسیلہ کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے بونٹ بند کیا۔

''کام ہو گیا آپ کا؟''

''جی ہو گیا.... اور......'' وہ کچھ دیر کے لیے جھجک کر رک گئی۔ منصب مکمل متوجہ ہوا کہ وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہے۔

''سوری، میں نے بلاوجہ برا گمان کیا۔'' وسیلہ کا اشارہ کچھ دیر پہلے کی بات کی طرف تھا۔

''او، اٹس اوکے، میں نے بالکل برا نہیں مانا۔ احتیاط میں انسان کے کئی فائدے چھپے ہوتے ہیں۔ آپ نے اچھا کیا۔''

''ایک معذرت اور بھی ہے، اس روز آپ کی سسٹر نے آپ کے لیے پھول خریدے لیکن وہ میرے پاس آ گئے۔''

''اس کے لیے معذرت کی ضرورت نہیں، وہ ایک غلط فہمی تھی، اس میں آپ کا کیا قصور، اٹ واز جسٹ اے کوانسیڈنس۔''

''جی، ویسے عجیب اتفاق ہے، برتھ ڈے کا ایک ہونا۔'' وسیلہ کو ماننا پڑا۔

''ہوں......'' منصب نے سرسری ایک نظر وسیلہ پر ڈالی۔ ''اور کبھی کبھار کچھ اتفاقات سلسلہ ثابت ہوتے ہیں چند اور اتفاقات کا۔''

''جی......؟'' وہ حیران ہوئی۔

''جی، یہ سچ ہے۔ جیسے ہماری سالگرہ تو ایک دن ہے ہی، ہم دونوں اس بک شاپ میں بھی اتفاق سے ایک ساتھ موجود تھے۔ اور ابھی کچھ دیر پہلے آپ جو ایڈریس میرے پاس پوچھنے کے لیے لائیں وہ بھی اتفاقاً میرا اپنا ہی نکلا۔''

''اوہ ہاں بالکل'' وسیلہ نے جیسے اب سوچا اور بے ساختہ ہی ہنس دی۔

''ان فیکٹ اس رات طوفان میں بھی ہم ایک ساتھ ایک ہی جگہ پھنس گئے تھے۔''

''ہوں، یہ بھی ہے۔'' منصب متفق ہوا۔

''آپ کا زخم اب کیسا ہے؟'' اس رات زخمی ہو جانے والے لڑکے کا گہرا زخم اور وہ خون بھی اب تک بھول نہیں پایا تھا۔

''جی، اللہ کا شکر ہے اب بالکل ٹھیک ہے۔''

''اوکے، مجھے اب اجازت۔'' وسیلہ نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ اسے گھر سے نکلے کافی ٹائم ہو چکا تھا۔

''وسیلہ جی۔'' منصب نے جاتی ہوئی وسیلہ کو نام لے کر آواز دی تو وہ چونک کر مڑی۔

''مجھے لگتا ہے ہمارا پانچواں اتفاق شاید یہ ہے کہ ہم دونوں ہی اس وقت آبادی کی طرف جا رہے ہیں۔'' اس نے اشارہ اپنی جیپ کی طرف کیا تو وسیلہ ہنس پڑی۔

''جی بالکل یہی بات ہے لیکن شکریہ میں خود چلی جاؤں گی۔'' اس نے سبھاؤ سے فوراً ہی معذرت کی تو منصب نے بجائے اسے جواب دینے کے اوپر تک ہاتھ ہلایا۔

''گیٹ بند کر کے نیچے جاؤ۔'' وسیلہ نے

سر اٹھا کر اوپر دیکھا تو منصب رمشہ کو بلا رہا تھا۔
"آ...... آپ میری وجہ سے......" وہ جھجک کر رک گئی۔
"ارے نہیں ۔ میری بہن گھومنے پھرنے کی بہت شوقین ہے۔ دراصل ادھر ہمارے تھانہ میں ماحول بالکل الگ تھا۔ یہاں کا کھلا ماحول دیکھ کر یہ بہت خوش اور ایکسائیٹڈ ہے۔ مجھے بازار سے کچھ سامان وغیرہ لینا ہے تو میں نہیں چاہتا یہ پیچھے اکیلی رہے۔" منصب نے بھی سنجیدہ لہجے میں وضاحت کی تو وسیلہ سر ہلا کر چپ ہو گئی۔ رمشہ کی آمد پر تینوں جیپ میں سڑک پر آ گئے۔ وسیلہ نے اپنے گھر کی لوکیشن بتائی تو منصب بے ساختہ ہلکا سا مسکرا دیا لیکن کہا کچھ نہیں۔
"آپ کیا کرتی ہیں وسیلہ؟" رمشہ نے دلچسپی سے پوچھتے سر اس کی جانب موڑا۔
"میں نے وکالت کی تعلیم حاصل کی ہے مینگورہ میں۔"
"مطلب آپ وکیل صاحبہ ہیں؟" منصب نے سر سیدھا کرتے بے ساختہ پوچھا، وکیل اور پولیس کے خاص تعلق کے حوالے سے چہرے پر مسکراہٹ ابھری تھی۔
"جی، ایل ایل بی تو مکمل ہو گیا تھا لیکن پریکٹس ابھی اسٹارٹ نہیں کر سکی، میری امی کی طبیعت کچھ خراب رہنے لگی تو میں واپس آ گئی۔"
"کیا ہوا آپ کی امی کو؟" رمشہ نے فوراً پوچھ بھی لیا۔
"انہیں ڈائی بیٹیز کا پرابلم ہے۔"
"تو گھر میں اور کوئی نہیں کیئر کرنے والا؟" منصب نے ہی سوال کیا۔
"جی دو بہنیں ہیں۔ ایک بڑی ایک چھوٹی" وہ بتاتے ہوئے مسکرا دی۔ "لیکن امی کو تسلی نہیں ہوتی میرے علاوہ ویسے اب وہ مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ پریکٹس شروع کر دو۔"
"بس بس یہیں۔" اس نے رُکنے کا اشارہ کیا تو منصب نے کار کو ایک سائیڈ پہ روکا۔
"آئیں رمشہ۔ آپ دونوں اندر آئیں۔ میری امی کے ہاتھوں کی مزے دار چائے پئیں۔" اس نے اخلاقاً ہی نہیں پورے دل سے دونوں کو آفر دی۔
"وہ...... ابھی تو نہیں وسیلہ جی۔ مجھے واقعی بازار سے کافی کچھ خریدنا ہے۔ لیکن بہت جلد ضرور۔ ان شاء اللہ، کیوں رمشہ۔" اس نے مسکرا کر بہن کو دیکھا۔ انداز بالکل نارمل اور سادگی بھرا تھا۔ رمشہ نے بھی تائید میں سر ہلایا۔
"اوکے تو پھر بہت جلد نہیں، بلکہ کل۔" وسیلہ نے کچھ سوچ کر ہینڈ بیگ سے ایک کارڈ نکال کر رمشہ کی طرف بڑھایا۔ "مجھے دوسری باتوں میں بتانے کا موقع نہیں ملا، دراصل کل سے میری بڑی سسٹر کی شادی شروع ہو رہی ہے۔ مجھے بہت خوشی ہوگی اگر آپ دونوں میرے مہمانوں کے طور پر اس میں شرکت کریں۔"
"اوہ، ضرور، ہمیں خوشی ہوگی۔" رمشہ نے مسکرا کر کارڈ وصول کیا اور وسیلہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔
"وسیلہ جی......" منصب نے جاتی ہوئی وسیلہ کو آواز دے کر روکا تو وہ مڑی۔
"اتفاق سے وہ میرا آفس ہے۔" لبوں پر معنی خیز شرارتی سی مسکراہٹ تھی اور انگلی کا اشارہ تھوڑا پیچھے اونچائی کی طرف۔ وسیلہ نے حیرت سے منہ کھولے انگلی کے تعاقب میں دیکھا۔ اونچا ڈھلانی راستہ جس بڑی بلڈنگ کی طرف کیا گیا تھا وہ ان کے گھر کے بالکل قریب تھی۔ اور لفظ "اتفاق" کا مطلب بھی صرف وہی سمجھ سکی تھی۔
"اوہ۔ یہ تو واقعی بالکل قریب ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ اسے چھٹا اتفاق کہتے کہتے رہ گئی۔ منصب نے جیپ آگے بڑھا دی اور رمشہ پلٹ کر دور تک اسے ہاتھ ہلاتی رہی۔

☆☆☆

"بہت پیاری لگ رہی ہو ریم۔" وسیلہ نے تحریم کی ٹھوڑی اونچی کی تو وہ جھینپ کر مسکرا دی۔ مہندی کا فنکشن اسٹارٹ ہو چکا تھا۔ تحریم پیلے اور سبز

لباس میں بہت ہلکے میک اپ کے ساتھ بہت پیاری اور معصوم لگ رہی تھی۔
"ہاں لیکن مسکراؤ ذرا کم آپی۔" ایلیا نے بھی جھک کر حصہ لیا "ایک وہ آپ کے مڑو ہیں۔ شکل تو دیکھو، لگتا ہے۔فرار ہونے کی سوچ رہے ہیں؟" ایلیا نے ابرو سے بائیں جانب اشارہ کیا تو ریم نے جہاں منہ پہ ہاتھ رکھ کر ہنسی روکی۔ وسیلہ نے ایلیا کے سر پر ایک جمائی۔
"شرم کرو، اب تو پیچھا چھوڑ دو بے چارے مومن کا۔"
"ہاں جیسے وہ چھوڑ دیں گے میرا پیچھا۔" ایلیا نے خفگی سے منہ بسورا "ابھی ابھی ڈانٹ کھا کر آئی ہوں۔"
"لاحول ولاقوۃ، اب کس بات پر ڈانٹ کھالی۔"
"آگے بھی کھاتی رہوں گی۔ اللہ کے فضل وکرم سے۔ میرے کاموں کو گھورتے ہی جتنی اینگل سے ہیں۔ ایک ذرا سی مٹھائی ہی تو بانٹی تھی گلی کے معصوم بچوں میں۔"
"اُف ایلیا...... یار پہلے فنکشن تو اچھی طرح نمٹ جانے دو، مہمانوں کے لیے مٹھائی کم پڑ سکتی تھی، ٹھیک ہی تو کہہ رہے تھے بے چارے۔"
"بس۔ یہی تو المیہ ہے۔" وہ باقاعدہ روٹھ گئی۔ "غریبوں کو بچا کھچا دے کر ہم سمجھتے ہیں ثواب کمارہے ہیں۔"
"یار ان کو اگلے دن اسپیشلی خرید کر کھلا دینا، ابھی ضروری ہے کیا۔"
وسیلہ کی نظریں داخلی دروازے سے اندر آتی رمشہ پر گئیں تو وہ فوراً اُدھر بڑھ گئی۔
"ہاں اور جیسے اگلے روز خرید کر اسپیشلی کھلا دیا تو ان کے مہا مڑو کوئی اور نکتہ نہیں اٹھائیں گے۔" ایلیا باوجود وسیلہ کے وہاں سے چلے جانے کے بڑبڑائے گئی۔
"ہائے رمشہ۔ آیئے بھئی۔" وسیلہ نے آگے بڑھ کر گھبرائی گھبرائی رمشہ کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ ڈھیر سارے اجنبی چہروں میں یقیناً اسی کو ڈھونڈ رہی تھی۔
"او، وسیلہ۔ ماشاء اللہ آج تو پہچانی بھی نہیں جا رہیں۔" رمشہ نے فیروزی اور گولڈن فراک میں ملبوس خوب صورت ہیئر اسٹائل اور میک اپ والی وسیلہ کو واقعی ذرا مشکل سے پہچانا تھا۔
"تھینکس رمشہ، آپ بھی بہت پیاری لگ رہی ہیں۔" وسیلہ نے اس سے ملتے پیچھے دور تک دیکھا۔
"اور کوئی نہیں ہے ساتھ۔؟"
"اور۔" رمشہ حیران ہو کر پیچھے دیکھنے لگی "او...... وہ منصب بھائی کہہ رہے تھے کہ لیڈیز کا فنکشن ہے۔ وہ مجھے چھوڑ کر واپس چلے گئے۔"
"ایسی کوئی بات نہیں، مکس گیدرنگ ہے۔ لیکن چلیے، آجائیں۔" وہ رمشہ کو لیے تحریم اور ایلیا کے پاس آئی، پھر امی اور ندرت ممانی سے بھی ملوایا۔
"تھوڑا ہنس دیں مومن!"
تحریم نے دور ہو کے بیٹھے مومن سے سرگوشی کی، اور وہ تو تحریم کے نزدیک آنے پر ہی بدک گیا۔
"آرام سے بیٹھو تحریم!"
"مسکرانے میں کیا جاتا ہے آپ کا، مووی اور پکچرز ہی اچھی آجائیں گی۔"
"مسکرا تو رہا ہوں۔" اس نے ہنسنے کی کوشش کی جس پر تحریم نے بڑی مشکل سے قہقہہ روکا۔ مومن بالکل ہی جھینپو تھا۔ پبلک میں اس کی ہنسی گم ہو جاتی، اور آج تو فنکشن ہی اس کی اپنی مہندی کا تھا۔ خود پہ ٹکی نظریں اسے اچھا خاصا نروس کر رہی تھیں۔
"اچھا منحوس مت، اور وسیلہ کو ڈھونڈو۔" مومن نے بظاہر سامنے دیکھتے ہولے سے لب ہلائے۔
"کیوں، وسیلہ سے کیا کام ہے؟" ریم نے تعجب سے دیکھا۔
"یار مجھے نکلنا ہے اِدھر سے۔ خواتین کا ایک ٹولہ اسی طرف آرہا ہے اور مجھے بالکل انہیں فیس نہیں کرنا۔" وہ ممانی اور عروبہ کے ساتھ ادھر آتی خواتین کو دیکھ کر ابھی سے نروس ہونے لگا۔
"بیٹھے رہیں، کچھ نہیں ہوتا......"
"چپ۔" اس نے نتھنے پھلائے اور پاس سے گزرتی ایلیا کا فوراً ہی اُٹھ کر راستہ روکا۔
"وہ تم۔ کیا کہہ رہی تھیں ایلیا۔ کہاں مٹھائی

بانٹی ہے؟"

"ہیں؟؟؟" ایلیا کی آنکھیں تو اس خوش خلقی پر اُبل ہی پڑیں "یہ اپنے مومن بھیا ہی تھے کیا؟

"چلو، چلو، لیٹ ہو جائیں گے۔" وہ اس کے بازو پر دھکا دیتے نکل کھڑا ہوا۔ تحریم نے تاسف سے اس کی پشت کو دیکھا۔ قریب آ جانے والی خواتین بھی جاتے مومن کو مایوسی سے دیکھ رہی تھیں۔ اِدھر ایلیا کی الگ سٹی گم تھی۔

"آپ واقعی مٹھائی بانٹیں گے؟"

ایلیا کو لگا شاید بچوں کی مسکینیت نے اندر کہیں جوش مارا ہے۔

"پاگل ہوں کیا۔؟" مومن نے آنکھیں نکال کر گھورا "اور تم بھی مجھے اُن لوکروں کے آس پاس کہیں دکھائی مت دینا۔" رش سے نکلتے ہی مومن نے تیور دکھائے۔

"ہائے اللہ، آپ ہی تو کہہ رہے تھے۔" ایلیا کو ہرگز اپنے کانوں پہ شبہ نہیں گزرا تھا، انہوں نے واقعی یہی کہا تھا۔

"مجھے اُن عورتوں کے جھرمٹ سے نکلنا تھا۔ چلو بھاگو تم۔" وہ ناک سکوڑ کر دوسری جانب نکل گیا اور ایلیا نے جل کر اس کی پیٹھ دیکھی۔

"اللہ قسم، ایسے ہی منافقوں کو غریبوں کی ہائے لگتی ہے۔"

☆☆☆

"بی بی جی،" وہ منشی جبر خان کا بیٹا آیا ہے حارث۔" مسرت نے دھیرے سے آواز دی لیکن شہناز چونک کر اٹھ بیٹھی۔

"حارث......اچھا...... بیٹھک کھلوا دی؟"

"جی بی بی! کہہ رہا تھا، آپ سے کوئی ضروری کام ہے، میں نے بٹھا دیا ہے بیٹھک میں۔"

"ہاں ہاں......ٹھیک ہے۔" شہناز نے فوراً اپنی کالی چادر اچھی طرح اپنے گرد اوڑھی۔ کمال خان کی وفات کے بعد گزرے ڈیڑھ دو برس میں حویلی کے اکثر معاملات اس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھے تھے۔ ارحم ڈیرے پر بیٹھتا ضرور تھا لیکن فیصلے وہ ماں کی مرضی کے مطابق ہی کرتا۔ اور یہ کام تو شہناز نے کافی وقت سے حارث کے ذمے لگا رکھا تھا۔

"سلام بی بی!" حارث بی بی شہناز کو دیکھتے ہی مؤدب سا اٹھ کھڑا ہوا۔

"وعلیکم السلام۔ کیسا ہے حارث بچہ، کدھر ہوتا ہے آج کل؟"

"پہلے صوابی میں تھا بی بی، سال ڈیڑھ اُدھر گزارا، تب بھی آپ کے کام سے غافل نہیں رہا، پر آج کل اُدھر میر گرہ میں ہوں۔"

"اور کوئی خبر؟" شہناز کی آنکھوں میں تجسس کی لو تھی۔

"جی بی بی، وہ مل گئی ہے۔"

"اچھا۔" شہناز کا بے یقینی سے منہ کھلا تھا "کہاں؟"

"اُدھر، میاندم میں ہے۔"

"میاندم" شہناز نے شدید حیرت سے دہرایا "آں......ارحم سے تو کچھ نہیں کہا ابھی؟"

"نہیں بی بی، ارحم خان سے تو ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

"ہاں ٹھیک...... کہنا بھی مت۔" شہناز کا دماغ میاندم کی بازگشت سے گونجنے لگا تھا۔

☆☆☆

آج مومن اور تحریم کی شادی تھی نکاح ہو چکا تھا۔ رخصتی میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ کھانا بھی کھایا جا چکا تھا۔ تحریم دلہن بنی اسٹیج پر بیٹھی تھی۔ دوست احباب تحائف لیے مدرت اور تحریم کو مبارک باد دینے اسٹیج پر پہنچ رہے تھے۔ وسیلہ نے مومن بھیا کی کال آنے پر اپنا دوپٹہ پھیلا کر اوڑھا اور زنانہ ہال کے دروازے سے باہر نکلی۔ مردانہ ہال کا دروازہ ساتھ والا ہی تھا اور سامنے پارکنگ تھی۔ جہاں نیم تاریکی سی تھی لیکن وسیلہ نے منصب کو پہچان لیا تھا۔ وہ اپنی جیپ کے بونٹ سے لگا بالکل اکیلا کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر وسیلہ کو اپنا کام بھی بھول گیا۔ فوراً ہی

دو قدموں میں وہ منصب تک پہنچی۔

''آپ یہاں باہر کیوں کھڑے ہیں۔ اندر مردانہ ہال میں چلے جاتے۔''

''جی میں ابھی اندر سے ہی آیا ہوں۔ رمشہ کو کال ملا رہا ہوں بلانے کے لیے لیکن وہ پک نہیں کر رہی۔''

''اوہ اچھا۔'' وسیلہ ایک دم مسکرا دی۔

''اصل میں کل بھی آپ باہر سے چلے گئے تھے تو مجھے لگا آج بھی باہر رکے ہیں۔''

''اکچولی کل میں وردی میں تھا۔ میں نے سوچا آپ پہلے ہی پولیس والوں سے خائف رہتی ہیں، بہن کی شادی میں ایسا مہمان دیکھ کر تو پریشان ہی ہو جائیں گی۔''

منصب نے شگفتگی سے کہتے وسیلہ کی طرف دیکھا تو وہ کچھ عجیب سی نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''کیا ہوا......؟'' منصب کو پوچھنا پڑا۔

''آپ کو کیسے پتا کہ......''

''اوہ۔'' منصب ہنس دیا، واقعی وسیلہ اس کی اپروچ کی وجہ نہیں جانتی تھی۔ ''اب یقین آ گیا کہ اس روز وہ آپ ہی تھیں۔ بس مجھے پانچ پرسنٹ ہی شبہ تھا کہ شاید آپ وہ نہ ہوں۔''

''اس طوفانی رات کی صبح آپ بینکورہ بازار میں تھیں نا؟''

''جی جی ہم تحریم کی شادی کی شاپنگ ہی کرنے گئے تھے۔''

''میں اور رمشہ کپڑوں کی خریداری کر رہے تھے، پیچھے سے آپ یہ کہتی ہوئی گزریں کہ پولیس والے سے ٹکرانے سے اچھا ہے بندہ کسی چور کے ہتھے چڑھ جائے۔''

''اوہ......'' وسیلہ یاد آنے پر بے ساختہ ہنسی تو کچھ دیر ہنستی ہی رہی ''واقعی، جگہ ماحول دیکھے بنا بولنا بھی بندے کو نقصان پہنچاتا ہے۔''

''میں نے بس آپ کا انگوری اور ٹیڑا دوپٹہ دیکھا اور چہرے کی ہلکی سی جھلک۔ لیکن شام کو دریا کنارے جب اسی دوپٹے میں آپ اس بچے کو لپیٹے کھڑی تھیں تو مجھے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔''

''مطلب، میں پولیس والوں پر اعتراض کر رہی تھی اور وہ اتفاق سے میرے قریب کھڑا تھا۔''

''جی، اتفاق سے۔'' منصب نے معنی خیزی سے پھر اتفاق پر زور دیا اور وسیلہ اس پر زیادہ زور سے ہنس دی۔

''اتفاقات کچھ زیادہ نہیں ہو گئے۔''

''ہوں......اور ڈھیر سارے اتفاقات میں یہ آج پہلی غیر اتفاقی ملاقات ہے۔''

''جی'' وہ بس یہی کہہ سکی۔

''امید اور دعا کرتا ہوں کہ یہ پہلی غیر اتفاقی ملاقات، آغاز ثابت ہو گی، ڈھیروں ڈھیر مزید ملاقاتوں کا۔ ان شاءاللہ۔'' منصب سنجیدگی اور اعتماد سے کہتے ہوئے ایک جانب چل پڑا۔ وسیلہ نے حیرت سے اس کی پشت کو دیکھا تو سامنے سے رمشہ بھائی کی جانب آتی دکھائی دی۔ وسیلہ بھی اس آخری جملے کے اثر سے خود کو باہر نکالتے ہوئے مسکرا کر رمشہ کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

''سو بھی جائیں امی......'' وسیلہ اپنے لیے کافی بنا کر کمرے میں جا رہی تھی جب امی کو گم صم بیٹھے دیکھا تو اندر آ گئی۔

''نیند ہی نہیں آ رہی۔''

''نیند کیوں نہیں آ رہی۔ اتنے دنوں کی تھکاوٹ کے بعد تو خوب سارا آرام بنتا ہے۔''

''اب آرام کہاں۔'' رضوانہ نے تھکی تھکی آہ بھری۔ ''یہ تو ذمہ داری کا بوجھ اتار دینے کے بعد پتا چلتا ہے کہ ذمہ داریاں تو شروع ہی اب ہوئی ہیں۔ جب بیٹیاں ماں باپ کے گھر ہوتی ہیں، تب تو ان کے کوئی مسائل ہی نہیں ہوتے۔''

''ہاں، صحیح بات ہے، لیکن آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ تحریم کا معاملہ تو سب کے سامنے ہیں۔

آپ کو کیا لگتا ہے تحریم اور ندرت ممانی روایتی ساس بہو بننے والی ہیں؟" وسیلہ نے مسکرا کر ماں کو دیکھا تو وہ بھی ہنس دیں۔

"بالکل نہیں۔ ندرت میں اتنا دم کہاں، حالانکہ تحریم اپنی حرکتوں سے روزانہ کی بنیاد پر اسے اکسائے گی کہ وہ مجبوراً ساس بن جائے لیکن پھر بھی وہ دن آئے گا نہیں۔" رضوانہ نے شگفتگی سے کہنا شروع کیا اور وسیلہ نے مسکراتے ہوئے انہیں بولنے دیا۔

"تو پھر آپ بھی اچھی اچھی باتیں سوچیں۔ سب خیریت رہے گی ان شاء اللہ۔"

"آج تمہارے بابا کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ میں۔" وہ بات پوری نہ کر سکیں ایک دم ہی رونا شروع ہو گئیں۔ وسیلہ نرمی اور محبت سے ماں کا بازو سہلاتی رہی، ان کا اگر دل بھر آیا تھا تو انہیں رو لینا چاہیے تھا۔

"آج تحریم کو رخصت کیا ہے، کل تمہاری پھر ایلیا کی باری آجائے گی۔ پتا نہیں آج کیوں بہت شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ اللہ پاک نے مجھے بھی ایک بیٹا عطا کیا ہوتا۔"

"اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی اور آپ نے تو کبھی بیٹے کا شکوہ نہیں کیا پھر۔"

"شکوہ اب بھی نہیں کر رہی۔" رضوانہ نے آنکھیں صاف کیں، "اور یہ تو اللہ پاک کی تقسیم ہے شکوہ کیسا۔ پھر اتنا آگے کی باتیں بھی کیا کرنا، پتا نہیں تم تینوں کی ذمہ داری پوری کرنے کی مہلت۔"

"ایسا نہ کہیں۔" وسیلہ نے ان کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ کہا نا آپ سے، اچھا اچھا سوچیں۔ اور ہماری شادیوں کے متعلق ابھی سے ہلکان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے اپنی اسٹڈی کمپلیٹ کرنے دیں۔ مستقبل کے تصور ہی کرنے ہیں تو مجھے ایڈووکیٹ وسیلہ جمال کے روپ میں دیکھا کریں، پھر ایلیا بھی کتنی لائق ہے اسٹڈیز میں، ضرور کچھ بن کر دکھائے گی آپ کو، ان شاء اللہ۔"

"مدر ٹریسا بنے گی وہ تو۔" رضوانہ نے منہ بنا کر جیسے شکوہ اندر سے نکالا اور وسیلہ کا بے ساختہ قہقہہ اُبلا۔

"پھر ایسا کیا کر دیا اس نے......؟"

"لگتا ہے تم پچھلے حصے میں نہیں گئیں"......

"پچھلے حصے میں ...... وسیلہ نے حیرت سے دہرایا "نہیں، میرا اُدھر جانا نہیں ہوا، کیوں؟......"

"ادھر میرج ہال کی پارکنگ سے کتے کے تین پلے اٹھا لائی ہے۔" رضوانہ نے سخت خفگی سے بتایا۔

"کتے کے پلے، وہ بھی میرج ہال کی پارکنگ سے؟" وسیلہ کو یقین نہیں آیا۔

"کہتی ہے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے۔ گاڑی میں تحریم کے جوتوں کا خالی ڈبا پڑا تھا۔ اس نے تینوں کو اس میں ٹھونسا اور گاڑی میں رکھ دیا۔ مومن دلہن کے بیٹھنے کے لیے جگہ کرنے لگا تو ڈبے سے نکل کر وہ اچھل کود مچائی ان پلوں نے۔ تحریم دلہن بنی الگ ناچ رہی تھی، مومن کھا جانے والی نظروں سے ایلا کو گھور رہا تھا اور وہ تھی کہ ایک ایک کو پکڑ کر قابو میں کر رہی تھی۔" رضوانہ نے تفصیل سے بتانا شروع کیا تو وہ ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی۔

"حیرت ہے تم نے یہ سارا منظر نہیں دیکھا۔"

"میں اُدھر دوسرے گیٹ پر مہمانوں کو رخصت کرنے میں لگی تھی۔ ندرت مامی نے ذمے لگایا تھا۔"

"اچھا ہاں وسیلہ، وہ تمہارے نئے گیسٹ...... رمشہ اور اس کا بھائی......"

"جی جی...." وسیلہ کا نجانے کیوں دل عجیب طرح سے دھڑکا۔

"لڑکی تو بہت اچھی ہے رمشہ، لیکن اس کا بھائی۔"

"جی......؟" وسیلہ کی آنکھوں میں تعجب تو دل میں نہ سمجھ آنے والے خدشے لہریں لینے لگے۔ امی کو منصب اچھا نہیں لگا تھا، اور پتا نہیں کیوں، اس احساس نے وسیلہ کا اندر ہی اندر دل سہما دیا۔

"وہ..... وہ...... پولیس میں ہے؟" رضوانہ کی جھجک بھری آواز وسیلہ کے کانوں سے ٹکرائی تو اس نے بے حد چونک کر پہلے ماں کو دیکھا پھر "اوہ" کہہ کر ایک دم ہنس پڑی۔

"توبہ ہے امی، آپ اس کے پولیس میں

ہونے سے خائف ہیں۔"

"بس مجھے یہ پولیس والے اچھے نہیں لگتے۔ تمہیں پتا تو ہے......"

"جی میری ماں، مجھے پتا ہے کہ آپ بلاوجہ ان سے اتنا چڑتی ہیں کہ اپنے ساتھ ساتھ اپنی بیٹیوں میں بھی یہی بے زاری پوری طرح ڈال دی ہے۔" وسیلہ کو تب سے یہ سوچ بھی شرمندہ کیے جا رہی تھی کہ اس کے بیکورہ میں کہے الفاظ منصب نے سن لیے تھے۔

"ہر جگہ ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں امی، مجھ سے زیادہ بہتر آپ سمجھ سکتی ہیں۔ آپ کا تجربہ اور مشاہدہ مجھ سے زیادہ ہے۔"

"ہاں لیکن کوئی گارنٹی نہیں کہ اس کا تعلق اچھی قسم سے ہے۔" رضوانہ کا لہجہ ابھی تک بے یقینی لیے تھا، وسیلہ کو مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

"اچھا ابھی آپ ریسٹ کریں، صبح تحریم کے ناشتے کے لیے بھی جلدی اٹھنا ہوگا۔"

"ہاں، مجھے بھی اب نیند آرہی ہے۔ تم سے باتیں کر کے دباؤ کی کیفیت میں بہت کمی آئی ہے۔" رضوانہ نے پیار سے اس کا ہاتھ دبایا۔ وسیلہ نے جھک کر ان کا گال چوما۔ اور جاتے وقت کمرے کی لائٹ بھی آف کر دی۔

☆☆☆

پچھلی رات کی ہلکی بارش کے بعد وہ ملائم کی ایک چمکتی سی صبح تھی۔ مومن کی چھٹیوں کا بھی آج سے اختتام ہو رہا تھا۔ شادی کے لیے ہفتہ بھر کی چھٹیاں لی تھیں جو آج ختم ہو گئی تھیں لہٰذا آج سے کام کا دوبارہ آغاز تھا۔

"ریم...... اے ریم......" مومن نے گھڑی دیکھتے تحریم کا ہلکے سے کندھا ہلایا۔

"ہوں......"

"اٹھو نا یار...... نکلنا ہے مجھے......" اس نے جلدی سے پاؤں چپلوں میں ڈالے تھے۔

"آتی ہوں......" وہ کہہ کر پھر تکیے میں گم ہو گئی۔ مومن نے ایک نظر اسے دیکھتے گھڑی پہ دھیان دیا اور وارڈروب سے کپڑے نکالتے واش روم میں گھس گیا۔

"لیٹ تو نہیں ہو؟" ندرت نے سلیمہ سے کہہ کر ناشتہ باہر برآمدے کی میز پر دھوپ میں لگوا دیا۔ نومبر کا آغاز ہوا تھا۔ وادی سوات کی صبحیں ان دنوں خوب ٹھنڈی ہو گئی تھیں۔ دھوپ میں باہر بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔

"جی لیٹ نہیں ہوں اور ویسے بھی آج پہلا دن ہے، آرام سے جاؤں تو فرق نہیں پڑے گا۔" مومن نے کرسی گھسیٹی......

"ابو سو رہے ہیں؟"

"نہیں کافی دیر ہوئی جاگ گئے، چائے بھی پی چکے...... میری تو ساری رات وقفے وقفے سے آنکھ کھلتی رہی کہ مومن نے آفس جانا ہے۔"

ندرت مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں، مومن ان کی محبت پر مسکرا دیا لیکن اندر ہی اندر بے چینی سی محسوس کی۔ سلیمہ نے پراٹھے لا کر سامنے رکھے تو مومن نے انہیں روکا۔

"ذرا تحریم بی بی کو آواز دے دیں اماں۔"

"سونے دیتے۔" ندرت نے ٹوکا لیکن مومن کو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ سلیمہ نے دو تین بار ریم کو آواز دی تو وہ بادل نخواستہ اٹھ ہی گئی، مومن نے اسے رات ہی کہا تھا کہ کل سے وہ بھی جلدی اٹھ جایا کرے۔

"جی اماں آ رہی ہوں۔" اس نے ہرگز دل نہ چاہتے ہوئے بھی زبردستی خود کو دھکیلا اور جس وقت فریش ہو کر باہر آئی، مومن جانے کے لیے گاڑی کی چابی اٹھا چکا تھا۔ ایک خاموش نظر ریم پر ڈالی لیکن وہ منہ بسورتے کرسی پر ڈھے چکی تھی۔ توجہ بھی مومن کی جانب بالکل نہیں تھی۔

"مشکل ہوئی نا اٹھنے میں؟" ندرت نے پیار سے پوچھا تو وہ ان کے کندھے پر لڑھک گئی۔

"ہاں تو اور کیا امی۔ مومن نے ہی کہا صبح جلدی اٹھ جانا...... میں نے تھوڑی نا آفس جانا ہے۔"

"ہاں بھئی، کیا ضرورت ہے اس تردد کی۔" ندرت ہنستے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں

مومن نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ایک تو محترمہ اٹھی لیٹ تھیں۔دوسرے امی کو یہ بھی بتا دیا کہ اس کے مجبور کرنے پر جاگی ہیں۔حد ہے یعنی بے وقوفی کی۔امی اس کے اٹھ جانے پر ہی حیرت آمیز خوشی کا شکار دکھائی دے رہی تھیں۔ریم بیگم نے وہ خوشی بھی مکمل کر محسوس نہیں کرنے دی۔

"فائدہ ویسے مجھے بھی کوئی نہیں ہوا، ایسے جاگنے پر...... جائیں دوبارہ آرام فرمائیں۔" اس نے موبائل بھی اٹھایا اور پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

"جاؤ، گیٹ کے باہر تک چھوڑ آؤ ریم، برا مان گیا ہے۔" ندرت نے تحریم کا گال تھپتھپا کر ہوشیار کیا تو وہ جمائیوں پر بمشکل قابو پاتے پورچ میں آ گئی۔پنک ڈریس میں کھلے ہلکے گیلے بالوں کے ساتھ وہ سادہ چہرا اسے پیارا تو بہت لگ رہا تھا لیکن مومن اس وقت "حسن بے پرواہ" سے ہی عاجز تھا۔ اسے ذمہ دار بیویاں پسند تھیں اور تحریم کے بچگانہ رویے کو دیکھتے ہوئے اس نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ شادی کے بعد وہ خود اس پر محنت کرے گا۔تب اسے یقین تھا کہ وہ اسے بدلنے میں کامیاب ہو جائے گا پر...... ذمہ دار بننے کی یہ پہلی صبح شادی کے ہفتے بھر بعد مومن کو اپنی پہلی ناکامی نظر آئی۔

"واپسی کب ہے مومن؟" وہ کھلے گیٹ کے باہر تک آ گئی تھی۔

"ایک بجے...... کیوں؟"

"تب تک کیا کروں گی۔سخت بوریت ہو گی مجھے۔" وہ کار کے کھلے شیشے پر جھکی۔

"تو امی کے ساتھ ہاتھ بٹاؤ۔آج لنچ میں مجھے تمہارے ہاتھ کا بنا کچھ کھانا ہے۔" مومن نے ذمہ داری کے احساس کو ایک اور جانب موڑنے کی کوشش کی لیکن سامنا ریم کے بندھے ہاتھوں سے ہوا۔

"کوکنگ کی فرمائش غلطی سے بھی مت کرنا مومن۔یہ دیکھو مجھے پسینے چھوٹنے لگے۔" اس نے معصومیت سے مومن کا ہاتھ اپنے ماتھے پر رکھ دیا اور وہ بنا تبصرہ کیے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا لے گیا۔

تو یہ ہوتی ہے شادی؟ وہ کار کو ڈھلان سے اتارتے ہوئے ایک دم سنجیدہ تھا...... سات روزہ تجربے کا نچوڑ کچھ ایسا خوش کن تو نہیں تھا۔جانے لوگ سات جنموں کے وعدے کیسے کر لیتے ہیں۔

☆☆☆

"تم نے پھر دوستوں کے ساتھ جانے کا پروگرام بنا لیا؟" شہناز کو ارحم کی آنیوں جانیوں سے سخت شکوے تھے۔جتنا وہ چاہتی تھی کہ باپ کے بعد ارحم حویلی کے معاملات کو سنجیدگی سے لے، اتنا ہی وہ غیر سنجیدہ اور غیر ذمے دار نکلا تھا۔اس کے نزدیک ماں ہر معاملے کو اس کے بابا سے بھی زیادہ سمجھداری سے دیکھ لیا کرتی ہے۔

"دوستوں کے ساتھ نہیں، اس بار اکیلے جا رہا ہوں۔" ارحم مسکرایا تو ہنسی میں شرارت اور معنی خیزی چھپی تھی۔شہناز نے اچنبھے سے دیکھا۔

"اکیلے...... کیوں، کیا ارادے ہیں ارحم۔جبکہ میں تمہیں منع کر چکی ہوں۔"

"آپ کو میری یک طرفہ پسندیدگی پر اعتراض تھا نا، سوچا دو طرفہ انڈر اسٹینڈنگ بنا کر دیکھتے ہیں تب شاید آپ کا دل پگھلے۔"

وہ ہنوز مسکرا رہا تھا۔شہناز کے دماغ میں غصے کا ابال آنے لگا۔لیکن پھر اسے لگا کہ پچھلے کچھ دنوں سے وہ جس گتھی کو اکیلے ہی اکیلے سلجھانے میں کوشاں ہے، شاید اس کے سلجھنے کا وقت آ گیا ہے۔ذہن و دل نے اچانک ایک بڑی چھلانگ لگانے کا مصمم ارادہ کیا اور شہناز نے ایک گہری سانس چھوڑتے خود کو بولنے کے لیے تیار کیا۔

"کیا تم باوجود میرے انکار کے بضد ہو؟"

"میری کوشش صرف آپ کو قائل کرنے کی ہے، آپ جانتی ہیں۔" وہ بھی اس مرتبہ پورا سنجیدہ ہوا۔

"قائل تو تم مجھے نہیں کر سکتے، کہ یہ جگہ میری من پسند بالکل نہیں...... ہاں ایک ڈیل ضرور ہو سکتی ہے ہمارے بیچ۔"

"ڈیل...... مطلب؟" ارحم پہلی مرتبہ کچھ چونکا۔

"اگر تم میرا ایک کام کردو تو میری طرف سے تمہیں مکمل اجازت ہے وہاں شادی کرنے کی جہاں تم چاہتے ہو۔"

"یعنی اُس سے شادی کرنے کے لیے مجھے آپ کا ایک کام کرنا ہوگا؟" ارحم نے ایک بار پھر سمجھنے کی کوشش کی۔

"ہاں، بالکل میں نے یہی کہا۔"

"تو مجھے بنا آپ کو سنے قبول ہے۔ آپ کا کام جیسا بھی اور جس بھی نوعیت کا ہوا میں کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن فی الحال مجھے نہ روکیں۔ ابھی میرا جانا بہت ضروری ہے۔"

"اوکے، کوئی بات نہیں۔ تم جتنا چاہے وقت لے لو۔ میں نے اپنے کام کے لیے جتنا انتظار اب تک کیا ہے، یہ چھوٹا سا انتظار اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔" شہناز کی مبہم ہنسی میں نئے نئے پلتے کچھ خطرناک عزائم کی پراسرار چمک تھی۔ اسے اس "ہاں" کے بعد بہت کچھ سوچنا، بہت کچھ طے کرنا اور بہت کچھ ترتیب دینا تھا۔ اس لیے ارحم کا وقت لینا اسے گراں نہیں گزرا تھا۔

☆☆☆

"صاحب" کانسٹیبل امین کی آواز پر منصب نے چونک کر سر گھمایا۔ پانچ بجے ڈیوٹی آف ہونے پر وہ آفس سے نکل کر جیپ کی طرف بڑھا تو کانسٹیبل دوڑتا ہوا پیچھے آیا۔

"بولو امین...... خیریت؟ بڑے صاحب کی کال آگئی کیا؟"

"جی سر! وہ کہہ رہے تھے کہ کل صبح اپنے اِدھر کے جج ہیں نا، احسان اللہ صاحب۔ ان کے ساتھ مدین تک جانا ہے، ایک قبر کشائی کا معاملہ ہے۔ کہہ رہے تھے دو کانسٹیبل بھی ساتھ ہوں۔"

"ہوں، صحیح۔ صبح میں جلدی آجاؤں گا۔"

منصب نے معلومات لے کر جیپ اسٹارٹ کی اور ڈھلان سے اتار کے سڑک پر آیا۔ جیپ کا رخ اترتے کے ساتھ ہی ہمیشہ کی طرح اس جانب تھا جہاں سامنے وسیلہ کا گھر دکھائی دیتا۔ منصب نے رک کر مسکرا کر ہر روز کی طرح حساب کیا۔ دو ماہ ہونے والے تھے۔ اسے میانڈم آئے، دونوں کو ایک دوسرے سے ملے اور بس چند ہی دنوں میں اس کی بہن کی شادی والی آخری ملاقات ہوئے...... پھر معلوم نہیں اس کے بعد اتنی طویل بریک کیوں آگئی تھی۔ آفس کے اس کے گھر کے اس قدر قریب ہونے کے باوجود وہ کبھی دکھائی تک نہ دی تھی۔

طے شدہ ملاقات ہمیں راس نہیں آئی وسیلہ جی، ایک بار پھر کہیں اتفاق سے ہی دکھائی دے جائیں۔ اس نے اپنے آپ میں بڑبڑاتے مسکرا کر کہا اور جیپ کا رخ اپنے گھر کی جانب موڑا۔ وہ چہرا جسے دیکھنے کی خواہش اندر ہی اندر آس امید سے کب انتظار میں ڈھل گئی تھی پتا ہی نہیں چلا۔

میمونہ کی کال آرہی تھی۔

"ہاں جی میڈم...... مل گئی فرصت؟" منصب نے موبائل گود میں ہی رہنے دیا اور ہینڈز فری کا ایک سرا دائیں کان میں پھنسالیا۔

"گھر پہنچ گئے تم؟"

"نہیں بس کچھ دیر میں پہنچا سمجھو......"

"تو آرام سے کرلوں...... دوبارہ؟"

"ارے نہیں، میں کمفرٹ ایبل ہوں۔ بس پانچ منٹ باقی ہیں، سناؤ، کیا حال ہیں تم سب کے۔"

"سب ٹھیک، شکر ہے۔ رمشہ سے تو روزانہ بات ہوجاتی ہے، تم ہی فری نہیں ملتے۔"

"تو اب آ ہی جاؤ...... ملنا ملانا، گھومنا پھرنا سب کرلیں گے۔"

"ہاں بس اسکولوں کی چھٹیاں تو چل رہی ہیں، پر انیس کچھ کنسٹرکشن کے کام میں بزی رہے۔ اب فری ہوگئے ہیں تو کہہ رہے تھے، ہفتہ دس دن کے لیے چھوڑ آؤں گا تمہیں۔"

"ہفتہ دس دن بھی کم ہیں...... پندرہ بیس دن تو رہو۔"

"چلو دیکھیں گے ان شاء اللہ۔ لیکن ابھی کچھ

دن ہیں، میں بتاؤں گی تمہیں۔"

"ہاں اوکے......اور سنو، دادی کے پاس ہو آیا کرو کبھی کبھار...... میں ان سے فون پر بات نہیں کرسکتا، انہیں میرا حال احوال دے آیا کرو۔"

"ہاں میری ایک بار ملاقات ہوئی تھی۔ میری نند کے ہاں ختم قرآن شریف تھا تو دادی سے وہیں ملاقات ہوئی تھی، تمہیں بہت یاد کر رہی تھیں۔"

"تم خود بھی ملنے جا سکتی ہو، خوش ہو جائیں گی۔ ہو آنا۔"

"ہاں، جلد کوشش کروں گی۔"

"اوکے، شہیر کو پیار دینا۔ بائے"

"اوکے، تم بھی اپنا خیال رکھنا، بائے۔"

☆☆☆

"ارے ارے تم کچن میں کیا کر رہی ہو...... سلیمہ کہاں ہے...... مجھے بتایا ہوتا۔" ندرت کی بوکھلائی ہوئی سی آوازیں کچن سے آرہی تھیں۔ مومن نے ایک نظر باپ کی طرف دیکھا، انہوں نے بھی ہلکا سا سر گھمایا تھا، ہاتھ سے اشارہ بھی کیا کہ پتا کرو کون گھس گیا کچن میں۔

"خود ہی سمجھ جایا کریں۔" مومن نے بجائے اٹھنے کے بےزاری سے کہا۔ "کچن میں وہ گھسی ہیں جنہیں بیڈ سے ایک بھی قدم نیچے نہ رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے۔" "ایک تو مجھے سمجھ میں نہیں آتا، وہ عورتیں کیا خلائی مخلوق ہوتی ہیں جو ایسی حالت میں بھرا پرا گھر سنبھالتی ہیں، ناشتے سے سونے تک گھر کا ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتی ہیں۔ کسی کو مددگار نہ پاکر بوجھ بھی خود اٹھالیتی ہیں، پہاڑوں پر بکریاں چرا آتی ہیں۔ کنوؤں سے پانی بھر آتی ہیں، مال مویشیوں کی خدمت کرتی ہیں۔"

"ہاہاہا......" توفیق احمد نے مزا لیتے بھرپور قہقہہ لگایا "ایسے......ہی دل جلے...... ہوتے ہیں...... بیٹا، جن کی...... لمبی لمبی...... تقریریں...... بس ایک...... نکاح کے سائن سے...... ان کے منہ پہ...... ماردی جاتی ہیں۔" انہوں نے آرام آرام سے اپنا جملہ پورا کیا۔ فالج نے توفیق احمد کی دونوں ٹانگوں اور ایک بازو کو کندھے تک متاثر کیا تھا۔ بات چیت وہ اب آہستہ روی سے مکمل کرلیا کرتے تھے۔

"بس آپ رہ گئے تھے اب......" مومن جھینپ کر خود بھی ہنس پڑا۔ امی تحریم کا بازو تھام کر اسے کچن سے باہر لارہی تھیں۔ تحریم نے ماموں کو لاؤنج میں بیٹھے دیکھا تو ندرت ممانی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہتے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ندرت وہیں بیٹھ گئیں۔

"بھئی اب...... چلنے پھرنے سے تو منع مت کرو...... خدانخواستہ بیمار نہیں ہے وہ۔" توفیق احمد نے مومن کا پیغام ذرا اپنے ڈھنگ سے دینے کی کوشش کی۔

"ہاں، خیر وہ تو ہے، لیکن صبح سویرے خالی پیٹ چکر آنے کا ڈر ہوتا ہے، میں تو اس لیے منع کر رہی تھی۔"

"اوکے میں نکلتا ہوں۔ پھوپھو نے بلایا ہے کسی کام سے، پہلے ادھر جاتا ہوں، پھر وہیں سے نکل جاؤں گا۔" مومن اپنا ضروری سامان اٹھائے باہر نکل آیا۔ دسمبر اواخر کی وہ نسبتاً ایک زیادہ سرد صبح تھی۔ تحریم کو خوش خبری سنائے بھی ایک ماہ ہو چکا تھا۔ گھر میں اس کے ناز اٹھائے جانا یوں تو فطری سی بات تھی کیونکہ ایک تو مومن خود منتوں مرادوں کے بعد کی اکلوتی اولاد تھا دوسرے شادی بھی کچھ لیٹ ہو پائی تھی۔ اسی لیے تحریم کی طرف سے اتنے جلدی گڈ نیوز کا آنا ندرت کے لیے بہت حیرت آمیز خوشی کا باعث تھا۔

"السلام السلام مومن بھائی......" وہ اپنی ملی جلی سوچوں میں دوسرے گھر کے لاؤنج میں داخل ہوا تو سامنا وسیلہ کی پرجوش مسکراہٹ نے ہوا۔

"وعلیکم السلام ...... واہ بھئی آج تو صبح صبح کتاب...... اللہ خیر......" وہ بھی بشاشت سے مسکرایا۔ وسیلہ کتاب ہاتھ میں لیے چہل قدمی کرکے پڑھائی کر رہی تھی۔

"جی بھیا.....امی کہتی ہیں نئے سال میں اپنی وکالت کا باقاعدہ آغاز کردوں۔"

"آف کورس.....کرسکتی ہو.....بس اب اور نہ ٹائم ضائع کرنا۔ اچھا پھوپھو کہاں ہیں، میں نے پھر نکلنا ہے۔"

"امی تو اپنے کمرے میں ہیں، اصل میں مجھے ہی مشورہ چاہیے تھا آپ کا..... پوچھنا تھا یہیں میانوالی میں کوئی وکیل یا جج ایسا مل سکتا ہے جس سے تھوڑی مدد لے سکوں؟"

"اوکے، میں پتا کرتا ہوں۔"

مومن تھوڑی دیر وسیلہ سے اس کی پڑھائی کے متعلق بات کر کے باہر نکل آیا۔ اپنی گاڑی اس نے گیٹ کے باہر کھڑی کی تھی۔ وہ باہر آیا تو اپنی گاڑی کے پیچھے ایک کار کو منتظر پایا، وہ حیرت سے دیکھتا گھوم کر پیچھے آیا تو دوسری کار میں ایلیا کو بیٹھے دیکھا۔

"تم.....؟" مومن نے دونوں ہاتھ کمر پہ رکھتے ہوئے اسے تفتیشی نظروں سے گھورا "تم کہاں سے آرہی ہو..... وہ بھی کار چلا کر..... تم نے ڈرائیونگ کب سیکھی.....؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ آواز میں غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ ایلیا نے خیالوں میں ماتھا پیٹا۔ کچھ دیر بعد یہاں نہیں آسکتی تھی۔ چنگیز خان کا نزول بھی ابھی ہونا تھا۔

"سیکھ رہی ہوں، وسیلہ سے....."

"وسیلہ تو اندر ہے اور....."

"بھئی بہت دنوں سے سیکھ رہی تھی، اب آگیا ہے کار چلانا۔" وہ اکتائی ہوئی لگ رہی تھی۔

"عمر کتنی ہے تمہاری؟" اس نے ہاتھ کمر سے نہیں ہٹائے تھے۔ وہ ٹلنے کے موڈ میں ہرگز نہیں تھا۔

"سترہ.....نہیں ساڑھے سترہ.....بس کچھ ہی مہینوں میں تو....."

"چپ....." مومن نے انگلی اپنے ہونٹوں پہ رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا "فی الحال اندر جاؤ اور آئندہ تمہیں بنا کسی کی سپرویژن کے کار چلاتے نہ دیکھوں۔"

"جی۔" ایک جبری سعادت مندی بمشکل اپنے چہرے پہ لاتے ہوئے اس نے کار دوبارہ اسٹارٹ کی۔ مومن نے اپنی کار میں چابی گھما کر اسے سائیڈ سے نکال لیا تھا۔ البتہ گاڑی اس کے قریب سے گزارتے رک کر بولنا بھی عین فرض تصور کیا۔

"ابھی اپنا پورا دھیان پڑھائی پہ رکھو، شناختی کارڈ بنانے کی عمر آئی نہیں اور چلی ہیں کار چلانے..... سمجھیں....." وہ اسے بری طرح جھاڑتے ہوئے کار نکال لے گیا اور وہ اپنی لانگ ڈرائیونگ کے ایسے ستیاناس ڈراپ سین پر سخت بوجھل دل لیے پورچ تک چلی گئی۔

"ہلاکو خان۔۔۔!" ایلیا کو چنگیز ذرا ہلکا سا لگا تھا۔

☆☆☆

"پلیز تشریف رکھیے"۔ تانیہ نے ہاتھ سے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ عیسیٰ خان کی عمر اٹھائیس تیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایک پڑھا لکھا بارعب اور پوش خاندانی لگ رہا تھا۔ سادہ سیاہ شلوار قمیض اس کی پرسنالٹی کو کچھ اور پراسرار اور دبنگ دکھا رہے تھے۔ سیاہ کالی مونچھیں، گندمی چہرا، کالے قدرے بڑھے ہوئے بال اور خصہ ور آنکھیں..... تانیہ نے خود کو ایک نیا کیس سننے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ کیا۔

"جی فرمائیے۔"

"میرا نام عیسیٰ احمد ہے۔ ہمارا گاؤں مرغزار کے راستے میں پڑتا ہے۔ مجھے دراصل اپنے چھوٹے بھائی کے متعلق کچھ ڈسکس کرنا ہے۔" سردار عیسیٰ پر اعتماد انداز میں کرسی سے ٹیک لگا کر دھیمے دھیمے بولنا شروع ہوئے۔

"جی جی، آپ بتاتے جائیں۔"

"سردار صہیب احمد میرے چھوٹے بھائی کا نام ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے سات سال چھوٹا ہے۔ یونی ورسٹی میں پڑھتا ہے۔ مزاجاً بہت جذباتی اور بے صبرا ہے۔ جو طے کرلے، چاہتا ہے پلک جھپکتے میں پورا کردیا جائے۔ بچپن سے ہی ضدی ہے۔ اس کی

بات مانے بغیر ہمارے پاس چارہ نہیں ہوتا۔ ذہنی طور پر زیادہ سمجھ دار بھی نہیں کہہ سکتے۔ بات اسے ذرا مشکل سے ہی سمجھ میں آتی ہے۔"

"ہوں صحیح۔" عیسیٰ کے ذرا دیر توقف کرنے پر تانیہ نے متانت سے سر ہلایا۔

"اس کی ایک کلاس فیلو ہے پریشے گل۔ میں نے ابھی تک دیکھا نہیں، لیکن صہیب کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت حسین ہے۔ اس کے یار دوستوں سے پتا چلا کہ پہلی نظر میں ہی دل ہار دیا تھا۔ قریب تین ماہ ہونے والے ہیں، لیکن صہیب کی دیوانگی کچھ سمجھ سے باہر ہے۔ اتنے سے عرصے میں ایسی گہری سنجیدگی۔ پھر لڑکی بھی ہرگز متوجہ نہیں۔"

"اوہ۔" تانیہ کے منہ سے بے اختیار نکلا تو عیسیٰ نے چونک کر اسے دیکھا، پھر کچھ دیر سوچا۔

"جی، سمجھ میں نہ آنے والی بات تو یہی ہے کہ کمٹ منٹ دوطرفہ نہیں ہے۔ پریشے نے پہلے دن سے صہیب کے اظہار کو بالکل کوئی اہمیت نہیں دی۔ لیکن باوجود اس سب کچھ کے، وہ پریشے کو اپنانے پر بضد ہے۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس پر گھٹن کے کچھ عجیب سے دورے پڑ رہے ہیں۔ کہتا ہے پریشے کے نہ ملنے کی بات وہ تصور میں بھی لانا نہیں چاہتا۔"

"ہوں۔ تو آپ کی فیملی کو اعتراض ہے اس معاملے میں کچھ۔"

"او نہیں۔" عیسیٰ کسی خیال سے چونکا۔ اس کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ "ہمیں بالکل کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہمارے لیے صہیب کی خوشی ہر چیز سے بڑھ کر اہم ہے۔ میں نے تو فوراً ہی پریشے کے متعلق تمام معلومات حاصل کیں اور والدہ کے ساتھ باقاعدہ رشتہ لے کر گیا کیونکہ صہیب کی طبیعت تو ہمیں سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دے رہی تھی، میری اماں الگ پریشان ہیں۔"

"اوہ صحیح..... میں سمجھ گئی..... پھر۔"

"جی بس جب وہاں گئے تو معلوم ہوا کہ پریشے بچپن ہی سے اپنے کزن سے منسوب ہے اور اس رشتے میں کسی قسم کے بگاڑ کا کوئی امکان ہی نہیں۔"

"لیکن صہیب پھر بھی سمجھنا نہیں چاہتا؟" تانیہ نے بات پوری کی تو عیسیٰ نے مایوسی سے سر ہلا دیا۔ تانیہ نے ایک گہرا سانس لیتے نظریں میز پر جمائیں۔

"میں بہت مایوس ہو کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، اس معاملے کا انجام کیا ہوگا۔"

"کیا اس مسئلے کا واقعی کوئی حل ہو سکتا ہے......؟ کوئی ایسا حل جو صہیب کی لائف کو پہلے جیسا بے فکرا کر دے۔" عیسیٰ کے خدشات میں بھائی کے لیے محبت اور ڈھیر ساری بے یقینی نظر آتی تھی۔

"کیا آپ کو لگتا ہے صہیب پر پریشے کے اثر کی وجہ اس کا حسن ہے؟" تانیہ نے سوال کیا۔

"جی..... مجھے تو بظاہر کوئی اور وجہ نظر نہیں آتی۔"

"اور پریشے کا گریز؟" تانیہ نے جاننے کے انداز میں عیسیٰ کو دیکھا تو وہ جیسے نا سمجھ آنے والے انداز میں تانیہ کو تکے ہی گیا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ......"

"جی۔" اس مرتبہ تانیہ نے قدرے اعتماد سے سر اٹھایا۔ "آپ بتا رہے تھے کہ صہیب کو انکار کرنا آپ کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اس کی بات مانے بنا چارہ نہیں ہوتا۔ تو مجھے لگتا ہے ایسے بچے "لاحاصل" کے معنی ہی نہیں جانتے۔ جنہیں بچپن سے ہر وہ چیز مہیا کر دی جائے جس کی انہوں نے خواہش کی، انہیں ہار، ناکامی، شکست جیسی حقیقتوں کو قبول کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔"

"آپ شاید صحیح کہہ رہی ہیں۔" عیسیٰ کے چہرے کی گہری سنجیدگی جیسے فکر میں بدلنے لگی۔ "لیکن ہم پھر بھی کچھ نہیں کر سکتے، وہ کسی کی منگیتر ہے۔"

"آپ مایوس نہ ہوں، ابھی آپ مجھے صہیب

کی عادات وغیرہ کی کچھ اور تفصیل بتایئے۔ ہم ان شاءاللہ مل کر کچھ حل ضرور تلاش کرلیں گے۔"

"ہوں...... میں آپ کو صہیب کی عادات واطوار کے متعلق مزید بھی بتاتا ہوں۔"

☆☆☆

"واہ منصب...... تمہارا شہر تو بہت پیارا ہے۔" میمونہ گھر کی چھت سے میانڈم میں شام اترتے دیکھ رہی تھی۔ ہر جانب سفید برف تھی اور نیلی پیلی خوابیدہ روشنیاں۔ میمونہ، اپنے شوہر انیس اور بیٹے شہیر کے ساتھ پانچ بجے میانڈم پہنچی تھی۔ انیس سفر کی تھکاوٹ اتارنے لیٹ گیا تھا۔ میمونہ نے شہیر کو بھی اس کے پاس لٹا دیا تھا۔ رمشہ نے کچن کا کام سنبھالا ہوا تھا۔ منصب، بہن کو لیے چھت پر آ گیا۔ انیس نے اگلے روز واپس چلے جانا تھا۔ وہ تھانہ کے ہائی اسکول میں استاد تھا۔ اسے اپنی ڈیوٹی پر واپس پہنچنا تھا۔ میمونہ اور شہیر نے البتہ آٹھ دس دن یہیں رہنا تھا۔ منصب اور رمشہ سے اس کی تقریباً چار ماہ بعد ملاقات ہو رہی تھی ۔ پہلے کبھی اتنی مدت کے لیے ایک دوسرے سے دور نہ رہے تھے۔ کچھ دن ان کے ساتھ گزارنے کے خیال سے وہ بہت پرجوش اور خوش تھی۔

"سنو میمونہ...... وہ تم سے رمشہ کے رشتے کی بات کی تھی۔" منصب نے چائے پینے کے دوران پوچھا۔

"ہاں، خیال میں تو ہوں۔ ایک دو لوگوں نے کہا بھی تھا لیکن دل کو لگا نہیں۔ باقی فکر نہ کرو، مجھے پورا یقین ہے اب تمہاری جاب لگ گئی ہے نا۔ ان شاءاللہ اچھے گھروں کے رشتے آئیں گے۔ حقیقت پسندی سے دیکھو تو ایسی باتیں اہمیت تو رکھتی ہیں۔ اور صرف رمشہ ہی کیوں۔" وہ شرارت سے کہتے مسکرا دی۔ "انیس اور میں سفر میں یہی بات کر رہے تھے کہ اب منصب کو بھی اپنا گھر بسا لینا چاہیے۔"

"ہاں لیکن میرے لیے رمشہ پہلے۔ پھر وہ ایک سال بڑی ہے مجھ سے۔"

"میرے خیال سے تو بھابی پہلے آنی چاہئیں۔ ورنہ رمشہ چلی گئی تو اکیلے تمہیں کرنا مشکل ہو جائے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں۔ پولیس کی ٹریننگ میں اکیلے رہنے کی عادت ہو چکی ہے۔"

"چلو، اللہ پاک خیر فرمائے۔ باقی پریشان نہ ہوا کرو، چھبیس کی ہوئی ہے ابھی۔ آج کل اسے اتنی عمر نہیں سمجھا جاتا۔"

"ہوں۔" منصب نے تائید کے انداز میں سر ہلایا۔

"انیس کو روک لیتیں دو تین روز...... ویک اینڈ پر آگے کالام سائیڈ سے ہو آتے ہیں۔"

"ہاں رمشہ نے بھی اس سے بہت کہا ہے لیکن بورڈ کی کلاسز ہیں۔ اکیڈمی والے بچوں کا زیادہ پرابلم تھا۔ وہ نہیں چھوڑ رہے تھے۔ باقی ہم تو جائیں گے نا ویک اینڈ پہ؟"

"ارے ہاں......" منصب ہنس دیا "ہفتہ کے روز نکل جائیں گے۔ اتوار کا دن آرام سے سیر کرو......"

"ہاں۔ صحیح۔ چلو اندر چلتے ہیں، یہاں تو سچ مچ بڑی ٹھنڈ ہے۔"

☆☆☆

"اسے سمجھاؤ رضوانہ آپی...... ایسی حالت میں کیا ضد لے کر بیٹھی ہے۔" ندرت نے نند کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تحریم تو آتے ہی صوفے پر لیٹ گئی تھی۔

"اب کیا ضد کر رہی ہو ریم...... تمہیں بھی ویسے آرام نہیں ہے۔" رضوانہ نے تو بات سننے سے پہلے ہی اسے ڈانٹنا شروع کر دیا۔

"گھومنے پھرنے کا ہی تو کہا ہے۔" ریم نے منہ بسورا۔ "جب سے شادی ہوئی ہے کہیں نکلے ہیں کیا۔"

"ہفتہ بھر ہی تو چھٹی ملی تھی بے چارے مومن کو، اور وہ ہفتہ تو ویسے بھی مہمانوں کی نذر ہو گیا تھا۔" پھر یہ نئی خبر...... اب شروع شروع میں تو احتیاط لازمی

ہے نا۔" رضوانہ کو پتا تھا کہ ندرت کے نہ ماننے کے پیچھے بھی یہی وجہ ہے۔

"ہاں پر اب تو تین ماہ ہو گئے۔ آپ ہی کہتی ہیں چوتھے سے سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔"

"تو مومن کو کون منائے گا۔ وہی تو انکار کر رہا ہے۔ کہتا ہے ایسی حالت میں سفر اچھا نہیں۔"

"بہانے ہیں نرے۔" ایلیا چپکے سے وسیلہ کے کان میں بڑبڑائی۔" اِدھر کہتے ہیں ریم کو بستر پہ کیوں سجا بٹھایا ہے، نارمل انداز میں سب کاموں میں حصہ لینے دیں"۔

"تم کیا بڑبڑ کر رہی ہو....." رضوانہ نے گھور کر دیکھا۔

"وہ..... میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ بس کالام تک ہو آتے ہیں، ایک ہی دن..... اتنا کہاں سفر ہے۔" ایلیا نے تحریم کی سائیڈ لی۔

"کیا کہتی ہیں آپی؟" ندرت جیسے نیم رضامند ہوئیں۔

"ہاں، بس کالام تک جانے میں تو کوئی حرج نہیں۔ ذہن کچھ فریش ہو جائے گا اس کا۔ ایسی حالت میں ذہنی دباؤ بھی تو اچھا نہیں، باقی مومن کو میں سمجھا لیتی ہوں۔ اسی سنڈے کو ہو آتے ہیں۔"

"بس ایک دن؟" ایلیا نے منہ بسورا۔" منہ اندھیرے اُٹھا دیں گے کہ نکلو، تاکہ شام سے پہلے واپسی ہو سکے۔"

"وسیلہ کیا کہتی ہے؟" ندرت نے وسیلہ کی رائے لی۔

"اگر دو کاروں میں جانا ہے..... تو میرا خیال ہے ہفتہ کے دن نکلتے ہیں۔ مجھے اور بھیا کو ریسٹ بھی مل جائے گا۔"

"ہاں یہی ٹھیک ہے۔" تحریم نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی" ایک دن کے جانے میں سوائے تھکاوٹ کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔"

"او کے، پھر مومن کو منانے کا کام بھی وسیلہ کا۔ اسی کی سنتا بھی ہے اور مانتا بھی۔" ندرت بھی قائل ہو ہی گئیں اور یہاں سب جانتے تھے کہ مومن کو وسیلہ کی سمجھ داری پر مکمل بھروسا ہوتا ہے۔

☆☆☆

"واؤ..... موسم کیا زبردست ہو گیا ہے؟"

رمشہ بیگ اٹھائے باہر نکلی تو ڈھلان کے کنارے رُک گئی۔ پچھلے روز تک یہاں تیز دھوپ نکل رہی تھی۔ پر آج کی بادلوں بھری صبح سفر کے آغاز میں ایک خوش آئند اضافہ تھی۔ منصب صبح دو گھنٹے کی ڈیوٹی دے کر ابھی واپس آیا تھا۔ دس بجے تک انہوں نے کھانے پکانے کا کچھ بندوبست کیا اور اب منصب کی جیپ میں چار لوگوں کا مختصر قافلہ کالام روانہ ہوا تھا۔ میمونہ اور رمشہ شہیر کو لیے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ میاندم سے کالام کا سفر چند ہی گھنٹوں کا تھا۔ خوب صورت موسم اور سفر کے حسین مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ اُس وقت مدین سے کچھ پہلے پہاڑوں سے آنے والے ایک چشمے کے قریب کھڑے تھے۔ میمونہ اور رمشہ شہیر کو اٹھائے سڑک پار کر کے پانی کے نزدیک جا چکی تھیں۔ چشمے کا پانی بھی زیادہ تر تو جما ہوا تھا، کہیں کہیں پتلی دھار کی صورت بہہ بھی رہا تھا۔ منصب نے سفر کی تھکان اتارنے کے لیے تھرماس سے چائے کا کپ نکالا۔ جیپ کے پیچھے سڑک کنارے کے پتھر پہ بیٹھ گیا۔ سڑک کنارے اور بھی کئی کاریں رُکی ہوئی تھیں۔ منصب کی نظر آتی جاتی ٹریفک پر تھی جب دو سفید کاریں یکے بعد دیگرے سامنے سے گزریں تو منصب کی نظر ٹھہر سی گئی۔ پچھلی کار کی ڈرائیونگ سیٹ پر اس نے بلاشک و شبہ وسیلہ کو دیکھا تھا۔ پیلی بارڈر والی چادر سر پر کیے ہلکی مسکراہٹ لیے وہ چہرا منصب کو بری طرح بے چین کر گیا تھا۔ دو ماہ بعد وہ بالکل اچانک بڑے ہی غیر متوقع طور پر سامنے آئی تھی۔ معلوم نہیں اس کی منزل بھی کالام تھی یا وہ کہیں اور جا رہی تھی۔ پتا نہیں آگے کہیں ملاقات ہو پائے گی یا نہیں۔ اندر سے اٹھتے سوالوں نے اُسے اتنا بے کل کیا کہ جب رمشہ اور میمونہ اسے بلانے آئیں تو اس

نے انہیں ہی واپس بلا لیا۔ اس کا اب کسی بات میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ آگے بڑھنے کی کشش اب شاید اسے کہیں رکنے پہ آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔

"کیا ہوا، اتنی پیاری جگہ تھی، رکے کیوں نہیں؟" میمونہ نے پوچھا۔

"یار، آگے اور بھی بہت پیاری جگہیں ہیں۔ یہاں میرا موڈ نہیں بنا۔" منصب نے مختصر جواب سے جان چھڑوائی۔

"کتنی دیر ہے اور...... کالام پہنچنے میں؟"

"شاید گھنٹہ بھر......" میمونہ کو جواب بھی رمشہ نے دیا۔ منصب کا دماغ کالام میں گردش کر رہا تھا۔

☆☆☆

دریائے سوات کے عین کنارے سے لگے اُس قدرے خطرناک اور خوب صورت ہوٹل کی وہ تیسری منزل تھی۔ اُن سب نے دو کمرے بک کروائے۔ ایک سادہ بیڈروم مومن اور تحریم کے لیے، جبکہ دوسرا فیملی روم اُن چار خواتین کے لیے۔ پانچ خواتین کے اس قافلے کا واحد سالار مومن ہی تھا۔ ندرت اور رضوانہ اپنے اپنے سنگل بیڈ میسر آتے ہی یوں لیٹ گئیں جیسے آئی ہی سونے ہوں۔ ایلیا اور وسیلہ کو البتہ سہ پہر اور شام بھی اچھی طرح استعمال کرنی تھی۔ انہوں نے فریش ہو کر کپڑے تبدیل کیے۔ دونوں امی اور ممانی کو سوتا چھوڑ کر باہر نکل آئیں۔ مومن اور تحریم کے باہر آنے تک تیسری منزل کے کھلے برآمدے اور ان سے دکھائی دیتے کالام کے حسین مناظر ہی لطف اندوز ہونے کو بہت کافی تھے۔ دیر تک فوٹو گرافی کے شغل میں مصروف رہنے کے بعد وہ دونوں برآمدے میں بچھی کین ووڈ کی کرسیوں پر آ بیٹھیں۔ دریائے سوات کا مسلسل شور جیسے کالام کی سیاحت کا ایک مستقل حصہ تھا۔ شدید ٹھنڈ اور برفباری کے دنوں میں یہاں کا پانی جم جاتا ہے اور ایسا بھی بہت کم کسی سال میں ہوتا ورنہ دریائے سوات یہاں سارا سال رواں دواں ہی رہتا

"یہ نیچے پل کیسا ہے آپی؟" ایلیا برآمدے کی ریلنگ پہ جھکی نیچے لکڑی اور رسیوں کے اُس پل کو دیکھ رہی تھی جو اِس کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے کے بجائے دریا کے بیچوں بیچ بنے ایک چھوٹے سے خشک قطعے تک جا رہا تھا۔

"لگتا ہے سیاحوں کی کشش کے لیے بنایا گیا ہے۔ دیکھو وہاں کیسے میر یا سا ہے نا؟"

"چلیں؟" ایلیا کی آنکھوں میں چمک تھی۔

"ہوں...... مزا تو آئے گا......" وسیلہ لب دبائے مسکرا رہی تھی اور کچھ سوچ رہی تھی "تصویریں تو بہت ہی اچھی بنیں گی ایلا تحریم کو بھی تصویریں دکھا کر سرپرائز دیں گے۔ چلیں؟" وسیلہ کی چمکتی آنکھوں میں شوخ سی چمک تھی۔

"او...... ایک منٹ۔" ایلیا کی نظریں نیچے پل کی طرف تھیں، جبکہ ہاتھ اس نے وسیلہ کی کلائی کی طرف بڑھایا "وہ دیکھو، رنگ میں بھنگ ڈالنے آ گئے۔"

"اوہ تو......" وسیلہ نے اس سے بھی زیادہ برا منہ بنایا۔ کیسے میریا سے لڑکوں کا ایک ٹولہ نکل کر پل کی طرف بڑھا تھا۔

"اِدھر تو بہت رش ہو گیا۔ میں تو بھئی بالکل آرام سکون کے ماحول میں جانا چاہتی ہوں۔"

"ہوں، ابھی کوئی فائدہ نہیں، چلو فی الحال ریم آپی کو کال ملاتے ہیں، مومن بھیا اگر سو گئے نا تو آج کی شام غارت ہو جائے گی۔"

"ہاں ملاؤ کال......" وسیلہ بھی ٹائم ضائع جانے کے حق میں نہ تھی۔

☆☆☆

"اچھا تو اس لیے اب تک بھوکی بیٹھی تھیں......" مومن نے کافی کا کپ لبوں سے لگاتے مسکرا کر تحریم کو دیکھا۔

شام کو تقریباً چھ بجے وہ وسیلہ، تحریم اور ایلیا کو لیے کالام کی سیر کو نکلا تھا۔ دریائے سوات کے کنارے سے ہوتے، اونچی نیچی جگہوں پر فوٹو گرافی

کرتے ذرا دیر بازار کی رونق کو دیکھتے وہ تقریباً دو گھنٹے بعد رات کا کھانا پیک کروا کے ہوٹل واپس لوٹے تو تحریم نے نہ تو خود کھانا کھایا اور نہ ہی اسے کھانے دیا۔ امی، پھوپھو اور وسیلہ ایلیا نے کمرے میں ڈنر کیا اور وہ مومن کو لیے اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ مومن کے ساتھ ایک بار اکیلے کہیں نکلے۔

"جی جناب...... بات اگر پیٹ بھرنے کی ہو تو کہیں بھی کچھ بھی کھایا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا ماحول اور ایسی فرصت تو روز روز میسر نہیں آتی نا۔" وہ ریسٹورنٹ کے ہلکی روشنیوں والے ماحول کو مرعوب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تو اُس معصوم کا کیا قصور...... جس کی بھوک بھوک کی دہائیاں ایک مجبور باپ کتنے گھنٹوں سے برداشت کر رہا ہے۔" مومن مسکرا کر بولا۔

"اوہ......" مومن بہت کم کبھی ایسی اپنائیت اور کنسرن کا اظہار کرتا تھا۔ وہ مومن کے ساتھ اکیلے نکلنے کے چکر میں واقعی بڑی دیر سے بھوکی تھی۔

"بڑی حیران ہو رہی ہو......؟" وہ کرسی سے ٹیک لگاتے اسی نرم لہجے میں مخاطب تھا "کیا میں باپ بن کر نہیں سوچ سکتا؟"

"جی ہاں، واقعی حیرت ہو رہی ہے، لیکن اس سے بھی بڑھ کر خوشی ہو رہی ہے۔ ماں تو ہر حال میں بچوں کا خیال رکھتی ہی ہے، باپ کیئرنگ ہو تو بہت انوکھی سی خوشی محسوس ہوتی ہے۔"

"اچھا......" مومن تعجب سے ہنسا۔

"بھئی ہمارے ہاں تو ماں باپ دونوں کو ایک جیسا پیار لٹاتے ہی دیکھا ہے۔"

"میں اِس سچویشن میں کہہ رہی ہوں جناب۔" تحریم کے سفید گال گلابی ہونے لگے۔ "یہ کیفیت تو صرف ماں اکیلے جھیلتی ہے نا، تو باپ کا صرف احساس کرنا بھی اس کی حساس طبیعت کو ظاہر کرتا ہے۔"

"ہمارے ہاں تو میرے اکلوتے پن کی وجہ سے بچوں کی بڑی قدر ہے۔"

"جی، بھی تو ندرت مامی نے ہم تینوں بہنوں کو اولاد جیسی محبت دی ہے۔"

"امی بہت خوش ہیں ریم...... تم نے محسوس کیا وہ آج کل کتنی کھلی کھلی ہو رہی ہیں۔"

"جی مومن...... مجھے اندازہ ہے، ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں...... اس روز کہہ رہی تھیں، میں جو انگلیوں پہ دنوں کا حساب رکھتی ہوں تو برا مت منایا کرو، میرے لیے انتظار واقعی بہت کٹھن ہو رہا ہے۔"

"اچھا......" مومن ہنس پڑا "دادی بننے کے لیے اُتاولی ہو رہی ہیں۔ ویسے فائدہ بہت ہے تمہیں، آرام سے بچہ ان کی گود میں ڈال کر سوتی رہو گی۔"

"ہاں نا تو اور کیا، مجھے تو اتنی نیند آتی ہے، مجھ سے تو رات وات کو بھی سنبھالا نہیں جائے گا۔"

"لاحول ولا قوۃ...... یہ تو ذرا پہلے بچے کا وقت ہے۔ تم آخر کرو گی کیا ریم۔" مومن نے باقاعدہ کانوں کو چھوا اور وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

"نیند...... نیند...... اور ڈھیر ساری پرسکون نیند۔"

☆☆☆

"اے ایلا...... نیچے بیچ تک آتی ہو؟" منہ اندھیرے وہ وسیلہ تھی جس نے ایلیا کے کان میں سرگوشی کی۔ رضوانہ اور ندرت تو صبح کی نماز پڑھ کر دوبارہ سو چکی تھیں، لیکن وسیلہ کو باوجود دیر تک لیٹے رہنے کے بھی نیند نہیں آئی تو کھڑکی سے آتی ہلکی روشنی دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ چپکے سے ایلیا کو جگانے کی کوشش کی، لیکن اس نے آنکھوں کو ذرا سا کھول کر وسیلہ کو دیکھا پھر ہونٹ سکوڑ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کروٹ بدل گئی۔ وسیلہ کا اپنا ارادہ باہر نکلنے کا بن چکا تھا اس لیے چینج کر کے چپکے سے باہر نکل آئی۔ مومن اور تحریم شاید آرام کر رہے تھے ان کا کمرہ بھی بند تھا۔

ان کا ہوٹل دریائے سوات کے عین کنارے پر تھا۔ آس پاس حسین مناظر کی بہتات ہونے کے

باعث ہوٹل کے چاروں جانب بھی کھلے برآمدے تھے۔ وسیلہ نے تیسری منزل سے نیچے دیکھا۔ ہوٹل کے بائیں ہاتھ تنگ ڈھلائی راستہ دریا کے بیچوں بیچ بنے اس چھوٹے سے آئی لینڈ کو جا رہا تھا جس پر بنے رسیوں بانس اور لکڑی کے تختوں والے پل نے پچھلی شام وسیلہ اور ایلیا کی بھرپور توجہ لی تھی۔ پل اس وقت مکمل خالی پڑا تھا۔ وسیلہ نے وہاں تک جا کر فوٹوگرافی کرنے کا سوچا اور سیڑھیاں اترتے نیچے آگئی۔ وسیلہ نے اپنی نیلی شال سر پر لیتے رخ پل کی طرف کیا۔ پل کے نیچے شور مچاتا شفاف دریائے سوات تھا، پل پر پاؤں رکھتے ہوئے وسیلہ کا دل تو دھڑکا پر لب ایک دلچسپ مہم سر کرنے کے خیال سے مسکرا اٹھے۔ اس کا دھیان مکمل اپنے پیروں اور سائیڈوں پر دکھائی دیتے دریا کی طرف تھا۔ سامنے اس نے نہ سر اٹھا کر دیکھا نہ اس جانب دھیان تھا۔ چونکی اس وقت جب اپنے پیروں سے بس دو فٹ آگے ایک براؤن چپل میں قید پیر دکھائی دیے۔ کوئی مرد بھی اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فوجی سبز رنگ کی شلوار قمیض سے اوپر آتی وسیلہ کی نگاہ چہرے پر رکی تو حیرت دوچند ہوگئی۔

"آ آپ...... یہاں؟" منصب کے یہاں کالام میں اس قدر قریب کہیں ہونے کی بات گمان میں بھی کہیں نہ تھی۔

"جی...... آپ کو وہاں سے دیکھا۔" اس نے ہاتھ سے اپنے پیچھے اشارہ کیا چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے نہ صرف نظر آگئی تھی بلکہ ایک بے حد پرسکون ماحول میں بالکل اکیلی اس کے روبرو تھی۔ پیچ ڈریس اور نیلے رنگ کی شال میں وہ کالام کی صحت بخش حسین صبح جیسی تروتازہ لگ رہی تھی۔

"آپ کالام کب آئے؟" وہ ایک دم متعجب تھی۔

"ہم بھی پچھلی شام پہنچے ہیں، ایکچوئلی آپ کو میں نے راستے میں دیکھا بھی تھا۔ آپ کار ڈرائیو کرتے ہوئے ہمارے قریب سے گزری تھیں۔"

"اوہ اچھا...... میری شاید نظر نہیں پڑی۔" وسیلہ بھی مسکرادی "ساتھ رمشہ ہے یا دوست وغیرہ؟"

"رمشہ اور میری بڑی سسٹر میمونہ، وہ تھانہ سے ملنے آئی ہوئی تھیں تو سوچا ویک اینڈ کا فائدہ اٹھایا جائے۔"

"او اچھا...... صحیح کیا۔" وسیلہ بلاوجہ ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ منصب سے سامنا ہونے کا اتفاق اسے کے لیے بھی بہت خوش آئند تھا لیکن خوشی ظاہر کرنے جیسا کوئی ربط ابھی درمیان میں قائم نہیں ہوا تھا۔

"ساتواں اتفاق...... ہوں؟؟" اس نے دریا کی جانب دیکھتے ہوئے بس سر اثبات میں ہلا دیا۔

"آپ سب کب تک ہیں یہاں؟"

"جی بس آج سیکنڈ ٹائم نکل جائیں گے۔" اس نے پھر ذرا کی ذرا سر اٹھایا۔

"او اچھا۔ ہمارا بھی یہی پروگرام ہے...... تو بیچ کا دن یہیں کالام میں؟"

"جی، ادھر ہی ہوں گے۔ اب اتنے سے ٹائم میں اور کہاں جا سکتے ہیں۔"

"گوڈاک......" منصب نے بے ساختہ کہا تو وسیلہ نے حیرت سے اُسے دیکھا۔

"گوڈاک...... کون سی جگہ ہے۔"

"پارک ہے...... بالکل قریب......" بہت پرسکون اور خوب صورت مضافاتی جگہ ہے۔ میں بھی بہنوں کو وہیں لے جا رہا ہوں۔ کالام کے رش سے بالکل ہٹ کر ہے، گاؤں کے خوب صورت مناظر ہیں۔ پارک سے گزرتا دریائے سوات...... اور ایک دم غیر آباد، خاموش، پرسکون مقام۔"

"اللہ آپ کتنی اچھی عکاسی کر لیتے ہیں۔" وسیلہ بے ساختہ ہنس دی "پولیس والے کا ایسا تخیل، واقعی خیال میں نہیں آ سکتا۔"

"لوگ ابھی تک پولیس والوں سے خائف ہیں...... ہوں؟" منصب کا انداز کچھ جاننے والا تھا۔ وسیلہ نے بیچ میں ہی سر نفی میں ہلاتے ہوئے ہنسنا شروع کر دیا۔

"واللہ، ایسا کچھ نہیں، پولیس والوں کے متعلق رائے بالکل بدل چکی ہے بلکہ۔" سنجیدگی سے منصب کو دیکھا "اصل میں مجھے پولیس والوں سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی، کیونکہ نہ تو کبھی واسطہ پڑا اور نہ ہی خدانخواستہ کوئی ناخوشگوار واقعہ..... لیکن معلوم نہیں کیوں میری امی پولیس والوں سے خائف..... بلکہ خوف زدہ رہتی ہیں۔ ان کی زبانی بچپن سے سن سن کر ایک امیج بن گیا تھا۔"

"اوہ....." منصب نے سر ہلایا "ہوسکتا ہے ان کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آیا ہو۔"

"جی، ہوسکتا ہے۔"

"آپ شاید آگے دوسری جانب جا رہی تھیں۔"

منصب تھوڑا سا سائیڈ کو ہوا، وہ اس کی راہ روک کر کھڑا تھا۔

"او نہیں۔ میرا زیادہ دور تک جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ ہوٹل سے اکیلی نکلی تھی تو اندر ہی اندر تھوڑا ڈر رہی تھی۔ وہاں اوپر ہمارے روم ہیں۔" اس نے وہیں پل سے اوپر اشارہ کیا لیکن اوپر اٹھی انگلی وہیں رُکی رہ گئی۔ اوپر بالکنی میں ایلیا کھڑی تھی، دیکھے جانے پر اس نے شوخی سے ہاتھ ہلا دیا تھا۔ وسیلہ البتہ بری طرح جھینپ گئی۔ اتنی دیر سے وہ منصب سے بلاوجہ بولے چلی جا رہی تھی۔

"ایلیا جاگ گئی ہے۔ میں چلتی ہوں۔" اس نے ہلکا سا ہاتھ ہلاتے ہوئے فوراً واپسی کی اور منصب اسے واپس جاتے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

"سونے کے لیے اپنا میانہ دم کیا برا تھا۔"

مومن کے ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے تھی اور ماتھے پر بل پڑے تھے۔ ندرت اور رضوانہ بیک وقت جھینپ کر اٹھ بیٹھیں۔

"اور کیا مومن بھائی..... یہ دونوں خواتین اگر گھر پہ آرام کرلیتیں تو ہمیں دو کاروں میں خوار نہ ہونا پڑتا۔ آپ کی کار میں ریم، ایلیا اور میں آپ کے ساتھ گھومنے آجاتے اور مجھے بھی ڈرائیونگ سے چھٹی مل جاتی۔" وسیلہ نے بھی بھرپور حمایت کی۔

"ارے بھئی نکلیں گے ہم دونوں بھی..... اب صبح صبح ذرا سستی لگ رہی تھی تو دل نہیں چاہا۔" ندرت نے چائے ڈالنے کے لیے تھرماس قریب کیا۔

"جانا کہاں ہے ویسے؟" ریم کو ہی خیال آیا۔

"تم سب ہی مل کر طے کرو کچھ..... بس زیادہ دور نہ ہو..... روشنی ختم ہونے سے پہلے واپسی کریں گے، تاکہ وسیلہ کو ڈرائیونگ میں پرابلم نہ ہو۔" مومن نے اپنا مدعا واضح الفاظ میں بتا دیا۔

"مومن بھائی، وہ میری ایک دوست بتا رہی تھی یہاں کوئی گوڈاک پارک ہے..... دریا کے کنارے۔"

"گوڈاک....." مومن نے ذہن پر زور دیتے دہرایا "میرا ایک کولیگ بھی شاید یہی نام لے رہا تھا۔ پوچھوں؟" اس نے تائید کے انداز میں وسیلہ کو دیکھا تو اس نے ہولے سے سر ہلا دیا، اندر ہی اندر تو وہ گھبرائی ہوئی تھی کیونکہ اسے منصب نے بتایا تھا۔ مومن نے البتہ اسی وقت کال کرکے اپنے ایک دوست سے معلومات حاصل کیں اور مسکراتے ہوئے وسیلہ کو دیکھا۔

"کہہ رہا ہے یہیں قریب ہی ہے۔ دریائے سوات کا بہت خوب صورت اور کسی قدر خطرناک ویو۔"

"واؤ"..... ایلیا نے بے ساختہ ایکسائٹمنٹ سے دونوں ہاتھوں کو آپس میں باندھا "مجھے ضرور دیکھنا ہے یہ خطرناک ویو۔"

"پتا تھا....." مومن نے نتھنے پھلا کر خفگی سے دیکھا "ہارر کے لفظ پر بچے ہی سب سے زیادہ اُچھلتے ہیں۔"

"اور پیش آنے پر سب سے پہلے دوڑیں بھی ان ہی بچوں کی لگتی ہیں۔" تحریم نے قہقہہ لگا کر شوہر کی تائید کی اور ایلیا کی مومن بھیا کو تو گھورنے کی ہمت نہیں ہوئی پر بہن کو ضرور شکوے بھری نظروں

سے دیکھا۔
"چلو پھر...... دیر کس بات کی...... جھٹ پٹ تیاری شروع کرو۔" مومن نے اٹھتے ہوئے ہاتھ تحریم کی طرف بڑھایا اور وہ بھی خود کو سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆☆☆

"واہ وسیلہ...... تمہاری دوست نے جگہ تو کیا خوب بتائی ہے۔"
ندرت ممانی نے ستائشی نظروں سے وسیلہ کو دیکھا اور وہ بس ہلکا سا مسکرا دی۔ دو چیزیں ایسی تھیں جو گوڈاک پارک کو ملک کے شاید باقی سب ہی عام پارکوں سے یکسر ممتاز کر رہی تھیں اور یقیناً یہی گوڈاک پارک کی خوبی تھی۔ پارک کے بائیں ہاتھ پر دریائے سوات جیسے عین سینے پر چڑھا چلا آ رہا تھا۔ یوں جیسے پارک کے اندر جبراً گھس آیا ہو۔ ایک طرف وہ چٹان سے ٹکرا رہا تھا اور دوسری جانب پارک بنا دیا گیا تھا۔ یہاں دریائے سوات چونکہ چوڑائی میں کچھ سست گیا تھا تب ہی اس کی گہرائی بھی زیادہ ہو گئی تھی اور یہی گہرا پن یہاں اس کی خوفناکی میں عجیب سے اضافے کا باعث بن رہا تھا۔
"پانی کے زیادہ قریب مت جانا کوئی......"
رضوانہ نے کہا۔ ایلیا کی نظر کنارے کے اس اونچے بڑے پتھر پر ٹکی تھیں جس پر بیٹھ کر وہ خوب ساری سیلفیز لینا چاہتی تھی۔
"یار وسیلہ آپی، مجھے یہاں بہت ساری تصویریں بنانی ہیں......" ایلیا نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔
"چپ رہو، سنا نہیں امی کیا کہہ رہی ہیں۔"
وسیلہ چٹائیاں لے کر پارک کے آخری کنارے کی طرف بڑھ گئی۔ وہاں دھوپ بھی اچھی تھی۔ کھانے پینے کا سامان انہوں نے راستے میں ہی لے لیا تھا۔ امی اور ندرت ممانی کو تو بس بیٹھنے کو ٹھکانہ چاہیے تھا۔ بہت دیر تک سب وہیں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے رہے۔ تحریم نے پانی کو قریب سے دیکھنے کی خواہش کی تو مومن ہی ماں کی ہدایت پر اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں تک چلا گیا۔
"چلو آپی...... پارک سے نکل چلتے ہیں۔"
مومن کی موجودگی میں تو اسے ہرگز دریا کے نزدیک نہیں جانا تھا۔ تبھی اس نے سوچا کہ پارک سے نکل کر وہ کہیں اور کوئی ویڈیو ڈھونڈے گی۔
"امی! ہم ذرا پارک سے باہر آس پاس کا علاقہ دیکھنے جا رہے ہیں۔" وسیلہ نے ایلیا کی ضد دیکھتے نرمی سے بات بتائی۔
"ہاں، خیال سے......" امی کی اجازت ملتے ہی دونوں باہر نکل آئیں۔ پرسکون سے اس خوبصورت علاقے میں دور دور تک کہیں کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک چھوٹے سے پل پر آ گئے۔ اس کے نیچے سے دریا کا پانی گزر رہا تھا۔ پل کراس کر کے وہ دونوں دوسری جانب آئیں تو اوپر پہاڑی جیسا ایک راستہ جا رہا تھا۔ ایک بچہ اپنے گدھے کو ہانکتے ہوئے اوپر چڑھ رہا تھا۔ وسیلہ نے مسکرا کر ایلیا کو دیکھا۔
"آج تو میں یہاں ایسی انوکھی ویڈیوز بنا کر جاؤں گی کہ کالام کا ایسا ویو کسی ڈاکومینٹری میں بھی کسی نے نہ دیکھا ہوگا۔" ایلیا اس وقت واقعی بچوں کی طرح اچھل رہی تھی۔
"سب مومن بھیا سے دوری کا اثر ہے...... لگتا ہے مجھے ہی مومن بھیا بننا پڑے گا۔" وسیلہ ہنستے ہوئے اسے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کر رہی تھی۔
"کوشش بھی نہ کریں اُن موچھڑ جیسا بننے کی......" ایلیا بہت غصے میں انہیں موچھڑ ہی کہا کرتی۔
"مجھے بھی اس پہاڑی راستے پر چڑھنا ہے آپی...... یہاں سے اس گاؤں کا نظارہ کتنا خوب صورت ہوگا۔ وہاں سے بہت کچھ ایسا دیکھنے کو ملے گا جو ہم یہاں سے نہیں دیکھ سکتے۔" وہ گدھے والے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باقاعدہ آگے بھی بڑھ گئی۔ لامحالہ وسیلہ بھی کندھے اچکا کر اس کے پیچھے

چل دی۔ کھلی کھلی دھوپ جسم کو سکون آور حرارت بخش رہی تھی۔ وسیلہ نے نہایت اچھے موڈ میں موبائل آن کر کے خود بھی تصویریں بنانا شروع کیں۔ ایلیا نے ایک دوبار سامنے سے روک کر اس کی تصویریں بھی بنائیں۔

"کلر ویسے آپ نے بہت پیارا پہنا ہے آپی...... بہت اسمارٹ ہیں آپ...... سبزے کی مناسبت سے کیا زبردست لگ رہا ہے آپ پر یہ کاسنی رنگ...... کاش مجھے بھی تھوڑی عقل آجاتی...... اب یہ کیا براؤن رنگ پہننے کا دن تھا۔" اسے اپنی چوائس اب بہت خراب لگ رہی تھی۔

"تم بھی بہت اچھی لگ رہی ہو پاگل...... یہ دیکھو۔" وسیلہ آگے بڑھ کر اسے اس کی تصویریں دکھانے لگی۔

"ہاں یار...... وہ اپنی ہی تصویر کی بیوٹی کو نہارنے لگی تو وسیلہ نے ہنس کر سر ہلایا۔

"اے آپی...... وہ دیکھونا...... وہ تمہارے وردی والے نہیں...؟" ایلیا نے ایک جانب اشارہ کیا تو وسیلہ چونکی۔ نظروں کے تعاقب میں دیکھا، واقعی سامنے سے منصب اور رمشہ چلے آرہے تھے۔ وسیلہ کو تمہارے کہنے پر ایلیا کو سرزنش کرنے کا موقع بھی نہیں ملا اور وہ دونوں ان کے قریب آگئے۔

"واٹ اے کوانسیڈنس...... وسیلہ، ایلیا...... آپ لوگ یہاں۔" رمشہ جوش اور خوشی سے تقریباً چلاتی ہوئی ان سے آلپٹی۔ پیچھے کھڑا منصب بہن کے جوش و جذبے کو لب دبا کر دیکھ رہا تھا۔

"واقعی بہت عجیب اتفاق ہے...... میاں دم سے اتنی دور ایک ساتھ ایک ہی جگہ...... لیکن خیر کمال ہے۔ بہت خوشی ہوئی آپ کو یہاں دیکھ کر۔" ایلیا نے رمشہ کو بازو میں لپٹا رکھا تھا۔

"اور کون کون ہے ساتھ؟"

"سب ہیں...... امی، ممانی، تحریم، مومن بھیا...... لیکن اُدھر پارک میں......" وسیلہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"اچھا ہم بھی کچھ دیر پہلے تک وہیں تھے، لیکن میرا بھانجا بہت تنگ کر رہا تھا تو گھومنے پھرنے باہر نکل آئے۔" رمشہ نے مزید بتایا تو وسیلہ اور ایلیا دونوں کو حیرت ہوئی۔

"آپ کا بھانجا......؟ تو ابھی کہاں ہے۔"

"وہ لوگ وہاں جیپ میں ہیں۔ میری سسٹر میمونہ آئی ہوئی ہیں ملنے، آئیں نا وسیلہ۔ آپ لوگوں کو اُن سے ملواتی ہیں۔" رمشہ نے وسیلہ کا ہاتھ تھاما۔

"میں تو کہتی ہوں، سب پارک میں چلتے ہیں، سب سے ملاقات ہو جائے گی۔ میمونہ آپی کو بھی بلوا لیں۔" ایلیا نے رمشہ کی تائید چاہی لیکن وسیلہ نے بے ساختہ منصب کو دیکھا، انداز میں کچھ ایسی گھبراہٹ تھی کہ منصب چونک سا گیا۔ وسیلہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ منصب نے باقی دو کی نظر بچا کر ہلکا سا ابرو سوالیہ انداز میں اٹھایا تو وسیلہ نے سرگوشی میں حرکت دی۔ منصب کے لیے سمجھنا آسان ہو گیا، وسیلہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ لوگ پارک میں جا کر باقی سب سے ملیں۔

"ہماری جیپ یہاں سے بہت قریب ہے۔ آپ لوگ پہلے میمونہ سے آکر مل لیں، پھر دیکھتے ہیں۔" منصب نے پہلی بار مخل ہو کر صلاح دی اور رمشہ نے بھی سر ہلا دیا۔ ایلیا اور وسیلہ جیپ کے نزدیک آئیں تو میمونہ انہیں دیکھ کر باہر نکل آئی۔

"ان سے ملو میمونہ! میاں دم میں ہماری پہلی دوست......" رمشہ نے سلام دعا کے بعد مسکراتے ہوئے وسیلہ کو بازو کے گھیرے میں لیا۔

"یہ وسیلہ ہیں، اور یہ چھوٹی ایلیا...... اور یہ ہماری بڑی سسٹر میمونہ ہیں، تھانہ میں ہوتی ہیں، آج کل ہم سے ملنے آئی ہوئی ہیں اور یہ ان کا شرارتی بیٹا شہیر......" رمشہ نے بات کرتے بھانجے کو اپنی گود میں لے لیا۔

"بہت کیوٹ ہے ماشاء اللہ۔" ایلیا کو بچے بہت پسند تھے وہ بے اختیار شہیر کی طرف لپکی تھی۔

"ابھی تو کچھ دن یہیں ہیں نا میمونہ...... تو

ہماری طرف ضرور آیے گا......" وسیلہ نے بہت دل سے کہا۔

"جی بالکل، تحریم آپی کی شادی کو تو پانچ ماہ ہونے والے ہیں، دوبارہ ہماری ملاقات ہی نہیں ہو پائی۔"

"باری ویسے آپ لوگوں کی تھی...... کیوں وسیلہ؟" رمشہ نے یاد دلایا تو وہ ہنس پڑی۔

"یہ تو ہے، لیکن اس دوستی کو باریوں سے آزادی رکھیں، تاکہ جب دل چاہے ہم ایک دوسرے سے مل لیا کریں۔"

"اوکے، تو پھر ایک دو دنوں میں ہی ہم آپ کے ہاں آجاتے ہیں۔" رمشہ نے بعد خوشی اس دعوت کو قبول کر لیا۔

"رمشہ آپ کا نمبر لینا میں اس روز بھی بھول گئی تھی۔ یاد ہے ہم جاب وغیرہ کے متعلق بات کر رہے تھے۔" ایلیا نے یاد دلایا اور رمشہ نے بھی فوراً اپنا نمبر دہرا دیا جسے ایلیا نے ہی اپنے موبائل میں اسی وقت محفوظ کر لیا اور اپنا نمبر رمشہ کو نوٹ کروا لیا۔ وسیلہ خاموشی سے کھڑی دیکھتی رہی۔ دور منصب نمبرز کے تبادلے کو بڑی معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھ رہا تھا۔ ان ہی دو کی بدولت دو فیملیز آپس میں ایک نئی خوب صورت دوستی کے رشتے میں بندھ رہے تھے۔ اور انہی دو کے پاس ایک دوسرے کا نمبر نہیں تھا۔

"تو یہ بھی شاید اتفاق ہے...... بھی۔؟"

منصب رمشہ کے پیچھے سے ہٹ کر اپنی جیپ کے قریب آیا تھا۔ پچھلی سیٹ سے کوئی شاپر اٹھاتے چپکے سے زیرلب کہا جسے صرف وسیلہ ہی سن سکتی تھی۔ اس مرتبہ وہ بھی ہنسی نہیں روک پائی، البتہ منصب کی جانب دیکھا نہیں گیا۔

☆☆☆

"امی کو سب سے زیادہ شوق ہو رہا تھا جانے کا......" رضوانہ کا پریشان حال چہرا بری طرح اترا ہوا تھا۔ ندرت بھی بے چینی سے لب کاٹ رہی تھیں۔ تحریم بیڈ پر نیم دراز منہ بنائے ان دونوں کو باری باری دیکھ رہی تھی جب دھاڑ سے دروازہ کھول کر پہلے ایلیا اور پیچھے وسیلہ اندر داخل ہوئی۔ ایلیا کے ہاتھ میں دو کارٹون فیس کے کشن دبے تھے۔ چہرا خوشی اور جذبات سے تمتما رہا تھا۔ پیچھے آتی وسیلہ کے ہونٹوں پر بھی ہنسی تھی لیکن اس کی خوشی ایلیا کی دیوانگی سے بہت کم تھی۔

"یا ہووووو......" اس نے چیخ کر خوشی کا نعرہ لگاتے تحریم کے نزدیک بیڈ پر چھلانگ لگا کر آلتی پالتی ماری۔

"کیا پاگل پن ہے......؟" رضوانہ نے آخر قریب آنے پر اس کے سر پر ایک چماٹ دی "ہوش میں ہو تم؟۔"

"ہائے...... اب ہے نیند کسے...... اب ہے چین کہاں......" وہ مدہوشی سے اپنے لائے کشن پر گر گئی۔

"امی سچ بتائیں...... ڈاکٹر نے یہی کہا؟" وسیلہ کے چہرے پر بھی خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"واقعی ٹوئنز......؟" اس نے نچلا لب دانتوں میں دباتے شوخی سے تحریم کو دیکھا لیکن اس کی اتری صورت دیکھ کر ایک دم سنجیدہ ہوئی۔

"کیا ہوا...... یہاں سب پریشان کیوں ہیں؟" وسیلہ نے باری باری تینوں کی صورتوں کو جانچا۔

"ہمیں تو مومن بھیا نے بتایا کہ ڈاکٹر نے جڑواں بچوں کا بتایا ہے۔ ہم سے تو خوشی ہی سنبھالی نہیں جا رہی تھی لیکن آپ لوگوں کو کیا ہوا، سب خیریت تو ہے؟۔"

"خیریت ہی ہے۔" ریم سخت برا منہ بناتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی "میں بھی تم دونوں جیسا خوش ہونا چاہتی ہوں لیکن ان دونوں کو دیکھو جب سے سنا ہے ہکا بکا بلکہ ساکت صامت بیٹھی مجھے بھی ہولا رہی ہیں۔ میرا ابھی دل ڈرا دیا...... شکر ہے اتنی دیر بعد کوئی ہنستا چہرا دیکھ کر میرے بھی اوسان بحال ہوئے۔"

"کیا ہوا امی۔ کیوں ڈرا رکھا ہے بے چاری

کو؟"

"ارے یونہی..... بس دل گھبرا رہا ہے سوچ کر کہ دو بچوں کی ذمہ داری کا بوجھ اٹھا پائے گی، پھر ڈلیوری، اور یہ باقی بچے چار پانچ ماہ کا عرصہ....."
امی بولنے پر آئیں تو اپنے سارے خدشے نکال باہر کیے۔"

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، پچھلے دنوں اخبار میں دیکھا، صوابی کی خاتون کے پانچ بچے ایک ساتھ....."

"ارے بس بھی کرو....." رضوانہ نے سخت کبیدہ خاطر ہوتے ایلیا کا منہ بند کروایا "تمہیں بھی کوئی معاملہ سنجیدہ لگا بھی ہے۔"

"قسم لے لیں، مجھے تو ہر بات اوروں سے زیادہ سنجیدہ لگتی ہے، آپ ہی غور کرنے کو تیار نہیں ہوتیں۔" اس نے منہ سکوڑا۔

"ہاں، اور یہ کتے کے پلے پالنے کو اپنی سنجیدگی کہتی ہے۔" رضوانہ نے طنزیہ ندرت کی طرف دیکھا تو ریم اور وسیلہ کی بھی ہنسی چھوٹ گئی۔ اندر آتے مومن کی آنکھیں البتہ حیرت سے پھیلنے لگیں، وہ تو اپنے جڑواں بچوں کی خبر سن کر اندر آ رہا تھا اور ساس صاحبہ کے منہ سے یہ کیسے پھول جھڑ رہے تھے۔

"اچھا اچھا بولیں پھوپھو....."

"ہیں..... یعنی۔" رضوانہ نے کچھ نہ سمجھتے پہلے مومن کو دیکھا پھر ندرت کے قہقہے پر اپنی بات پہ غور کرتے خود بھی ہنس پڑیں۔

"تو یہ ہے مومن..... ادھر آؤ، یہاں بیٹھو۔"

"جی بھیا، آیے اور بیٹھیے لیکن پلیز آپ ان دو خواتین کی طرح پریشان نظر مت آنا۔" وسیلہ نے باقاعدہ ہاتھ باندھ کر التجا کی۔ جس پر مومن نے مسکراتے ہوئے ماں اور پھوپھو کو دیکھا۔

"اچھا..... اور کیا وجہ ہے ان کی پریشانی کی؟"

"تمہیں لگتا ہے یہ تمہاری سست کاہل بیوی سنبھال پائے گی دو، دو بچوں کی ذمہ داری....."
رضوانہ نے تحریم کو بیزاری سے دیکھا۔

"سستی اور کاہل پن کے خطابات پر تو خیر میری طرف سے خصوصی شاباشی ہے، لیکن غور فرمایئے کہ اللہ نے شاید اسی دن کے لیے عورتوں بھرا گھر دیا تھا۔" مومن کے شوخ لہجے سے اس کی خوشی ٹپکتی تھی۔
رضوانہ نے محبت سے داماد کو دیکھا۔ مومن باتونی نہیں تھا بلکہ معمول سے کچھ زیادہ ہی کم گو تھا۔ اس کا زیادہ بولنا اس کی اندرونی خوشی کا غماز تھا۔ انہوں نے مسکراتی نظروں سے ندرت کی طرف دیکھا لیکن بھابی کے چہرے کا تفکر رضوانہ کو چونکا گیا۔

"کیا بات ہے ندرت..... تم ابھی تک پریشان بیٹھی ہو؟"

"ہوں..... نہیں بس..... بہت سی باتیں ہوتی ہیں نا....." انہوں نے بات کو خود ہی مختصر کیا۔

"چلیں....." مومن نے سوالیہ انداز میں تحریم کی طرف دیکھا۔ مومن کے کہنے پر تحریم اور ندرت اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"اللہ پہ بھروسا رکھو، سب اچھا ہوگا ان شاء اللہ۔"

ان شاء اللہ۔ ندرت نے مسکرا کر تائید کی۔

☆☆☆

گول گول گھومتی، چکردار سڑک کے اختتام پر بالآخر وہ میانڈم کی چھوٹی سی آبادی میں داخل ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ آبادی کو کراس کر کے ایک نسبتاً پرسکون چھوٹے روڈ کا انتخاب کرتے ہوئے اس وقت وہ سڑک کنارے کار سے اتر کر میانڈم کی اونچی ہری بھری چٹانوں کو دیکھ رہا تھا۔ مسکراتے لبوں پہ دبا دبا جوش اور آنکھوں میں نہ سمجھ آتی چمک لیے وہ چٹانوں سے نیچے آتے اب مقامی آبادی کے گھروں کے قریب آ چکا تھا۔ منزل زیادہ دور تو ہرگز نہ تھی پر کچھ مجبوریوں نے اس کا راستہ کچھ طویل ضرور کر دیا تھا۔
اور "میانڈم" ۔ ارحم خان کے سفر کا پہلا پڑاؤ تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ملیا سمیون

جب زندگی کی عصر ہوئی

اس کا حسن وقت فجر جیسا تھا..... ٹھنڈک اور پاکیزگی بھرا احساس..... کسی معصوم بچے کے لبوں پر کھلتے تبسم کی مانند دلفریب..... صورت مہتاب کی تو زلفیں مانند شب دیجور۔

اپنے قیامت خیز حسن کا ادراک تھا اس لیے تو ہواؤں میں اڑتی..... اپنی قسمت پہ نازاں رہتی..... پورے گاؤں میں اس جیسا حسن خدا نے کسی اور کو ودیعت نہ کیا تھا..... اس کے انداز و اطوار دیکھ کر دادی ہول اٹھتیں۔

دادی کی آواز سنتے ہی وہ دوپٹے کی بکل مار کر بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکلتی اور دیوار کے وسط میں کھڑکی نما دروازہ پار کر کے تایا اکرم کے گھر چلی جاتی۔

”دادی اماں! وہ برف کی شہزادی ہے دھوپ لگتے ہی پگھل جائے گی۔“ تندور میں بالن جھونکتی مروقاں نے اپنی طرف سے مذاق کیا جو آگ میں لپٹے تیر کی طرح دادی کے دل میں پیوست ہو گیا۔

”تو نے ہی سر چڑھایا ہے اسے‘ سارا دن خود کاموں میں جتی رہتی ہے اسے تل کے پانی نہیں پینے دیتی ’چھوٹی چھوٹی‘ کہہ کر بگاڑ دیا اسے۔“

”چند ماہ کی بات ہے دادی..... دسویں کا امتحان دینے دیں پھر یہی سب کرنا ہے اس نے .....“ مروقاں نے صنوبر کی طرف داری کی۔ اب وہ کمال مہارت سے تندور میں روٹی لگا رہی تھی۔

دادی کو اپنا زمانہ یاد آ رہا تھا۔

”والدین نے کم سنی میں ہی بیاہ دیا مگر اگلے گھر آ کر پتا چلا کہ ان کو بہو تو سولہ سال کی چاہیے تھی مگر اس میں چالیس‘ پچاس سالہ عورت کے گن بھی چاہیے تھے۔ میں شروع کے چند ماہ میں ہی سب کچھ سیکھ گئی..... میں نے صحیح معنوں میں ساس سسر کی خدمت بھی کی اور اپنے بنائے کھانوں سے ہر مہمان کی داد سمیٹی..... پھر بھی میرے جاننے والے میرا وہ چند ماہ کا پھوہڑ پن ابھی تک یاد رکھے ہوئے ہیں۔“

دادی کی آواز میں گہرا رنج تھا۔

مروقاں جانتی تھی کہ دادی یہ سب اسے نہیں بلکہ کسی اور کو سنا رہی ہیں..... دیوار کی دوسری طرف بیٹھی اس ہستی کو سنا رہی ہیں جو ان کے مشوروں اور نصیحتوں سے بچنے کے لیے روز تایا اکرم کے گھر بھاگتی تھی مگر وہاں بھی اس کی سماعتیں دادی کی نصیحتوں سے خوب مستفید ہوتی تھیں۔ وہ جب بھی ان کی باتیں سوچتی تو اس کی تان ہمیشہ ایک ہی جملے پہ آ کر ٹوٹتی تھی۔

”میں تو راج کماری ہوں، راج کماریاں کہاں کام کرتی ہیں۔“

خود پسندی ایک ایسا دلفریب عمل ہے جو انسانی ذات کے لیے ابلیس ملعون کی چالوں سے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اسے اپنے قیامت خیز حسن کا ادراک تھا۔ پورے گاؤں میں اس جیسا حسین کوئی اور نہ تھا۔

☆☆☆

”اللہ توبہ کتنی گرمی ہے آج‘ میرے تو بازو دکھ گئے ’پنکھی‘ جھلاتے جھلاتے..... اب تو ہر دوسرے گھر میں سولر فین آ گیا ہے مگر ہمارے نصیب میں یہ ”ہتھ فین“ ہی لکھا ہے۔“

صنوبر کی جھنجلائی آواز پر راحت کی کھلکھلاہٹ فضا میں ابھر کر معدوم ہوئی پھر دونوں کی آوازیں دھیمی سرگوشیوں میں بدل گئی۔ جامن کے درخت کے سائے میں بیٹھے شاکر نے کن اکھیوں سے صابر کو دیکھا وہ اپنی سائیکل دھونے میں ایسے محو تھا جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ شاکر اس کی ’محویت‘ پہ زیر لب مسکرایا۔

تھوڑی دیر بعد دادی کے پکارنے پر صنوبر بڑبڑاتے ہوئے دیوار کے وسط میں اس چھوٹے سے دروازے کو عبور کر کے اپنے گھر چلی گئی۔ شاکر نے ایک گہری نگاہ صابر پر ڈالی۔

ابھی پچھلے سرما کی بات تھی ابا نے صابر

کو کپڑے خریدنے کے لیے رقم دی مگر صابر نے اپنے لیے لنڈے سے کپڑے خرید لیے اور پیسے بچا کر الیکٹرک ہیٹر لے آیا۔ ان دنوں صنوبر روز راحت کے سامنے سردی سردی کا شور مچاتی تھی۔

"یہ میں دادی کے لیے لایا ہوں ان کو سردی سے بخار نہ ہو جائے۔"

ابا کے استفسار پر اس نے جو جواب دیا وہ انھیں نہال کر گیا۔

"میرا اتنا دل کرتا ہے کہ ہمارے گھر میں بھی ٹی وی ہو۔ سنا ہے کہ بہت مزے کے ڈرامے لگتے ہیں۔ ایک بار ابا جی سے بات کی تو انہوں نے ڈانٹ دیا کہ شریف لڑکیاں ٹی وی نہیں دیکھتیں۔"

راحت کچن میں کام کر رہی تھی اور وہ اس کے پاس بیٹھی جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ پتا نہیں کیسے صابر کے کان میں بات پڑ گئی۔ اگلے دن ابا جی کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"اس بار جب مونگ پھلی کی فصل بکے گی تو آپ نے ٹی وی خریدنا ہے۔ کالج میں میرے سارے دوست ڈراموں کی بات کرتے ہیں۔ تو میرا بھی دل کرتا ہے ڈرامے دیکھنے کا......"

"تجھے ہم کالج پڑھنے بھیجتے ہیں ڈراموں کی باتیں کرنے نہیں......

زمینوں سے جو آمدنی ملتی ہے اس کا بڑا حصہ تو تمہاری کالج کی فیسوں اور بسوں کے کرائے کی نذر ہو جاتا ہے پھر یہ بات تو بھی جانتا ہے کہ تیرے چاچے کی دھی مروقاں شاکر کی بچپن کی منگ ہے۔

شاکر کی عمر کے سارے سنگی بال بچوں والے ہو گئے اور ہم سے ابھی تک بری کا زیور نہ بن سکا۔ تیرا چاچا ہمارے آسرے پر مروقاں کو کب تک بٹھا کے رکھے گا...... پہلے مجھے میرے فرائض ادا کرنے دو پھر اپنی مرضی کرتے رہنا۔"

انہوں نے اپنی طرف سے بات ختم کر دی تھی مگر ٹھیک دو ماہ بعد وہ ٹی وی لے آیا۔ پیسوں کا انتظام بھی خود ہی کر لیا تھا۔ حیران کن بات یہ تھی کہ اسے ٹی وی دیکھتے کسی نے نہ دیکھا۔ روز رات کو بیٹھک میں جا کر کتابیں پڑھتا رہتا اور ادھر صنوبر دادی کے ہزار اعتراض کے باوجود آٹھ بجے والا ڈرامہ دیکھنے روز جاتی تھی۔

وہ قریبی شہر کے ایک گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا اور روز بس میں آتا جاتا تھا۔ چھٹی والے دن اینٹوں والے بھٹے پر کام کرنے چلا جاتا وہاں سے جو مزدوری ملتی اس سے آئے دن صنوبر کے لیے فیشن میگزین اور اس سے ملتا جلتا مواد اٹھا لاتا۔

شاکر آج کل اس کی سرگرمیوں پہ گہری نگاہ رکھتا تھا۔ صابر کی نگاہوں میں صنوبر کی محبت اسے نظر آ رہی تھی۔

اس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا ابا جی سے صنوبر اور صابر کے رشتے کی بات کرنے کا۔

☆☆☆

آج خلاف معمول صنوبر تایا اکرم کے گھر نہیں گئی تھی مگر راحت کوئی فیشن میگزین اٹھا لائی تھی۔ اب وہ دونوں کافی دیر سے بند کمرے میں فلمی ستاروں کی وجاہت پر تبصرے کرنے میں مگن تھیں۔

کمرے میں جتنا حبس اور گرمی تھی باہر موسم اتنا ہی خوش گوار تھا۔ آسمان پوری طرح سے بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ سرمئی سحاب برسنے کو تیار تھا۔ دادی نے راحت اور صنوبر کو پکارا مگر ان پر ذرا اثر نہ ہوا۔ کچن میں کھانا بناتی مروقاں نے کھڑکی سے جھانکا۔ دادی دھریک کے درخت تلے چنگیر بنا رہی تھیں۔ اس نے آنچ ہلکی کی اور صنوبر کو بلانے چلی گئی۔

کمرے میں صنوبر اپنے حسن کے قصیدے پڑھنے میں مصروف تھی "میرا دل کرتا ہے میری شادی کسی ایسے بندے سے ہو جس کی شکل فواد خان سے ملتی ہو۔" اندر داخل ہوتی مروقاں کو گہرا

دھچکا لگا، وہ دونوں بھی اسے دیکھ کر ٹھٹھک گئیں۔
"یہ تم دونوں آج کل کن چکروں میں پڑی ہوئی ہو؟ ایک اپنے حسن کی نمائش کر کے تعریفیں بٹورنے کی خواہشمند ہے تو دوسری نامحرم مرد کی وجاہت کے گن گاتے ہوئے اسے شریک حیات بنانے کی آرزو رکھتی ہے۔"
تم "مسلمان عورتیں" ہو، حضرت محمد ﷺ کی امتی ہو۔ اپنے مرتبے کو پہچانو!...... خبردار...... آج کے بعد میں ایسی کوئی فضول بات نہ سنوں ورنہ دادی کو بتا دوں گی۔"

☆☆☆

آج ان کی دور کی رشتہ دار کی شادی تھی۔
صنوبر اور راحت وہاں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔ راحت نے شوخ گلابی رنگ کے کپڑے پہنے تھے جبکہ اس نے سیاہ رنگ کی فراک زیب تن کی تھی جس کے بارڈر پر لال رنگ کے دھاگے کی کڑھائی مروقاں نے اپنے ہاتھوں سے کی تھی۔
دادی کو صبح سے بخار تھا۔ مروقاں بھی ان کی وجہ سے گھر پہ رک گئی تھی۔
"صنوبر! تم ان کپڑوں میں پوری جادوگرنی لگ رہی ہو۔"
"جادوگرنی کیوں پری کہو......" وہ اترائی۔
"دادی! آج میں نقاب کیے بغیر ہی چلی جاؤں...... یہ دو کھیت چھوڑ کے تو گھر ہے ان کا......"
"ہرگز نہیں"......
دادی کے بجائے مروقاں نے جواب دیا۔
دادی کی خاموشی بتا رہی تھی کہ وہ اس کی بات سے متفق ہیں۔ صنوبر سخت بدمزہ ہوئی اور چادر اوڑھ کر راحت کی معیت میں باہر نکل آئی۔
اس نے گھر سے نکلتے ہی چادر اتار کر راحت کو تھمائی جو اس نے شاپر میں ڈال کر ماڑیں میں چھپا دیا۔
اب اس کی سیاہ بل کھائی زلفیں پشت پر بکھری تھیں۔ اور شفون کا دوپٹہ رسی کی طرح گلے میں جھول رہا تھا جس کچے راستے پر وہ چل رہی تھیں اس کے دونوں طرف لمبے سروٹ تھے...... راحت کو عقب میں کسی کی آہٹ کا گمان ہوا تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ سیاہ رنگ کا سانپ تیزی سے راستہ عبور کر کے سروٹ کے پیچھے غائب ہو گیا۔ اسی لمحے صنوبر کی نظر سانپ پر پڑی۔ ان کی فلک شگاف چیخیں فضا میں گونجنے لگیں۔
زمرد اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر جا رہا تھا۔ نسوانی چیخیں سنتے ہی سرعت سے اس طرف لپکا۔ راحت اسے دیکھتے ہی خاموش ہو گئی مگر صنوبر دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے چیخے جا رہی تھی۔
زمرد نے لاشعوری طور پر اس کے ہاتھ ہٹائے اور کیوپڈ نے اپنا کام کر دکھایا۔ اسے لگا کہ سارے دلکش خواب حقیقت کا لبادہ اوڑھے سامنے آ گئے ہیں اک انوکھا احساس دل میں جاگزیں ہوا تھا۔
یہ ان کی پہلی ملاقات تھی جو اتفاق سے ہوئی بعد میں وہ ملاقاتیں ارادی طور پر ہوئیں۔ جس دن زمرد کے گھر والے رشتہ لے کر آئے اس دن وہ سراپا التجا بن کر دادی کے قدموں میں بیٹھ گئی۔
"ابھی تمہاری شادی کی عمر نہیں ...... وہ عورتیں بھی مزاج کی تیز لگتی ہیں ویسے بھی میں نے تو شروع سے ہی تمہیں صابر کے لیے سوچ رکھا تھا......" دادی کی باتوں نے اسے سرد کر دیا۔
کہاں زمرد...... اور کہاں صابر......
زمرد مردانہ وجاہتوں سے مالا مال دلکش مرد...... اور صابر لمبا تڑنگا سا لڑکا جس کے پکے رنگ کے باعث گلی کے بچے تک "کالو" کہتے تھے۔
"دادی! ایک بار ٹھنڈے دماغ سے غیر جانب داری سے سوچیں...... میرے ساتھ صابر جچے گا یا زمرد؟......"
زمرد کے رسیلے بول کانوں میں اترتے ہی آنکھوں سے حیا بھی اتر گئی تھی۔ اس کی باتوں سے

بے باکی کے ساتھ بغاوت بھی ٹپک رہی تھی ادب واحترام مفقود تھا۔ دادی کی ہر تاویل کے جواب میں اس کی دلیل حاضر تھی۔

دادی کے ساتھ مروقاں بھی دنگ رہ گئی۔ ابھی دن ہی کتنے ہوئے زمرد سے ملے ہوئے وہ اسے جانتی ہی کتنا تھی۔

ابا جی بہت سادہ مزاج کے تھے انہوں نے گھر کے معاملات میں بھی دلچسپی نہ لی مگر جب صورتحال کا علم ہوا تو وہ ٹوٹ کر رہ گئے اور ایک ساتھ دونوں بیٹیوں کی شادی کی تیاری شروع کردی۔

مروقاں کی شاکر کے ساتھ اور صنوبر کی زمرد کے ساتھ......

مروقاں جانتی تھی کہ اس کی بہن کردار کی ہلکی نہیں ہے مگر بہت نادان ہے۔ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کرسکی۔

☆☆☆

وہ برآمدے سے سولر فین اتار رہا تھا جب اس نے چچا کے گھر سے اجنبی عورتوں کو نکلتے دیکھا۔ اس نے اندر جا کر راحت سے استفسار کیا تو اس نے جو خبر سنائی گویا دہکتی سلاخ دل میں گھونپ دی۔ وہ گم صم سا کمرے میں چلا گیا۔

"پاگل انسان مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں خود ابا جی اور چچا سے بات کرتا۔" شاکر کی نگاہ سولر فین پر پڑی تو اس کے خدشے کی تصدیق ہوگئی اب وہ دیوداس بنے صابر سے الجھ رہا تھا۔

شاکر نے ابا سے بات کی مگر اب ان سب باتوں کا وقت نکل چکا تھا۔ ایک ہفتے کے اندر مروقاں بیاہ کر ادھر آ گئی اور صنوبر بیاہ کر زمرد کے گھر چلی گئی۔

☆☆☆

زمرد کا گاؤں قریب ہی تھا۔ بارات والے دن بھی اس کے گھر سے گنتی کے چند لوگ ہی آئے تھے وہ ان خواتین کی معیت میں شرارہ سنبھالتی گھر کے اندر داخل ہوئی تو سامنے تخت پر پکی عمر کی بھاری بھرکم عورت بیٹھی حقہ پی رہی تھی۔

"یہ زمرد کی امی ہیں سلام کرواؤ انہیں......"

"السلام علیکم امی!......"

اس نے گھونگھٹ کی آڑ سے جھانکا۔

"تیرا یہ میرا ابھی سمجھ لگتا ہے جو مجھے امی کہہ رہی ہو۔" لفظوں سے زیادہ لہجے کی دھار تیز تھی۔ ساتھ بیٹھی عورتوں کی دبی دبی ہنسی صنوبر کو بکی کا احساس ہوا۔

"عجائب سلطانہ! آج تو پہلا دن ہے بے چاری کا' آج تو بخش دو اسے' ساری زندگی یہی سننا ہے اس نے۔" پتا نہیں کون بولی تھی...... صنوبر کو اندازہ ہوگیا کہ اس سے کتنی بڑی بھول ہوگئی ہے......

یہ تو ابتداء تھی اذیتوں کے سفر کی' زمرد کے اظہار محبت نے جو خواب آنکھیں کیفیت اس پر طاری کی تھی وہ اڑن چھو ہوگئی۔ ایک جھٹکے میں اس طلسم ہوشربا سے نکل آئی تھی۔ مروقاں اور دادی ایک دو بار اس سے ملنے آئیں تو انہیں ڈھونڈنے سے بھی اس کے چہرے پر خوشی کی رمق دکھائی نہ دی۔

"دادی! مجھے معاف کردیں۔ مجھے میری حماقتوں کی سزا مل رہی ہے" وہ دادی کی گود میں سر رکھ کر رو پڑی۔

"صبر کرو ان کے دل جیتنے کی کوشش کرو۔ اب یہی تمہارا گھر ہے۔" انہوں نے تسلی دی۔

صنوبر کی ساس کو دادی اور مروقاں کی آمد ناگوار گزرتی تھی۔ اس کی پیشانی کے بل دیکھتے ہوئے ان لوگوں نے آنا چھوڑ دیا۔

میکے میں ہل کر پانی نہ پینے والی یہاں سارا دن پھرکی کی مانند گھومتی تھی۔ وہ جانوروں کا گوبر تھاپتی' دودھ دوہتی' چارہ بھوسہ کرتی۔ گندم کی کٹائی اور مونگ پھلی کی گوڈی کرتی......

زمرد کی دو طلاق یافتہ خالائیں اسی گھر میں رہتی تھیں۔ شادی شدہ بہنیں بھی ہر دوسرے دن

یہاں موجود ہوتیں۔ان سب کے لیے کھانا بنانا اور ان کے کپڑے دھونا بھی صنوبر کی ذمہ داریوں میں شامل ہو جاتا وہ پور پور تھک چکی تھی۔

وہ کھل کر سانس لینا چاہتی تھی مگر کوئی روزن نظر نہیں آتا تھا۔ زمرد کی محبت تو اک سراب تھی۔ نظر کا دھوکہ تھا۔

زمرد اس کی ہر حرکت کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ۔اس کے مسکرانے پر چوکنا ہو جاتا، اس کی اداسی کسی "یار" کے بچھڑنے کا سوگ لگتی۔ اب صنوبر سے اسے گوبر کی بو آتی تھی۔ یہاں کسی کے پاس اس کے لیے وقت نہیں تھا۔

جس دن صنوبر کی گود میں اللہ کی رحمت آئی اسی دن زمرد نے اسے طلاق کا میڈل پہنا کر گھر سے نکال دیا۔

☆☆☆

"میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا؟ میں اتنی بے وقوف کیوں تھی؟ یہ سب اک بھیانک خواب کی طرح لگتا ہے۔

کاش میں ٹھوکر کھانے سے پہلے سنبھل جاتی، شاید یہ میرے کیے کی سزا ہے......

میں نے سب کا دل دکھایا۔ میرے غرور و تکبر کی سزا۔" وہ بولتے بولتے رو پڑی۔

دادی، مردقاں، اباجی سب اس کے دکھ پر دکھی تھے۔ کسی کا حرف تسلی اس کے دل کو سکون نہ بخشتا تھا۔ پھر ایک روز اسے زمرد کی دوسری شادی کی خبر ملی تو سب کے منع کرنے کے باوجود وہ لڑکی دیکھنے چلی گئی۔ بلاشبہ وہ حسن کا مرقع تھی، قدرت کا شاہکار تھی۔

"خوبروئی کے تفاخر میں مبتلا ہو کر آئینے سے ہم کلام ہونے والیاں اگر دنیا میں گھوم پھر کر دیکھیں تو انہیں معلوم ہو کہ ہر سیر پر اک سوا سیر موجود ہے۔"

اکثر لوگوں کو بزرگوں کے اقوال زریں تب سمجھ میں آتے ہیں جب ان کی زندگی کی عصر ہو رہی ہوتی ہے۔

اس نے دادی سے کڑھائی کے سارے ٹانکے سیکھے۔ آج کل وہ چھابیاں اور چنگیریں بنانا سیکھ رہی تھی۔ ہر انسان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہنر ضرور ہونا چاہیے۔ بے ہنر انسان کا وجود تو ایسے ہی ہے جیسے بنا سنگھار کے دلہن......

آج اس کی عدت ختم ہوئی تو دادی اسے صابر کے حق میں قائل کرنے بیٹھ گئیں۔ وہ آج بھی صنوبر کا طلب گار تھا۔

صنوبر نے بھی سر جھکا کر آمادگی ظاہر کر دی۔ دادی نہال ہو گئیں۔ وہ دھریک کے درخت تلے بچھی چارپائی پر بیٹھی دستی پنکھے بنا رہی تھی جب اسے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔

"موسم بہار کا پہلا گلاب اس لڑکی کے نام جو بلاشبہ پھولوں، خوشبوؤں اور تتلیوں سے کہیں زیادہ دلکش ہے" اس نے سرخ گلاب اس کی ہتھیلی میں دھر دیا۔

"میں اپنی زندگی جی چکی...... جو رہ گئی وہ تو بس گزارنی ہے۔ وہ رعنائی، وہ دلکشی وہ تو اب ماضی کا قصہ ہے۔ گزشتہ تین برسوں نے مجھے یکسر بدل دیا ہے۔" اس کے الفاظ اندرونی کیفیت کی عکاسی کر رہے تھے۔ وہ اپنی سوچوں سے نبرد آزما تھی۔

"اتنی ذود رنج ابھی تک ہو، تمہارے ساتھ جو ہوا وہ ہم سب کے لیے بھی جاں گسل صدمہ ہے مگر میری درخواست ہے اسے اک بھیانک خواب سمجھ کر بھولنے کی کوشش کرو۔ میں بھی کوشش کروں گا کہ تمہیں خوش رکھ سکوں۔"

"یہ بہت گہرے گھاؤ ہیں کب تک رفوگری کرو گے۔"

"ضرورت پڑی تو تاحیات......" صابر کے لفظ اس کے انگ انگ میں سرور اور سرشاری بھر رہے تھے۔ خوشیاں اس کی دہلیز پر کھڑی تھیں، اس نے گلاب کی مہک اپنی سانسوں میں اتاری اور دل سے مسکرا دی۔

☆☆

www.pklibrary.com
صدف عمر
آپ اپنے دام میں
ناولٹ

وہ چاروں نہایت پراسرار طریقے سے کچن میں داخل ہوئیں۔ کچھ دیر کھٹر پٹر کے بعد اسی انداز سے وہ لان کی طرف کھلنے والے دروازے سے ہوتی ہوئی پچھلی طرف نکل گئیں۔

''شی شی آرام سے، آہٹ نہ ہونے پائے۔'' سب سے آگے عروین تھی جو اس گروہ کو لیڈ کر رہی تھی۔ وہ کیا کرنے جا رہی تھیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔

تائی کمرے کی کھڑکی حسب معمول ادھ کھلی تھی۔ وہ سب سابقہ انداز میں محتاط طریقے سے چلتی کھڑکی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئیں۔

''ساتھیو! منہ بند ہی رکھنا۔''

اس کے کی ہدایات جاری تھیں۔ جاری تھے۔ باقی تینوں نے فرماں برداری سے سر ہلا دیا۔ اب چاروں ''مسکسیاں'' کھڑکی کے نیچے موجود اندر ہونے والی گفتگو کو کان لگا کر سننے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''یہ تائی جان کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے تو کچھ بھی صاف سنائی نہیں دے رہا؟'' ماہا نے بے صبری سے سرگوشی کی۔

''خاموش الو کی دم! تم چپ رہو گی تو کچھ سنائی دے گا نا۔'' عینی نے سرگوشیانہ انداز میں اسے جھڑک دیا۔ تب تو اسے بہت چڑھی لیکن بدلہ بعد میں اٹھا رکھا۔ بابا کی آواز سنائی دی جو تائی جان سے کہہ رہے تھے۔

''آپ بڑی ہیں بھابھی! جیسا آپ مناسب سمجھیں۔'' اور ماہا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

''یہ بابا......''

''اوہو چپ کرو گدھی!'' اب کے نوین نے بھی چڑ کر ڈانٹ دیا۔ مارے حیرت کے ماہا کی آنکھیں ابلنے لگیں۔ یہ ہر وقت اس کی خوشامد کرنے والی نوین۔ اس کو آنکھیں دکھا رہی ہے۔

''بچو! نمٹ لوں گی تم سب سے بھی۔'' دل ہی دل میں انہیں مخاطب کرتی وہ پھر سے اندر ہونے والی گفتگو سننے کی کوشش کرنے لگی۔

اور اپنی ان کوششوں میں وہ اس حد تک مصروف و مشغول تھیں کہ انہیں عزرائیل کی آمد کا پتا ہی چل نہ سکا۔

''کیا ہو رہا ہے یہاں......''

سنجیدہ مگر دھاڑ سے مشابہ ''یہ'' آواز سن کر وہ چاروں لرز گئیں۔ عجلت میں عروین بی بی پلٹیں مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ باقی سب کا ملبہ بھی اس پر تھا۔ ٹھک، دھڑام، کی آوازوں کے ساتھ عینی پر نوین اور عزت مآب ماہا لڑھکتی ہوئی حیدر کے قدموں میں ایک لمحے کو تو حیدر بھی حیرت زدہ اور ''سحر زدہ'' رہ گیا۔ اس کی قدم بوسی کا یہ طریقہ شاید اسے بھایا نہیں تھا، سوا گلے پل ہی اس کا پارہ جو کم کم ہی زمین پر ہوتا تھا، آسمانوں پر جا پہنچا۔

''کیا کر رہی تھیں تم سب یہاں؟'' دانت پیستے ہوئے وہ ماہا کو بالکل ڈریکولا لگا۔

''وہ ہم......'' عینی نے تھوک نگل کر باقی تینوں کو مدد طلب نظروں سے دیکھا تھا۔ اور وہ سب ''مار آستین''، ''غداریاں'' نظریں پھیر کر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

''یقیناً پھر تم سب لوگ چھپ کر کن سوئیاں لینے کی کوشش کر رہی ہو گی۔ شرم آنی چاہیے تم لوگوں کو ایسی بچکانہ حرکت کرتے ہوئے۔''

حیدر شروع ہو چکا تھا اور اسے چپ صرف اللہ ہی کروا سکتا تھا۔

''آئندہ تم چاروں مجھے یہ کرتی نظر نہ آؤ۔'' اس کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ آخری وارننگ ہے جو ہمیشہ ہی خطرناک ہوتی ہے۔ اس لیے فرماں برداری سے سر ہلاتی وہ جلدی سے ماہا کے کمرے میں جانے لگیں۔ ماہا جو کچھ دیر پہلے اس کے قدموں میں جھکی ہوئی تھی اس دوران خفت زدہ چہرہ لیے ان کے پیچھے

لپکی۔

"اور تم ......" اسے بھاگتا دیکھ کر توپوں کا رخ اس کی جانب ہوگیا۔

"کتنی دفعہ منع کیا ہے کہ اپنی بدحواسیوں پر قابو پاؤ۔ ہر وقت گرتی پڑتی رہتی ہو۔"

باقی کا جملہ اس نے زیر لب بولا تھا اور کیا بولا تھا؟ ماہا کو پتا تھا۔ اس لیے اس کا دل چاہا کہ......

وہ باقی اس کو ڈانٹ پڑتا دیکھ کر تیزی سے بھاگ گئیں۔ خوب اچھی طرح بے عزتی کروا کر وہ جب کمرے میں پہنچی تو میر جعفر کی "رشتہ دار" اس کے پیچھے پڑ گئیں۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔" اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔ صدمہ شدید ہوا۔

"میری وجہ سے ......؟" صدمے سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"ہاں، کیونکہ تم ہی مری جا رہی تھیں ناں پاپا کا فیصلہ سننے کو۔" عروین اس پر چڑھ دوڑی۔ ماہا ان کی طوطا چشمی پر کچھ بول ہی نہ سکی۔

"سن لیا فیصلہ؟ دیکھ لیا حشر؟ کتنی بے عزتی ہوئی ہے ہم سب کی۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ تمہیں ہی ہڑک تھی۔ اگر اتنی ہی فکر مند ہو تو جاؤ اور جا کر پاپا سے کہہ دو کہ......"

"میں اسے شادی نہیں کر سکتی۔" عروین کی جذباتی تقریر میں عینی نے فلمی تڑکا لگایا تھا۔

"ہاں ...... یہی کہو۔ خواہ مخواہ میں اس ہٹلر کے جانشین کے ہاتھوں ہماری عزت خراب کردی۔"

ان سب کی بک بک سنتے اس کا پارہ بلند ہونے لگا۔ پتا تھا اگر ان مطلبی سکھیوں کو کچھ الٹا سیدھا بول دیا تو ان کی "مورل سپورٹ" سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ سو زبردستی آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کی گئی۔

"تم لوگ کیسی بہنیں ہو۔ میری اتنی سی مدد نہیں کر سکتیں۔" دل ہی دل میں انہیں گالیاں دیتے بظاہر بھرائی ہوئی آواز میں کہہ کر ان کے جذبات ابھارنے کی ناکام کوشش کی گئی مگر وہ بھی ایک نمبر کی ڈھیٹ تھیں، بالکل اثر نہ ہوا۔

"اور تم ...... تم عینی بھول گئیں۔ کہ میں نے تمہارے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ یاد کرو، کیسے سب کو حماد کے رشتے کے لیے راضی کیا تھا۔" اس نے غلطی سے پرانے زخموں کو چھیڑ دیا تھا۔ عینی کو تو پتنگے لگ گئے۔

"کیا کہا تم نے؟ ہاں یعنی کہ تم ماہا حسن، تم نے میرے یعنی قرۃ العین حسن کا رشتہ حماد سے طے کروایا تھا؟ ارے جاؤ جاؤ۔ تم نے تو رشتہ تڑوانے میں زیادہ اہم کردار ادا کیا تھا۔

حماد کی مما نے جب پوچھا کہ عینی کو کوکنگ آتی ہے تو تم نے سعادت مندی سے فرفر بتا دیا کہ بالکل نہیں۔ کتنی دفعہ سالن جلایا ہے میں نے۔ روٹی تو مجھ سے گول بنتی ہی نہیں۔ زکام کے دنوں میں میری بنائی چائے گھر بھر کے لیے جوشاندے کا کام کرتی ہے۔ برتن مانجھنے میں ناخن خراب ہوتے ہیں۔" ماہا کا ایک ایک لفظ یاد آ کر اس کا بلڈ پریشر بڑھا رہا تھا۔

ماہا منمنائی "وہ تو میں نے تمہارے بھلے کے لیے ہی کہا تھا۔ تم نے ہی تو بتایا تھا کہ حماد کی مما نہایت تعلیم یافتہ ہیں۔ سوشل ورکر ہیں۔ عورتوں کی آزادی کی قائل۔" عینی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"پر یہ تو نہیں کہا تھا کہ انہیں بہو بھی ایسی چاہیے۔ ماڈرن کی۔"

"وہ تو میں تمہاری گفتگو سے یہی سمجھی تھی کہ انہیں ماڈ بہو چاہیے ہو گی، اس لیے تمہارے بھلے کے لیے۔" وہ معصومیت سے بولی تھی۔

"میرے بھلے ......" عینی چیخی۔ عروین نے جلدی سے بڑھ کر اسے تھاما۔

"ریلیکس ...... ریلیکس۔"

"اس سے کہہ دو عروین! مجھ پر احسان جتانے

کی ضرورت نہیں۔ اس نے تو مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ حماد سے میرا رشتہ ہو گیا ورنہ میری کہانی ادھوری ہی رہتی۔"

اس نے فلمی انداز کا تڑکا لگانا ضروری سمجھا تھا۔ اس کی تقریر نجانے اور کتنی طویل ہوتی کہ نوین نے ٹوک دیا۔

"جو گزر گیا سو گزر گیا۔ اب اس بے کار کی بحث کو چھوڑو۔" اس کا مقصد عینی کو ٹھنڈا کرنا تھا مگر شاید اسے گرمی بہت پسند تھی۔

"کیوں چھوڑوں میں......"

"زیادہ ملکہ شراوت مطلب ملکہ جذبات بننے کی ضرورت نہیں ۔خاموش ہو جاؤ اب۔" اب کے عروین نے بھی بیزار ہو کر سختی سے ٹوک دیا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی۔

"اور ماہا! تم بھی ریلیکس ہو جاؤ۔ سوچتے ہیں تمہارے لیے بھی کچھ۔" ساتھ میں اسے بھی تسلی دی۔

"ہاں خود تینوں تو خوش نصیب ہیں جو چاہا پا لیا اور ایک میں۔" اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر خود کو غم زدہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور سر جھکا لیا۔

☆☆☆

کتنے دنوں بعد انہوں نے اس مسئلے کا ایک شان دار حل نکال ہی لیا تھا اور اب عمل درآمد کرنے سے پہلے تصدیق کرنا چاہ رہی تھیں۔

حمدان لاؤنج میں بیٹھا "بے بلیڈ" دیکھ رہا تھا۔ انہماک دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ عینی موبائل فون کان سے لگائے سامنے برآمدے میں لگی وال گلاس سے صاف نظر آ رہی تھی۔ عروین کچن میں جبکہ نوین وہیں بیٹھی میگزین دیکھ رہی تھی۔

"حمدان! یہ کیا لگا رکھا ہے۔ ہٹاؤ اسے۔" ماہا نے جھپٹ کر ریموٹ اس کے ہاتھ سے کھینچنے کی کوشش کی۔

"کیا ہے آپی! ابھی تو وقت ملتا ہے کارٹون دیکھنے کا۔" اس نے ریموٹ کو سختی سے بغل میں دبایا۔

"دیکھو، بدتمیزی مت کرو۔ دو مجھے۔" آگے بڑھ کر ریموٹ اس سے کھینچنا چاہا مگر اپنی جھونک میں وہ صوفے سے پھسل گئی۔

"اوئی اللہ......" بے ساختہ ہی ماہا کے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ عینی بھاگتی ہوئی اندر آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی گلاس ڈور دھکیل کر حیدر داخل ہوا۔ حمدان اسے اٹھانے کے بجائے دانت نکال رہا تھا۔ عینی کو دیکھا جس کی شکل پر بے حواسی و پریشانی تھی۔

"ایسے ہی میں عینی سے بدگمان ہوں۔ کتنی اچھی ہے عینی، میری وجہ سے گھبرا گئی ہے بے چاری۔" اس کے دل میں بہن کے لیے بے ساختہ پیار امڈا مگر اس کے پیچھے حیدر کو دیکھ کر اس کی سٹی گم ہوئی۔

"ایک تو اس کی انٹری ہمیشہ غلط وقت پر ہی ہوتی ہے۔" اسے بڑا غصہ آیا۔ عینی اس کی طرف آنے کے بجائے کچن کی طرف بھاگ گئی اور وہ ہکا بکا اسے دیکھتی رہی۔

"محترمہ! ہوش میں آ جائیں اور اٹھ جائیں۔" حیدر کی طنزیہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرا کر اسے ہوش میں لے آئی۔ حمدان اب تک مسکرائے جا رہا تھا۔

"خبیث! کیسے ہنس رہا ہے۔ بھائی نہیں ہے، یہ تو دشمن ہے میرا۔ آئے بھی یہ ہوم ورک کروانے یا جرنل بنوانے۔" دل ہی دل میں اسے کوستے وہ شرمندہ سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"حمدان، بڑی امی سے کہو، اس کی ٹانگوں کا علاج کروائیں۔ مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتیں۔"

حمدان سے کہتا وہ سیدھا سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ اس کی بات اور حمدان کے قہقہے اس کو پتنگے لگ گئے۔

"سمجھتے کیا ہیں خود کو۔ میری ٹانگوں کے بجائے

ان کے دماغ کا علاج کروانا چاہیے۔ ہونہہ بد دماغ کہیں کا۔" وہ غصے سے بڑبڑائی پھر اس کی طرف مڑی۔

"آنا تم خوشامدی ٹٹو! بنا لوں گی تمہاری ڈایا گرامز۔" حمران کو دھمکی دے کر وہ بھی کچن کی طرف بڑھ گئی تھی۔ جہاں عینی اب تک بدحواس تھی۔

"اف عروین! میرا دل ابھی تک بہت تیز دھڑک رہا ہے۔" دل پر ہاتھ رکھ کر ستر کے عشرے کی ہیروئینز کی طرح آنکھیں پٹپٹاتی ماہا کو زہر لگی۔

"مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوئی کہ حیدر آ گیا ہے۔ نجانے میری اور حماد کی کتنی باتیں سن لی ہوں گی۔ ہائے اسے تو یہ سب سخت ناپسند ہے۔ سچ اسے دیکھ کر تو مجھے کچھ اور سوجھا ہی نہیں۔ بس دوڑی دوڑی اندر آ گئی کہ کہیں چھپ جاؤں۔"

"اوہ تو یہ تھی حقیقت۔" ماہا نے دل میں سوچا۔

"اور میں بھی کہ وہ میری محبت میں، میری چیخ سن کر آئی ہے۔ کمینی، گھٹیا، اب کیسی بھیگی بلی بنی کھڑی ہے۔ اچھا ہوا جو اس ملک الموت نے اسے حماد سے ویڈیو کال پر اٹھکیلیاں کرتے دیکھ لیا۔" خیالوں ہی خیالوں میں اسے بے نقط سناتی وہ اس وقت چونکی جب نوین پوچھ رہی تھی۔

"تو تم اتنی کھوئی ہوئی تھیں اس ڈفر حماد کی باتوں میں کہ ان کی گاڑی کا ہارن بھی سنائی نہیں دیا۔"

"ڈفر...... حماد۔" اسے تو سخت صدمہ لگا۔

"کیوں بھول گئی ہو کہ حیدر کی گاڑی کل سے سروس کے لیے گئی ہوئی ہے۔" عروین نے یاد دلانے کے ساتھ نوین کو آنکھیں بھی دکھائیں مگر وہ بے نیازی سے کندھے اچکا کر رہ گئی۔

صدمے سے بے حال پھٹی آنکھوں سے نوین کو دیکھتی عینی اب تک یقین نہیں کر پا رہی تھی کہ اس کے ہیرو جیسے اسمارٹ اور ڈیشنگ فیانسی کو ڈفر کہا گیا تھا۔ ماہا کو البتہ ایک کمینی سی خوشی ہوئی۔ یوں بھی آج وہ ان سب سے ایک شدید قسم کے "خفیہ حسد" میں مبتلا ہو رہی تھی۔

"ماہا! تم وہاں دروازے میں کیوں کھڑی ہو؟ آ جاؤ بھئی۔ ہم سے کوئی پردہ تھوڑی ہے۔" نوین کی نگاہ اس پر گئی تو اسے بھی دعوت دے ڈالی، اس بات سے بے نیاز کہ عینی اب اسے کیسی کیسی صلواتیں سنا رہی تھی۔

☆☆☆

حیدر تایا ابو کا اکلوتا لخت جگر، تھا۔ گھر کا پہلا بچہ ......سو اس کے نخرے بھی خوب اٹھائے گئے تھے اور یہی اس کے بگاڑ کا سبب بنے (ماہا کی دانست میں) حسین تایا کے بعد احسن تھے۔ ماہا کے والد عینی ماہا سے ایک سال بڑی تھی اس کے بعد ماہا اور ماہا کے سات سال بعد حمران تھا۔ اسی طرح حسن چاچو کی بھی شروع میں دو لڑکیاں تھیں مہرین جو کہ ماہا کی ہم عمر تھی اور نوین جو ان دونوں سے سال بھر چھوٹی تھی۔ پھر یاسر تھا نوین سے پانچ سال چھوٹا۔ یوں ایک طرح سے اتنی لڑکیوں میں عرصہ تک حیدر اکلوتا لڑکا ہی رہا۔ جس کی وجہ بقول مرحوم دادی جان کے "لڑکیوں کے ڈھیر" میں وہ واحد اس گھر کا چشم و چراغ رہا۔

دادی جب تک زندہ رہیں اسے پلکوں پر بٹھائے رکھا۔ اس کا مزاج اتنا سڑیل کیوں تھا۔ حالانکہ وہ عینی سے صرف دو سال بڑا تھا مگر سب پر اتنا رعب تھا کہ لگتا کہ گھر کا واحد بزرگ وہی ہے۔ اور اس کو ایسا بنانے میں سارا قصور مرحومہ دادی جان کا تھا۔ جنہوں نے اس کو بگاڑنے اور چنگھاڑنے میں مقدور بھر حصہ ڈالا تھا۔ ان کی ساری زندگی ماہا سے نہ بنی۔ حیدر گھر کا پہلا لڑکا۔ اوپر سے شباہت میں دادا حضور سے ملتا سو دادی مرحومہ نہال ہو گئیں۔ اور اس کے بعد آنے والی لڑکیوں کی لائن نے اس کی اہمیت اور قیمت بڑھا دی۔

دادی نے تو ایک طرح سے اسے گود ہی لے

لیا۔ ہر وقت پہلو میں گھسائے رکھتیں۔ سینے سے لگائے فخریہ کہتی پھرتیں۔

"یہ تو سارا کا سارا کمال آفندی کی طرح ہے۔ ویسی ہی شکل ویسا ہی دبدبہ۔" مگر شومئی قسمت مزاج پورے کا پورا دادی مرحومہ والا۔ "تنک مزاج" غصہ ور اپنی منوانے والا ڈومینیٹنگ (یہ سب ماہا کے فرمودات تھے) ماہا پیدائشی کمزور بچی تھی۔ ہر وقت بیمار رہتی۔ سو چڑچڑا پن بہت تھا۔

ماما کے پیچھے پیچھے ان کا آنچل تھامے ریں ریں کرتی یہ بچی دادی کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

"کیسی بچی ہے۔ ہر وقت بجا ہی رہتا ہے اس کا بگل۔ مجال ہے جو کبھی اسے مسکراتا دیکھا ہو۔ بیماریوں کی پوٹ۔"

یمنیٰ اس کی نسبت بڑی ہنسی مسکراتی صحت مند بچی تھی۔ سو وہ ان کے زیر عتاب نہیں آئی تھی۔

"ہر وقت انجکشن ٹھکواتے رہو۔ بدن میں بھی اب خون کے بجائے دوائیاں دوڑتی ہوں گی۔"

ان کی تنقید تو نہیں سمجھتی تھی مگر دو سالہ کمزور سی ماہا ان کے کٹیلے تاثرات دیکھتی تو سہم جاتی۔ اور اگر وہ اکڑو بھی وہاں موجود ہوتا تو دانت نکالے اسے چڑاتا۔ اکثر اڑنگا دے کر گرا بھی دیتا۔ جس پر دادی کا پارہ مزید ہائی ہو جاتا اور وہ ایسی ڈرپوک کہ کبھی بھی چیخ کر اس کی شکایت نہ کر سکی۔ بس گھٹ گھٹ کر روتی اور دادی فرمائے جاتیں۔

"اس چوہیا میں بالکل جان نہیں ہے؟ دیکھو رو بھی نہیں سکتی۔ سفید چوہیا۔" ان کی یہ باتیں ماما کو بھی اچھی نہیں لگتی تھیں مگر ان کے سامنے مارے لحاظ کے کچھ کہہ بھی نہیں سکتیں۔

"بالکل چوہیا سی بچی پیدا کی ہے تم نے نزہت۔"

اور یہ سفید چوہیا اس کی چھیڑ بن گیا اور وہ حیدر آفندی وہ تو باقاعدہ گھڑ گھڑ کے نظمیں بناتا اور پھر با آواز بلند پڑھتا رہتا۔ ماما نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اسے زیادہ تر نانو کے پاس چھوڑے رکھتیں۔

دادی کی تیز نظروں اور نوکیلے جملوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ان کی سمجھ میں آیا تھا۔ ماہا بھی نانو کے ہاں خوش رہتی۔

دس سال کی عمر تک وہ زیادہ تر نانو کے پاس ہی رہی۔ حالانکہ دادی کو اس پر بھی اعتراض تھا مگر پھر چنگی بھلی دادی ایک معمولی سی بیماری میں چل بسیں۔ وہ اس وقت میٹرک میں تھی اور حیدر نیا نیا یونی ورسٹی گیا تھا۔ دادی کے جانے کا اس چنگیز خان پر اس کا بہت اثر ہوا۔

وہ بہت چپ چپ رہنے لگا تھا۔ دادی اس کے لیے سب کچھ تھیں اور پھر چند ماہ صرف چند ماہ بعد ہی ماہا کو یوں لگا جیسے مرحومہ دادی تو کہیں گئیں ہی نہیں بلکہ ان کی روح تو حیدر آفندی میں حلول کر گئی ہے۔

دادی مرحومہ کی ساری خصلتیں اور عادتیں محترم ہلاکو خان میں سما چکی ہیں۔ اس کی نکتہ چیں طبیعت اس کو نشانے پر لیے رکھتی۔ ماہا گو کہ اب ہر وقت بیمار نہ رہتی نہ بچپن والا رونا دھونا باقی رہا مگر اسے دیکھ کر وہ ضرور حواس کھو دیتی۔ دراصل قصور اس کی ان پاؤ پاؤ کی آنکھوں کا تھا۔ وہ جب گھور کر اسے دیکھتیں تو اس کے طوطے، کبوتر سب اڑ جاتے اور لاکھ بلانے پر بھی ٹھینگا دکھاتے، منہ موڑ کر اڑ جاتے۔ حالانکہ تایا تائی بہت نرم دل اور خوش مزاج تھے۔

دادی کے بعد تائی کی بات کو مقدم جانا جاتا۔ دونوں دیورانیاں اپنی بڑی جٹھانی کی بہت عزت کرتی تھیں۔ لڑکیاں بھی اپنی ماؤں کی نسبت تائی سے زیادہ قریب تھیں۔ جنہیں وہ اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز و پیاری تھیں۔ جبکہ حیدر آفندی۔ آفندی ہاؤس کا لائق و جینئس بیٹا جس کا اکیڈمک ریکارڈ شاندار تھا تو شخصیت لاجواب۔ جس نے کم عرصے میں بزنس

کے میدان میں جھنڈے گاڑ دیے تھے۔
دولت کی کمی نہ تھی مگر آفندی ہاؤس آج بھی روایتوں کو سینے سے لگائے اپنی حدود کا پاس کرتا تھا۔ یہاں کے مکین پڑھے لکھے، روشن خیال ضرور تھے مگر آزادی کے نام پر بے حیائی اور بدلحاظی نہ تھی۔ بڑوں کا احترام کیا جاتا تھا اور اسی کی تربیت سب کو تھی۔ اسی لیے لڑکیاں اس سے جھجکتی تھیں بقول عینی کے۔
''اس نے غصہ میں ایم فل اور طنز میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے۔''
اسے لڑکیوں کا یوں آزادی کے نام پر کھلے عام گھومنا پسند نہ تھا اور اس کے حکم کا سکہ گھر میں چلتا بھی تھا۔ دادی مرحوم کا اصل جانشین جو تھا۔

☆☆☆

''اوئی اللہ ایک خبر سنو سکھیو!'' وہ سب حسب معمول عینی اور ماہا کے کمرے میں بیٹھی گپیں ہانک رہی تھیں۔ رات کے کھانے میں ابھی وقت تھا سو اطمینان سے اپنی سرگرمیوں میں مشغول تھیں جب نوین بھاگی آئی۔
''کیوں کیا ہوا؟ خیر تو ہے؟ کہیں پاپا نے منگنی کا باضابطہ اعلان تو نہیں کر دیا۔'' ماہا کی رنگت اڑ گئی۔ آواز کانپنے لگی۔
''تمہارے سر پر تو ہر وقت یہی بات سوار رہتی ہے۔ بھئی۔ یہ خبر تو عینی کے حوالے سے ہے۔''
نوین نے چڑ کر پہلے اسے ڈانٹا اور پھر عینی کو دیکھا جو یہ سن کر اچھل پڑی تھی۔
''کیا ہوا؟ خیریت کہیں حماد کی مما نے انگیجمنٹ تو نہیں توڑ دی۔''
عینی، ماہا سے زیادہ بدحواس ہو گئی۔ عروین جلدی سے اس کے ہاتھ پاؤں سہلانے لگی۔ نوین اس ستر کے عشرے کی ہیروئن سے چڑ گئی۔
''جی نہیں اگر وہ یہ غلطی کرنا چاہیں بھی تو ہم انہیں نہیں کرنے دیں گے کہ تمہیں ساری زندگی سر پر سوار رکھنے کا مطلب ایک مصیبت خود اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے ڈالنا ہے۔''
نوین کی صاف گوئی پر اسے تو آگ ہی لگ گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ جوابی حملہ کرتی نوین جلدی جلدی بتانے لگی۔
''حماد بھائی تشریف لائے ہیں۔ بنفس نفیس خود اور وہ بھی بالکل اکیلے۔'' خبر تھی کہ بہار جس نے عینی کے چہرے پر یہاں سے وہاں تک پھول ہی پھول کھلا ڈالے تھے۔
منگنی کے بعد جتنی مرتبہ بھی حماد آیا، ساتھ میں اس کی مما لازمی ہوتیں اور آج وہ اکیلا آیا تھا۔ سنہرا موقع تھا۔
حماد اس سے دو سال سینئر تھا اور یونیورسٹی کب کا چھوڑ چکا تھا اور یونی ورسٹی ملنے آنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا کہ عینی نے اسے پہلے اشارے کنائیوں اور بعد میں واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ ماہا کسی بات کو راز نہیں رکھ سکتی۔ ادھر ماما یا حیدر کی ایک گھرکی۔ ادھر اس نے سب اگل دینا ہے سو نہ چاہتے ہوئے بھی وہ محتاط ہو گیا۔
''ہائے سچ نوین! سچ کہہ رہی ہو۔ حماد آئے ہیں۔'' اسے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ شادی مرگ کی کیفیت تھی۔
''جی نہیں جھوٹ بول رہی ہوں حماد نہیں ڈونلڈ ٹرمپ تشریف لائے ہیں۔'' وہ مزید چڑی مگر عینی نے اس گستاخی پر کچھ نہیں کہا۔
''میں ذرا اس سے مل آؤں۔'' وہ ایک ہی جست میں بیڈ سے اتری۔ عروین بے چاری جواب تک اس کے ہاتھ سہلا رہی تھی، اس کی پھرتی پر ہکا بکا رہ گئی۔ ''کہاں تو محترمہ گری جا رہی تھیں اور کہاں اتنی چستی۔ واہ کیا اعلا اداکاری کی تھی۔'' ابھی وہ دروازے سے نکلنے بھی نہ پائی تھی کہ نوین کی آواز نے روک لیا۔

''جناب! واپس تشریف لے آئیے۔ حماد بھائی نیچے حیدر بھائی کے ساتھ تشریف فرما ان کی دانش وری سے مستفید ہو رہے ہیں۔ تائی جی نماز پڑھ رہی ہیں اور باقی تو گھر میں کوئی ہے ہی نہیں۔''

پاپا کے بزنس پارٹنر کے بیٹے کی شادی تھی سو باقی لوگ ادھر گئے ہوئے تھے۔ اس کا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ منہ لٹکائے وہ واپس بیڈ پر آ کر گر گئی۔

''ہائے میری قسمت۔ یار و کچھ کرو۔ کسی طرح رخ یار کا دیدار کروادو۔''

وہ دہائیاں دینے لگی عموماً مایوسی میں وہ ایسی ہی گاڑھی اردو بولنے لگی تھی کیونکہ اردو ادب میں ماسٹرز کر رہی تھی سب کی مخالفت کے باوجود کہ سخت نالائق تھی۔ پڑھائی سے بھاگنے والی سو اپنی دانست میں سب سے آسان مضمون چنا تھا مگر کیا پتا تھا کہ وہ بھی دن میں تارے دکھادے گا۔

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟ سوائے دعا کے۔'' ماہا کے سینے میں ٹھنڈی سی پڑ گئی۔ خود پر پڑی تو کیسی مظلومیت کے ڈھنڈورے پیٹ رہی ہے۔ اس نے کمینگی سے سوچا۔

''نوین! اتنا ہی بتادو کہ لگ کیسا رہا ہے کس قسم کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ بالوں کا اسٹائل کیسا ہے۔''

''قسم سے سخت چغد لگ رہے ہیں۔ کپڑے تو انسانوں والے پہنے تھے مگر شکل البتہ غیر انسانی لگ رہی تھی اور بال تو بالکل ''ہپی اسٹائل'' کے بنائے ہوئے ہیں۔''

وہ سوچ سوچ کر بتا رہی تھی۔ عینی کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں جبکہ ماہا اور عروین کو اپنی ہنسی چھپانی مشکل ہو رہی تھی۔

''سچ تم سچ کہہ رہی ہو؟''

''بھئی، مجھے کیا پتا! خود ہی جا کر دیکھ لو اپنے حماد کو۔'' اس نے گویا سکھ کا سانس لیا۔

''یہی تو اصل مسئلہ ہے۔ خود جا کر کیسے دیکھ لوں۔ ادھر ہلاکو خان بیٹھا ہے، وہ ایسا کرنے دے گا۔'' اس نے بے چارگی سے کہا۔

''تو کیا انہوں نے مجھے دعوت نظارہ دی تھی کہ آؤ نوین بی بی۔ آ کر بطور اس کا جائزہ لو اور جا کر قرۃ العین صاحبہ کی تسلی و تشفی کرواؤ۔ جونہی سلام کے بعد بیٹھ کر خیریت پوچھنے لگی فوراً آنکھیں دکھا کر اٹھا دیا کہ جاؤ جا کر امی کو بھیجو۔''

''ہائے ربا۔ مجھ پر یہ ظلم بھی ہونا تھا۔ ظالم سماج دو دلوں کو چپکے چپکے ملنے بھی نہیں دے رہا۔ حماد ہم بے وفا ہرگز نہ تھے۔''

وہ فلمی انداز میں دہائیاں دے رہی تھی۔ اس کی حالت پر ترس تو خیر کیا آنا تھا کہ پتا تھا ڈراما کر رہی ہے۔ البتہ ایک آئیڈیا عروین کے زرخیز دماغ میں پٹ سے آ گیا۔

''ایک بمباسٹک آئیڈیا آیا ہے۔''

''بتاؤ..... جلدی بتاؤ، کیا حماد سے ملاقات ہو سکتی ہے؟'' وہ بے صبری اتاؤلی ہوئی جا رہی تھی۔

''ہونہہ بے صبری کہیں کی۔''

''ہاں اور ماہا تمہارا کام بھی ہو سکتا ہے۔ ادھر آؤ دونوں۔''

وہ دونوں اس کے قریب آ گئیں۔ ذرا دیر بعد ہی ماہا کانپتے، لرزتے قدموں کے ساتھ ڈرائنگ روم موجود تھی۔ جہاں حیدر سنجیدگی سے حماد کے ساتھ مصروف گفتگو تھا۔

''یا اللہ مدد فرما جل تو جلال تو۔'' کا ورد کرتی اس نے سلامتی بھیجنی چاہی۔

''السلام وعلیکم حماد بھائی۔'' حلق سے عجیب سی پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی تھی۔

حیدر کے ساتھ باتوں میں مصروف حماد چونکا اور پھر متوقع سالی کو دیکھ کر خوش گوار لہجے میں جواب دینے کے بعد اس کے آس پاس نظریں دوڑانے لگا۔

حیدر کو اسے دیکھ کر لمحے بھر کو حیرت ہوئی مگر وہ بے نیاز بنا رہا۔

''کیسی ہو ماہا.....'' وہ خوش دلی سے اس کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔ جواب دیتے ہوئے اس نے حتی الامکان حیدر کو دیکھنے سے گریز کیا تھا مبادا اس کا اعتماد ہی متزلزل نہ ہو جائے۔

''اور سنائیں حماد بھائی۔''

''کیا سناؤں۔'' حماد بھائی کی خوش اخلاقی عروج پر تھی۔ اس کی یونہی اچانک نظر صرف ایک لمحے کو حیدر کی جانب ہوئی جو بڑی خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔ وہ بے ساختہ گڑبڑا گئی۔ زبان بھی غلط موقع پر پھسل گئی۔

''آپ چائے لیں گے یا ٹھنڈا۔''

جملہ غلط موقع پر۔ غلط بندے کو دیکھتے ہوئے نکل گیا تھا صرف ایک لمحے کو حیدر کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔ پھر اس کی سنجیدہ سی آواز آئی۔

''میں چائے پی چکا ہوں۔ تم حماد کے لیے ٹھنڈا لے آؤ البتہ۔''

ماہا کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ کیا غضب ہو گیا تھا۔ ساری خوش اخلاقی، ساری بہادری اڑن چھو ہو گئی۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے باہر نکلنے لگی جب پیچھے سے وہی منحوس آواز آئی۔

''اور ہاں اگر امی نماز سے فارغ ہو گئی ہوں تو ''انہیں'' بھی بھیج دینا۔'' مطلب تھا۔ ''انہیں'' ہی وہ بھاگنے کے سے انداز میں نکلی مگر بیڑہ غرق ہو اس آرائشی گملے کا۔ ٹھاہ سے اس کے پاؤں سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا گئی۔ انگوٹھے میں الگ درد ہونے لگا تھا۔

حماد فکرمندی سے اس کی جانب بڑھا مگر یہ اور بات کہ حیدر کو اسے اٹھتا دیکھ کر با دل نخواستہ اٹھنا ہی پڑا۔ قریب جا کر ذرا سا جھکا، ماہا کے حواس جواب دینے لگے۔ حیدر کو اس کی جانب جاتا دیکھ کر حماد دوبارہ بیٹھ گیا مگر اس کا دھیان ان ہی کی طرف تھا۔

''دفع ہو جاؤ اور مجھے دوبارہ بھی کسی مہمان خصوصاً اپنے مہمان کے سامنے نظر نہ آؤ۔ تمیز، سلیقہ نام کو نہیں تمہیں۔''

دھیمے لہجے میں دانت پیستے ہوئے بول رہا تھا۔ پھر...... پھر کیا تھا۔ اچانک ہی ماہا سب درد بھول بھال گئی اور دوڑ لگاتی نکلتی چلی گئی۔ اس کے انداز تو حماد کو بھی حیرت میں ڈال رہے تھے۔

حماد کب گیا۔ عینی کی اس سے ملاقات ہوئی کہ نہیں۔ اسے کچھ پتا ہی چل نہ سکا جب عینی کمرے میں آئی تو وہ سوتی بن گئی مگر عینی کی بڑبڑاہٹ صاف سن رہی تھی جو سارے گھر میں اس کو تلاش کرنے کے بعد اسے اطمینان سے سوتا دیکھ کر اس کی شان میں قصیدے پڑھتی خود بھی سو گئی۔

☆☆☆

اگلے دن جب اس نے انہیں سارا واقعہ سنایا تو ان کا دل اپنا سر پیٹنے کو چاہا۔

''تم کبھی بھی سدھر نہیں سکتیں۔ بھلا گملے سے ٹکرانے کی کیا ضرورت تھی۔'' عینی نے غصیلے لہجے میں کہا۔

''میں کوئی جان بوجھ کے تھوڑا ہی ٹکرائی تھی، وہ تو اچانک ہی کہیں سے گملا سامنے آیا اور مجھ سے ٹکر ہو گئی اس میں میرا کیا قصور؟'' وہ روہانسی ہو گئی۔ انگوٹھا الگ سوجا ہوا تھا اوپر سے ان کی تنقیدیں۔

''جی ہاں۔ گملا تو خود چل کر آیا ہوگا اور بصد اصرار فرمائش کی ہو گی کہ ماہا ذرا مجھ سے ٹکرا جائیں۔ ٹھاہ کر کے۔'' عینی کے طنز پر نوین نے اسے ٹوک دیا۔

''بس کرو عینی! اب اس مسئلے کا حل سوچو۔ بے چاری ماہا۔ ساری زندگی کیسے ایک ایسے سڑیل بندے کے ساتھ گزار سکتی ہے جو بات کرے تو لگے ڈانٹ رہا ہے۔''

نوین کی ہمدردی پا کر ماہا نے جھٹ سر جھکا کر مگر

مجھ کے آنسو بہانے چاہے مگر وائے رے قسمت۔ ہمیشہ ایسے وقت پر دغا دے جاتی ہے۔

''ہم کیا سوچیں؟ ہمت تو اسے خود کرنی ہوگی۔'' عروین بولی۔

''اور آج ہی سے تمہیں جو کہا جائے اس پر عمل کرنا ہوگا۔ اگر خوش گوار من چاہی زندگی چاہتی ہو تو ہمت پیدا کرو۔ ڈر کو بھگاؤ۔ ساری زندگی خوش رہو گی ورنہ۔'' عینی نے بھی سمجھایا۔

''بس آج سے ماہا احسن تیار ہو جائیں۔'' نوین نے اعلان کیا۔

''دل مضبوط رکھو۔ اسی میں تمہاری بھلائی اور تمہارا روشن مستقبل پوشیدہ ہے۔'' وہ سب ہی اپنی بولیاں بولتی اسے مضبوط کر رہی تھیں، کئی گھنٹوں کی مغز کھپائی کے بعد ماہا نے عہد کیا، سب کچھ کرے گی چاہے اس کی جان ہی نہ چلی جائے۔

☆☆☆

تینوں لڑکیاں بک تھیں۔ عینی اور حماد ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور بغیر ظالم سماج آئے۔ منگنی کروا کے دن رات محبت کے نغمے گا رہے تھے۔

عروین کی بات اپنے خالہ زاد سے طے تھی جو آج کل امریکہ میں مقیم اعلا تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ رہ گئی نوین تو اس کے ماموں نے اسے بچپن سے مانگ رکھا تھا جو اسلام آباد میں رہائش پذیر تھے اور ان کا سپوت بی بی اے کر رہا تھا۔ ہر مہینے دو مہینے بعد اسلام آباد سے ڈھیروں گفٹ نوین کے لیے آتے اور ہر دوسرے دن فون پر اس کی خیریت پوچھی جاتی۔

منگیتر الگ اس کی بے نیازی پر مرا جاتا (کیونکہ نوین بی بی کو 'اوچھی' حرکتیں جو کہ حماد اور عینی کرتے تھے پسند نہ تھیں) وہ سب ہی نوین کی قسمت پر با جماعت رشک کرتی تھیں اور اب صرف ایک پیس بچا تھا جو اپنی طرز کا ایک ہی تھا اور آج کل اسے ٹھکانے لگانے کے انتظامات کیے جا رہے تھے اور جس کے ساتھ ٹھکانے لگایا جا رہا تھا اس کے ساتھ ٹھکانے لگنے سے بہتر تھا کہ تھانے لگا دیا جاتا۔

☆☆☆

تائی جان کچن میں مصروف تھیں۔ وہ لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتی۔ چپس نمکو کھانے میں مگن تھی۔ ماما، چچی کے ساتھ گروسری اسٹور گئی تھیں۔ وہ بڑے انہماک سے ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ اور ہیروئین کی مہارت اور غضب کی اسمارٹنس پر سر دھن رہی تھی۔ جب سلام کی آواز پر اچھل پڑی۔ خلاف توقع بے وقت حیدر کو دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے۔

ہڑبڑا کر اس نے ہاتھ میں پکڑے ریموٹ سے چینل بدلنا چاہا مگر غلطی سے والیم کا بٹن پش ہو گیا اور آواز مزید اونچی ہو گئی۔ اور حیدر جو ٹی وی کی طرف متوجہ نہیں تھا مڑ کر اسکرین کو دیکھنے لگا۔

ماہا نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ ایک ہی جست میں ٹی وی تک پہنچی اور پاور کا بٹن دبا دیا۔ اس سارے عمل میں وہ ہانپ گئی۔ حیدر کی اس وقت آمد نے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا۔ اس کی پھرتیاں ملاحظہ کرتے حیدر نے ایک سنجیدہ سی نظر اس کے خفت سے سرخ چہرے پر ڈالی تھی اور نجانے کیوں نظر انداز کر گیا۔

''امی کہاں ہیں؟''

وہ پوچھ رہا تھا۔ مگر کس سے؟ ماہا نے تصدیق کے لیے ارد گرد دیکھا، آیا وہ اسی سے مخاطب ہے یا کسی اور سے۔ حیدر خلاف معمول بڑے تحمل سے اس کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ جب اچھی طرح یقین کر لینے کے بعد وہ بغیر کسی سابقے لاحقے کے اس سے مخاطب ہے اس نے کچن کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ بھی خاموشی سے کچن کی جانب بڑھ گیا۔ یا حیرت۔

ماہا تو بے ہوش ہونے والی تھی۔ یعنی کہ حیدر آفندی نے آج تو نہ کوئی ڈانٹ پلائی۔ نہ ہی طنز کیا۔

''الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا چنگیز خان کی۔'' یقیناً آج طبیعت ناساز ہے۔ اسی

لیے خلاف عادت سب کچھ کر رہے ہیں۔ اس نے وال کلاک کو دیکھا جہاں ساڑھے بارہ بج رہے تھے اور وہ تو شام کو آتا تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں تھی۔ آج یونیورسٹی سے چھٹی کر لی تھی کیونکہ پڑھائی کر کر کے بقول اس کے اس کا دماغ اُبل گیا تھا (جو بقول نوین کے پہلے ہی کھسکا ہوا ہے) لہٰذا ذہن کو ری فریش کرنے کے لیے آرام سے گھر میں مزے کر رہی تھی۔

اور اس کی اس اچانک چھٹی پر سب سے زیادہ خوش عینی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ بھنگڑے ڈالے۔ حماد کو بھی میسج کر کے یونی ورسٹی آنے کو کہہ دیا تھا۔

''ماہا......'' تائی جان کی آواز پر وہ خیالوں سے چونکی اور کچن کی طرف چلی آئی۔

''جی تائی جان!''

''بیٹا جانو! حیدر کی شرٹ پریس کر دو۔'' انہوں نے پیار سے درخواست کی۔ کام والی بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ نجانے کہاں تھی۔

''کیا میں ......'' اس کے فرشتے کوچ کرنے لگے جتنا وہ اس سے دور بھاگنا چاہتی تھی، اتنا ہی اس کے ''متھے'' لگنا پڑتا تھا۔

''لیکن تائی جان! ان کے کپڑوں کو کیا ہوا ہے۔ ٹھیک ہی تو ہیں۔'' وہ ہر قیمت پر حیدر کے کام سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ تائی ہلکا سا مسکرائیں۔

''دراصل حیدر کو ضروری کام سے اسلام آباد جانا ہے۔ کہہ تو رہا ہے کہ رات تک آ جائے گا مگر تم پھر بھی اس سے پوچھ کر احتیاطاً دو ایک سوٹ پیک کر دو۔''

مسالہ بھونتے تائی نے ازلی نرم لہجے میں بتایا۔

چاروناچار جانا ہی پڑا۔ وہ آج کے منحوس دن کو کوسنے لگی کہ کیوں چھٹی کی اور مفت کی مصیبت مول لے لی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر وہ اندر داخل ہوئی۔ حیدر موبائل پر کسی سے باتوں میں مصروف تھا۔ شاید ابھی نہا کر نکلا تھا۔ تولیہ گردن کے گرد لپٹا ہوا تھا اور بال بھی سلجھے ہوئے نہیں تھے۔ باتیں کرتے کرتے اس نے گردن گھما کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''تائی جان نے کہا ہے کہ آپ کی شرٹ استری کر دوں۔'' اس نے اپنی آمد کا مقصد بیان کر دیا اور اب منتظر تھی۔ حیدر نے انگلی سے وارڈروب کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ ذرا جھجکتی اس کی وارڈروب کی طرف آئی۔ کھول کر دیکھا مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کون سی شرٹ نکالے۔ ویسے یہ تو ماننے والی بات تھی کہ اتنی آرگنائزڈ وارڈروب تو ان لڑکیوں کی بھی نہیں تھی۔

''واہ جناب سلیقہ مند ہیں۔'' سراہنا تو بنتا تھا۔ حیدر گو کہ باتیں کر رہا تھا مگر دھیان اسی طرف تھا۔ اس کی الجھن محسوس کرتے اس نے فون ذرا سا کان سے ہٹا کر اس کی مشکل آسان کر دی۔

''وائٹ والی کالرڈ شرٹ پریس کر دو۔'' اس نے شرٹ نکال لی۔ وہ فون بند کر کے بالکنی میں شاید تولیہ پھیلانے چلا گیا۔ احتیاط سے اس کی شرٹ پریس کر کے وہ کمرے میں لائی تو وہ کہیں نظر نہ آیا۔

''ہیں، یہ کہاں چلے گئے؟'' اس نے سوچا پھر کھسکنے لگی مگر نگاہ سامنے رکھے سی ڈیز ریک پر پڑی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔

''اوہ تو یہ مزے ہیں جناب کے۔ یقیناً نورا فتحی یا نرگس کے ڈانس کی۔'' دل ہی دل میں اسے کمینی سی خوشی ہونے لگی۔

''ہونہہ بڑے پارسا بنتے ہیں اور اندر سے کیا ہیں۔'' وہ انہیں الٹنے پلٹنے کی نیت سے ریک تک پہنچی جب پیچھے سے حیدر کی آواز آئی۔

''یادداشت۔'' وہ اچھل پڑی۔ ''یہ کہاں سے برآمد ہوئے ہیں۔'' حالانکہ دیکھ لیا تھا کہ ڈریسنگ سے آمد ہوئی ہے۔

''جاؤ اب کھڑی کیوں ہو۔'' طوطا چشمی کی حد

کرتا اس کی گیٹ لاسٹ کا سگنل دیتی آنکھیں اور تاثرات پر ماہا کے گال بے عزتی کے احساس سے تپ اٹھے۔ اس نے ایک خوں خوار نظر اس بدتمیز پر ڈالی جواب شرٹ کے کف بند کر رہا تھا اور غصے سے کمرے سے نکل گئی۔

''ال مینرڈ ...... بدتمیز۔'' دل ہی دل میں اسے القابات سے نوازتی وہ نیچے آئی۔ جہاں دونوں خواتین تشریف لا چکی تھیں۔ چچی نے اس کے پھولے چہرے کو دیکھا تو پوچھنے لگیں۔

''کچھ نہیں چچی جان بس کسی کا خیال آ گیا تھا تو آگ لگ گئی۔''

''خیر ہو بھئی۔ ایسی کون سی ہستی ہے۔ جس کا خیال بھی جلا دیتا ہے۔ پھر تو سردی میں خوب یاد کرنا تاکہ آگ تاپ سکو۔''

انہوں نے شریر انداز میں مشورہ دیا۔ وہ بڑی زندہ دل تھیں۔ وہ مسکرا پڑی۔

''مشورے کا شکریہ۔ عمل کروں گی۔ یہ بتائیں اتنی دیر کیوں لگا دی۔ کیا کیا خریدا ہے۔'' ماما بھی فریش ہو کر آ گئیں اور وہ ان کی لائی گئی اشیاء دیکھنے لگی۔

☆☆☆

ان سب کے آنے پہ سارا قصہ گوش گزار کیا گیا تو وہ اسے تسلی دینے لگیں۔

''ویسے ماہا یار! تم بہت ڈرپوک ہو۔ تم بھی سنا دیتیں موصوف کو۔ ذرا پتا چلتا انہیں کہ بے عزت ہو کر کیسا لگتا ہے۔'' نوین نے مشورہ دیا۔

''اور نہیں تو کیا۔ موصوف بہت ہی اونچی شے سمجھتے ہیں خود کو۔ احسان فراموش کہیں کے۔'' عینی کو بھی بہن کی بے عزتی بری لگی۔

''میں سنا دیتی تو مجھے جواباً کیا کچھ برداشت کرنا پڑتا۔ اگر اتنی ہمت ہے تو تم لوگ کیوں نہیں کہہ دیتیں۔ خواہ مخواہ مجھے الٹے سیدھے مشورے دینے کی ضرورت نہیں۔''

''ایک تو تم سے ہمدردی کر رہے ہیں اور تم ہو الٹا ناراض ہو رہی ہو۔''

بہن کی محبت وحبت میت سب بھول بھال گئی۔ عینی برا مان گئی۔

''ویسے ماہا! تم کو یقین ہے کہ وہ سی ڈیز ایسی ویسی تھیں۔ مطلب ......'' عروین تو کسی اور ہی سوچ میں تھی۔

''صد فی صد۔'' اس نے بڑے یقین سے کہا۔

''ہو سکتا ہے وہ اسلامی درس کی ہوں۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔'' عروین کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ دراصل حیدر کا ٹیسٹ ایسا نہیں تھا، ناچ گانے دیکھنے والا۔

''اچھا درس کی سی ڈیز کو کوئی اتنا لپیٹ لپاٹ کر رکھتا ہے بھلا۔ یقیناً ایسی ویسی ہی ہوں گی۔''

''مطلب کیا ہے تمہارا۔ اگر اتنی لپیٹ کر رکھی ہوئی تھیں تو تمہیں نظر کیسے آ گئیں۔'' نوین نے بھی طنز کیا۔

''مت کرو یقین۔ دوسروں کو نصیحت خود میاں فصیحت۔ یہاں وہ والا معاملہ ہے۔'' اس کا یقین پختہ تھا۔

''عروین! دو کپ چائے بنا کر حمان کے ہاتھ بھیج دو۔''

ملک الموت کی آواز پر وہ سب بے اختیار پلٹی تھیں۔ وہ کچن کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس کے گمبھیر تاثرات دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ موصوف کیا کچھ سن چکے تھے۔

''آ...... آپ حیدر بھائی۔ آپ کب آئے؟'' ہوش پہلے عینی کو آیا۔ ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ کیونکہ آخری مصدقہ اطلاع کے مطابق تو موصوف ٹیک آف کر چکے تھے۔

"میں گیا کب تھا۔ پلیز دو کپ چائے۔" اسی انداز میں کہتا وہ مڑ گیا۔

"ہیں...... یہ...... یہ کیسے؟" ماہا کو تو لگ رہا تھا کہ اس کے حواس شاید ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ سب اسے غصے سے دیکھنے لگیں۔

"نجانے کب آئے ہوں۔ کیا کچھ سنا ہو۔ ماہا تیری تو خیر نہیں۔"

نوین کو اس سے البتہ ہمدردی ہو رہی تھی۔ اور اسے اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا صاف نظر آ رہا تھا۔ اپنی جوان مرگی پر ابھی سے اس پر رقت طاری ہو رہی تھی۔

ایک ضروری دوست کے آ جانے کی وجہ سے اس کا جانا ڈیلے ہو گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ کوئی نیا پراجیکٹ شروع کر رہا تھا۔ چار بجے وہ اسلام آباد کے لیے نکل گیا۔ سب کے بہلانے اور سمجھانے پر وہ بھی مطمئن ہو گئی تھی۔ یقیناً اس نے کچھ نہیں سنا تھا۔ سورات کو وہ سب کالونی کی واک پر نکل گئیں۔

سمندری ٹھنڈی ہوائیں اٹھکیلیاں کرتی موڈ خوش گوار کر گئیں۔ واک کرتے وہ سب مین روڈ تک نکل آئیں۔

آئس کریم پارلر سے عینی نے سب کو ان کی من پسند آئس کریم کھلائی پھر گپ شپ کرتی وہ اطمینان سے گھر آئیں۔ اور لاؤنج میں حیدر کو دیکھ کر ساکت ہو گئیں۔ آج کا دن ہی خراب تھا جو بار بار سارے اندازے غلط ہو رہے تھے۔ ڈرتے ڈرتے کلاک کی جانب نگاہ کی۔ بارہ بج چکے تھے۔ وہ خود حمدان اور یاسر کو بھی ساتھ لے کر نہیں گئی تھیں بلکہ زبردستی ڈانٹ کر انہیں گھر میں بٹھا دیا تھا اور حیدر کو تفریح پر کوئی اعتراض نہ تھا مگر یوں ان سب کا اتنی رات گئے اکیلے گھومنا پسند نہیں تھا۔

حیدر نے تو خیر صرف نظروں سے ہی وارننگ دی تھی مگر مما اور چاچو نے تو خوب ڈانٹا۔ حمدان اور یاسر دانتوں کی نمائش کرتے اس ساری صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ان دو معصوموں کو کیسے زبردستی گھر پر چھوڑ دیا گیا تھا آخر کار تایا اور تائی کی مداخلت سے انہیں رہائی نصیب ہوئی اور انہوں نے شکر کا کلمہ پڑھتے اپنے ٹھکانوں کا رخ کیا۔

☆☆☆

چچی جی لاؤنج میں کپڑے پھیلائے بیٹھی تھیں تائی اور ماما بھی موجود تھیں۔

"یہ سوٹ مجھے اچھے لگے تھے تو میں نے خرید لیے ہو دیکھیے بھابھی۔ اچھے ہیں ناں۔" وہ آج شاپنگ کر کے آئی تھیں۔ دونوں خواتین کپڑوں کو ہاتھوں میں اٹھائے جانچ رہی تھیں۔

"بہت اچھے ہیں اور خوب صورت بھی۔ عروین کے لیے ہیں؟" تائی نے پوچھا۔

"جی بھابھی، بھائی صاحب اب شادی پر اصرار کر رہے ہیں۔ سبطین امریکہ سے آنے والا ہے۔ عروین کا بھی بس لاسٹ سمسٹر ہے۔ سوچتی ہوں بھائی جی سے مشورہ کر کے کوئی مناسب تاریخ رکھ لیتے ہیں۔"

چاچی کے بھائی کی اپنی کنسلٹنگ فرم تھی۔ جما جمایا بزنس تھا۔

"عروین اور عینی۔ دونوں کی شادی اکٹھی کریں گے۔ حسین نے سوچ لیا ہے۔"

"احسن بھی یہی کہہ رہے تھے بھابھی۔ حماد کے گھر والے بھی تقاضا کر رہے ہیں۔" تائی نے سر ہلایا۔

"اور ماہا کا معاملہ بھی اگر نپٹا لیا جائے۔" تائی نے ماما کو دیکھا۔ انہوں نے بھی تائید کی۔

"اللہ بچیوں کے نصیب اچھے کرے۔ انہیں اپنے گھروں میں خوش آباد رکھے۔" تائی کی دعا پر

انہوں نے دل میں آمین کہا اور یہ سب سنتی نوین کو یقین ہوگیا کہ ماہا کا وقت پورا ہو چکا۔
ماہا تو خود پریشان تھی۔ ماہا نے اب تک اس سلسلے میں کوئی بات ہی نہیں کی تھی کہ وہ کوئی رائے دے سکتی یا اعتراض اٹھاتی۔ اور یہی بات اسے ڈپریس کر رہی تھی۔
''ہائے تیرا کیا بنے گا ماہا احسن۔'' اور اس دن تو حد ہوگئی۔ جب شام کو دادا مرحوم کے ریکارڈ پر وہ غم زدہ غمگین ہیروئن بنی۔ سر میز پر رکھے سن رہی تھی اور نیر بہا رہی تھی۔
''پنجرے کے پنچھی رے۔ تیرا دردنہ جانے کوئی۔ تیرا دردنہ جانے کوئی۔''
عروین اسے تلاشتی آئی تو اس قدر نحوست پھیلانے پر دل چاہا، دو چار جوتے تو لگا ہی دے۔ مگر خیر۔ ہمدردی بھی محسوس ہوئی۔
''اٹھو ماہا۔ یوں کب تک سوگ مناتی رہوگی۔ دنیا بزدلوں کے ساتھ نہیں ہوتی۔ جاؤ اور اپنے حق کے لیے لڑو۔'' اس نے ایک اداسی اسے دیکھا پھر گہری سانس خارج کرتے آہ سی لی۔
''نہ چھیڑو ہمیں۔ ہم ستائے ہوئے ہیں
بہت زخم سینے پر کھائے ہوئے ہیں''
''ایک ریکارڈ کیا کم تھا۔ جو تم بھی بجنے لگی ہو۔'' اس کی بےسری آواز کو بمشکل ہضم کرتے اس نے زبردستی اسے اٹھایا۔
''آؤ بڑی زبردست سی چٹ پٹی چاٹ بناتی ہے مل کر کھاتے ہیں اور غم بھگاتے ہیں۔''
چاٹ کے نام پر اس نے فی الوقت سب غموں کو پسِ پشت ڈالا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر دوران دعوت سب کے ہمت دلانے پر حیدر سے براہ راست بات کرنے پر راضی ہوئی۔
''دیکھو، دل مضبوط رکھنا۔''
''ڈرنا نہیں۔''
''ہمت مرداں مدد خدا۔''
''تمہاری ساری زندگی کا معاملہ ہے یہ۔''
اسے طرح طرح سے حوصلہ، دلاسا دیتے انہوں نے حیدر کے کمرے کی طرف دھکیلا۔ وہ بھی دل کڑا کر کے پہلے مرحلے کے لیے تیار ہوگئی۔
دروازے پر دستک دے کر وہ اندر چلی آئی۔
کمرے میں بہت اندھیرا تھا۔ پردے گرے ہوئے تھے۔ اسے ذرا ڈر لگا۔ کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا تو آگے بڑھ کر اندازاً لائٹ لگائی۔ بٹن کی آواز سے سارا کمرہ پل بھر میں روشن ہوگیا۔ بیڈ پر لیٹے حیدر نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹا کر اس دخل در معقولات کرنے والے کو دیکھا۔ ماہا کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پوری کھل گئیں۔
وہ سرعت سے اٹھا اور سائیڈ پر رکھی شرٹ پہننے لگا اور ماہا اس دوران سخت شرمندہ اور گھبرائی کھڑی تھی اسے قطعاً خیال نہیں آیا کہ وہ اس وقت آرام کی حالت میں ہوگا۔ شرٹ پہننے کے بعد وہ غیض و غضب سے اس کی جانب پلٹا۔
''کیوں آئی ہو؟'' اس کا سوال متوقع تھا، اب یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ آپ کی صورت دیکھنے کو دل مچلے جا رہا تھا یا یہ کہ آپ سے شادی نہیں کر سکتی، یہ کہتے کیونکہ اس کی اپنی پوزیشن سخت آکورڈ لگ رہی تھی سو بہانہ گھڑا۔
''وہ میں چائے لے کر آئی تھی۔''
''چائے؟ اچھا کہاں ہے وہ چائے۔'' اس نے حسب عادت طنزیہ انداز میں اس کے خالی ہاتھوں کو دیکھا۔
''نہیں، دراصل میں چائے کا پوچھنے آئی تھی آپ سے، تائی جان نے کہا ہے۔'' اٹک اٹک کر کہتی وہ ذرا روانی سے بولنے لگی۔ جواباً وہ کچھ کہے بغیر یونہی اسے دیکھے گیا۔ گہری نیند سے بیدار ہوئی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس کا دل کانپنے

لگا۔ وہ ہمت کر کے پلٹی۔

"میرا خیال ہے، اب میں چلتی ہوں۔ آپ شاید چائے نہیں پینا چاہتے۔"

وہ دروازے تک پہنچی جب پیچھے سے وہ ٹھنڈے لہجے میں بولا۔

"اگر آئندہ بغیر ناک کیے تم یوں میرے کمرے میں گھسیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ اور دوسری بات۔ میرے لیے ایک کپ چائے اور دو ڈسپرین بھجوا دینا۔ اب جاؤ تم۔"

اور وہ کیا کیا منصوبے بنا کر آئی تھی جب ناکام پلٹی تو ان سب نے مل کر وہ حشر کیا کہ اس نے ساری گھبراہٹ، لڑکھڑاہٹ کو خیر باد کہہ دیا۔

☆☆☆

گھر میں شادی کی ہلکی پھلکی تیاریاں شروع ہوگئی تھیں۔ عینی تو خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ دل تو چاہتا تھا کہ خوب بھنگڑے ڈالے۔ ماما نے بھی اب حماد سے زیادہ بات چیت کرنے پر پابندی لگا دی تھی، عروین البتہ نارمل تھی۔ خوش تو ماہا بھی تھی کہ خاندان کی پہلی پہلی شادیاں تھیں مگر اپنی فکر اسے کم ہی بے فکر ہونے دیتی۔

تینوں بزرگ خواتین سرفراز ماموں کے ہاں گئی ہوئی تھیں۔ حمدان اور یاسر میچ کھیلنے گراؤنڈ میں۔ مرد حضرات ابھی دفتر سے نہیں لوٹے تھے۔ میدان خالی تھا۔ سو عروین کے زرخیز دماغ نے پلان بی پر عمل درآمد کے لیے اس وقت کو آئیڈیل قرار دیا تھا اب تیاری شروع کی گئی۔ حیدر کی آمد میں کچھ وقت تھا۔

"تم ایسا کرو ماہا۔ یہ سوٹ پہنو۔" عینی نے ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایک زرق برق سوٹ نکالا تھا۔ اس کے لشکارے دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

"یہ......" ماہا کی چیخ سے مشابہ آواز نکلی۔ یہ میرون سوٹ بطور عیدی نوین کے لیے آیا تھا۔

"ہاں کیا خرابی ہے اس میں۔" وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر مڑی۔

"خرابی؟ اس میں خوبی کون سی ہے۔ نا بھئی میں کوئی کسی شادی پر جا رہی ہوں جو ایسا بھڑکیلا، چمکیلا لباس پہنوں۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"زیادہ نخرے دکھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہیں اپنا مستقبل عزیز ہے اور حیدر سے چھٹکارا پانا ہے تو جیسا ہم کہیں، اس پر عمل کرو۔" عروین نے زور دے کر سمجھایا۔

"لیکن یہ تو......" اس نے کچھ کہنا چاہا۔

"بس چپ، فضول میں کج بحثی کیے جا رہی ہو۔ حیدر کو ڈیسنٹ اور سمپل لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ یہ چمک چھلو ٹائپ کی لڑکیاں سخت زہر لگتی ہیں اسے۔ اگر تم اس سے براہ راست بات کر کے اپنا انکار نہیں پہنچا سکتیں تو خود کو ایسا بنا کر پیش کرو کہ وہ خود تمہیں ریجیکٹ کر دے۔"

عروین کی تقریر میں اسے لفظ ڈیسنٹ اور ریجیکٹ دونوں پر اعتراض تو شدید ہوا مگر صبر کے گھونٹ پی کے رہ گئی۔ اس وقت ان سے بگاڑ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ سب آ کے ڈریسنگ اسٹول پر بیٹھا کر جت گئیں اور جب فخریہ مسکراتی ہٹیں تو خود کو آئینے میں دیکھ کر اس کی چیخ ہی نکل گئی۔

اتنا ڈارک اور ہیوی میک اپ۔ ڈارک میرون لپ اسٹک۔ آئی شیڈ اور بلش آن وہ بالکل کسی سرکس کی جوکر لگ رہی تھی۔ بال بھی کھول کر شانوں پر بکھیر دیے تھے۔ بس ہاتھ میں بال تھمانے کی کسر رہ گئی تھی۔

"میں کیا کسی مقابلہ چڑیل میں جا رہی ہوں جو اتنا تیز میک اپ کر دیا ہے تم سب نے، اوپر سے یہ ڈریس اور کھلے بال۔" وہ جیسے رو دینے کو تھی جواباً تینوں دانشور بن کر اسے ڈانٹنے لگیں اور افادیت پر

لیکچر دینے لگیں کہ گاڑی کے مخصوص ہارن نے انہیں مزید پرجوش کردیا۔

''لگتا ہے حیدر آگیا ہے۔ چلو اٹھو اور دکھا دو کہ تم کسی سے کم نہیں۔''

''مگر عروین! میں اس حلیے میں اس کے سامنے کیسے جاؤں گی۔'' وہ بے چارگی و عاجزی سے بولی۔

''اٹھو پیاری بہن۔ ہمت پکڑو۔ اگر آج یہ سنہری موقع ضائع کردیا تو زندگی بھر پچھتانا پڑے گا۔''

سمجھاتے بجھاتے وہ اسے پورچ تک لانے میں کامیاب ہوگئیں اور پھر اسے چھوڑ کر خود غائب۔ وہ بے چینی سے ہاتھ ملتی اس کے آنے کا انتظار کررہی تھی۔ نجانے گاڑی کو ڈرائیو وے پر روکے وہ کیا کررہا تھا۔ گاڑی آئی اور حیدر کے ساتھ کوئی اجنبی صورت دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہوگئے۔ اور گاڑی سے باہر آیا حیدر خود مجسمہ بنا ساکت کھڑا اس نمونے کو پہچاننے کی کوشش کررہا تھا۔ اجنبی بھی یقیناً شاکڈ رہ گیا تھا۔ ایسا حسن اس نے شاید زندگی بھر نہیں دیکھا تھا۔ اس کے پسینے چھوٹنے لگے۔

''وہ بدتمیز، خود تو گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئی ہیں اور مجھے اس عجیب صورت حال میں چھوڑ گئی ہیں۔''

کیا کرے کیا نہ کرے۔ اس نے عقل استعمال کرتے ہوئے سلام جھاڑا۔

''السلام وعلیکم بھائی جان۔'' فرماں برداری و تابع داری کے ریکارڈ توڑتے اس نے سلام کیا اور تیزی سے دروازے کی طرف مڑی۔ بھاگنے میں ہی عافیت تھی۔ مگر بیڑا غرق۔ عینی کی ہائی ہیل لڑکھڑائی مگر خود کو سہارا دینے کے لیے پیچھے آتے حیدر کا بازو تھاما اور شاید کچھ زیادہ ہی زور سے پکڑلیا تھا کہ اس کے لمبے ناخن اس کے بازوؤں میں کھب سے گئے۔

''حیدر! ہو از شی۔'' وہ دوسرا قدرے حیرت سے پوچھ رہا تھا۔ حیدر نے اس کا ہاتھ سرعت سے ہٹایا اور مڑا۔ اس کے یوں بے دردی سے ہاتھ جھٹکنے پر وہ دوبارہ لڑکھڑائی مگر جلد ہی سنبھل گئی۔ وہ کون تھا۔ ماہا نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

وہ منظر سے فوراً غائب ہوگئی۔ اندر آکر اسے خود پر بھی سخت غصہ آیا جو یہ بے وقوفانہ حرکتیں ان تینوں کے کہنے پر کررہی ہے۔ رات تک وہ اپنے کمرے میں بند رہی۔ ماما کے بہت کہنے پر وہ کھانے کے لیے نہیں نکلی۔

حیدر کا کوئی دوست آیا تھا۔ جس نے ڈنر ادھر ہی کیا تھا۔ ان سب کو بھی اس صورت حال کا اندازہ نہ تھا اب اسے تسلی دیے جارہی تھیں۔ پاپا خود آئے اس کے کمرے میں وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے انہیں بھی ٹال گئی۔ اس ہلاکو کا سامنا کرنا بڑا دل گردے کا کام تھا آج۔

مگر کب تک۔ اگلا پورا دن بھی وہ بجھی بجھی سی رہی۔ ماما بھی فکرمند ہوگئیں۔ یوں بھی شروع سے ہی وہ بہت نازک رہی تھی۔ وہ انہیں تسلی دے کر بہلانے لگی۔ مگر رات کو جب اس کی طلبی کا پیغام دے کر حمدان معنی خیزی سے مسکراتا رفو چکر ہوا، تب سب حقیقی معنوں میں پریشان ہوگئیں۔ وہ یہ پیغام نظر انداز کرنا چاہتی تھی مگر جب یاسر بھی آیا تو اسے مجبوراً جانا پڑا۔

کمرہ وہی تھا۔ اور جج بھی وہی۔

''ڈھیٹ بنی رہنا۔ کھا نہیں جائے گا تمہیں۔'' عینی کی نصیحت یاد آئی تو ذرا حوصلہ بڑھا۔

''ہوں۔'' حیدر کرسی سے اٹھا اور اس کے مقابل کھڑا ہوگیا۔ بغور اس کا جائزہ لیتے اس نے

ایک ایک لفظ پر زور دے کر پوچھا۔
"اس سب ڈرامے کا مقصد کیا تھا؟"
"کس ڈرامے کا۔" بھیگی مرغی جیسی آواز نکلی تو خود پر غصہ آیا۔
"بہادر بنو ماہا......" اس نے خود کو ڈانٹا اور حیدر کو دیکھا جو جواب طلب انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"وہی ڈرامہ جو تم نے میرے آنے پر کیا تھا کل۔" کل پر زور دیا گیا۔
"مگر میں تو اس وقت کوئی ڈرامہ نہیں دیکھ رہی تھی۔" ڈھٹائی زندہ باد.. اس نے سوچا۔
"میں ٹی وی والے ڈرامے کی بات نہیں کر رہا۔" وہ اب بھی بڑے تحمل و سکون سے بول رہا تھا۔
"جی میں سمجھی نہیں۔" اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔
"دیکھو ماہا! میری نرمی کا ناجائز فائدہ مت اٹھاؤ۔" اس کا ضبط جواب دینے لگا تھا۔ اور اسے زچ کرتی ماہا کی بہادری بھی بس رخصتی چاہتی تھی کہ اتنے میں "فاران ایڈ" آ پہنچی۔
"حیدر بھائی! وہ ماما بلا رہی ہیں اسے۔" عینی آگے بڑھی۔
"اس کا فون آیا ہے بہت ضروری۔ اس کی فرینڈ کی پرنانی کا انتقال ہو گیا ہے اور اس خوشی میں کل ایک فنکشن ہے۔ اسی کی تیاری کرنی ہے۔ اچھا خدا حافظ چلو ماہا۔"
عروین عینی الٹا سیدھا بولتی افراتفری میں اسے ہانک کر لے گئیں۔ ایسے کہ وہ جینئس ہٹلر بھی ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ معاملہ کیا تھا۔ سمجھا ہی نہیں۔

☆☆☆

دونوں لڑکیوں کی ڈیٹ فکس ہونے والی تھی۔ اور گھر میں کام بہت بڑھ گئے تھے۔ وہ بھی سب بھول بھال کر تیاریوں میں لگی تھی۔ سوچ لیا تھا کہ جو ہوگا۔ دیکھا جائے گا۔ صاف انکار کر دے گی۔
چچی جان کے کمرے میں وہ لیٹی تھی۔ کیونکہ ابھی ان کے ساتھ اس نے کافی کام کروایا تھا۔ اتوار کو حماد اور سبطین کی فیملی ڈنر پر انوائیٹڈ تھیں۔ اسی دن ڈیٹ فکس ہونی تھی۔ چچی جان نے ابھی سے خریداری شروع کر رکھی تھی۔ ابھی بھی وہ ان چیزوں کی لسٹ بنا لی اور جو مزید آنا ہے ان کی لسٹ بنا کر فارغ ہوئی تھی۔ نوین تائی جی کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ عینی اور عروین دونوں اپنے بوتھے سنوارنے پارلر گئی ہوئی تھیں۔ حالانکہ نوین نے کہا بھی۔
"حماد اس چہرے کو روزانہ سو بار دیکھتا ہے۔ ایویں فضول میں پیسے خرچ کر رہی ہو خود پر۔"
مگر آج کل وہ کم ہی کسی بات کا مانتی تھی۔ ماما اسے تلاش کرتی اندر آئیں۔
"کتنی آوازیں دے ڈالیں مگر تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔" وہ انہیں دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔
"کوئی کام تھا آپ کو۔"
"کام تو نہیں مگر ایک ضروری بات کرنی ہے تم سے۔" اس کے قریب بیٹھتے انہوں نے محبت سے اسے دیکھا۔ وہ ان کے کندھے سے سر لگا گئی۔
"جی بولیے، سن رہی ہوں۔"
"بیٹیاں کتنی جلدی بڑی ہو جاتی ہیں۔ دیکھو تو ذرا۔ کل کی بات ہے جب تم اور عینی اتنی اتنی سی میری گود میں تھیں اور آج۔" ان کی آنکھوں میں نمی چمکی۔ وہ بے اختیار ان کے گرد بازو کا حلقہ بنا گئی۔
"اداس مت ہوں ماما۔ میں تو ہوں گی نا آپ کے پاس۔"
"ہاں اب لگتا ہے کہ تم میرے پاس، میرے قریب ہمیشہ رہ سکو گی۔" ان کی بات پر وہ نا بھی

سے انہیں دیکھنے لگی۔

''بات یہ ہے ماہا! کہ حیدر کے ایک فرینڈ کا پرپوزل آنے والا تھا تمہارے لیے۔ تمہیں اگر یاد ہو تو اکبر بھائی کے گھر میلاد کے فنکشن میں ہماری ملاقات تمہارے پاپا کے فرینڈ کی فیملی سے ہوئی تھی۔'' انہوں نے یاد دلایا۔ اسے بھی یاد آ گیا۔

وہ ڈیسنٹ سی آنٹی۔ جو لندن سے آئی تھیں۔

''ان کا بیٹا ہوتا ہے لندن میں۔ بزنس کرتا ہے۔ بہت اچھی فیملی تھی مگر نجانے کیوں بھابھی نے انہیں انکار کر دیا۔ حالانکہ تمہارے پاپا نے بھابھی کے کہنے پر رضامندی دے دی تھی۔ مگر چونکہ کچھ فائنل نہیں ہوا تھا سو تم سے ذکر ضروری نہیں سمجھا۔''

''اوہ اچھا تو وہ میٹنگز اس سلسلے میں تھیں۔ مگر تائی نے انکار کیوں کر دیا۔''

وہ سمجھ گئی کہ انہیں حیدر کو لے کر غلط فہمی ہوئی تھی جہاں اس نے سکھ کا سانس لیا، وہاں افسوس بھی ہوا کہ لندن پلٹ کو منع کیوں کر دیا گیا۔ اور ماما بتا رہی تھیں۔

''مگر اب بھابھی نے حیدر کے لیے بات کی ہے۔ اور تمہارے پاپا اور ہم سب اس رشتے پر بہت خوش ہیں۔ تم بتاؤ، تم کیا کہتی ہو۔'' اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''ماما حیدر۔ پلیز ماما۔'' اس سے تو بات ہی پوری نہیں ہو رہی تھی۔

اس کے رنگ بدلتے چہرے کو دیکھتی ماما ذرا پریشان ہو گئیں۔''

''کیا ہوا ماہا...... کیا تم راضی نہیں ہو؟ تمہارے تایا، تائی نے بڑے مان و دعوے سے مانگا ہے تمہیں۔ اور سچ پوچھو تو یہ میری بھی شدید خواہش تھی کہ میری ایک بیٹی۔ میری نظروں کے سامنے رہے۔ پھر حیدر بہت بہترین لڑکا ہے۔ دیکھا بھالا۔ صورت و سیرت دونوں میں بے مثال۔''

ماما اس کی مدح سرائی میں معروف تھیں۔ اگر سب راضی ہیں تو اس سے پوچھ کر...... پاپا کر کون سی فارمیلٹی نبھائی جا رہی تھی۔

''ماما! میں اس رشتے پر راضی نہیں ہوں۔ حیدر مجھ سے بہت مختلف ہے۔ وہ مشرق ہے تو میں مغرب۔ ہم دونوں کا مزاج۔ سوچ۔ کچھ بھی نہیں ملتی ماما۔''

اس کے اس قدر واضح جواب پر ماما چپ کر گئیں، وہ ان کے بولنے کی منتظر۔ انہیں دیکھے جا رہی تھی جو سخت مایوس نظر آ رہی تھیں۔

''تم ایک دفعہ پھر سے سوچ لو۔ اتنی جلد بازی اچھی نہیں ہوتی۔ وقت لینا ہے تو لے لو۔ مگر یوں۔'' انہیں شاید ماہا سے صاف انکار کی امید نہ تھی۔ کہنا تو وہ بہت کچھ چاہتی تھیں مگر ان کے بجھے چہرے کو دیکھ کر خاموش ہی رہی۔

☆☆☆

رات جب یہ بات اس نے ان چاروں کو بتائی تو سب چونک گئیں۔

''یہ دوست وہی تو نہیں جو ڈنر پر بھی آئے تھے۔ جب ماہا جوکر...... مطلب تیار ہوئی تھی۔'' نوین کی دور کی کوڑی لائی اور پھر تصدیق بھی ہو گئی۔

''مجھے لگتا ہے تمہارا اتنا بونگا حلیہ اسے پسند نہیں آیا ہو گا۔ اسی لیے بھاگ لیا۔''

نوین نے تجزیہ کیا پر اسے وہ ہینڈسم لڑکا یاد آ گیا جو حیدر کی گاڑی سے نکلا تھا۔

''ہائے میرے نصیب کتنا ہینڈسم تھا وہ۔ کم از کم اس کھڑوس، سڑو حیدر سے تو سو گنا اچھا۔'' اس کا افسوس دو چند ہو گیا۔

اس کے انکار کی بھنک حیدر کو بھی پڑ گئی تھی۔

اتوار کو چونکہ تاریخ طے ہوئی تھی سو کام بھی زیادہ تھا۔ وہ بھی مصروف تھی۔ دونوں دلہنیں تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی مزے کر رہی تھیں۔ وہ آتے جاتے انہیں جتا رہی تھی۔ دونوں شاہانہ انداز میں مسکرائے جا رہی تھیں۔

''ماما جان! ایک چائے کا کپ اسٹڈی میں پہنچا دو۔'' چچی جی نے آواز لگائی۔ وہ فلاسک سے چائے کپ میں ڈال کر اسٹڈی میں آئی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ البتہ لیپ ٹاپ آن تھا یوں جیسے کوئی کام کرتے کرتے چھوڑ گیا ہو۔

اس نے کپ احتیاط سے ٹیبل پر رکھا اور جانے کو مڑی جب وہی سی ڈیز کا پیکٹ اسے وہاں نظر آیا۔ اس کا تجسس جاگ اٹھا۔ آگے بڑھ کر اس نے ایک سی ڈی نکال کر دیکھا۔ سلور کلر کی چمکتی سی ڈی بظاہر عام سی لگ رہی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے لیپ ٹاپ میں وہ سی ڈی ڈالی۔ فائل مینگ میں پھر جا کر اسے کھولا۔ پر ان میں شاید صرف ڈاکیو مینٹس تھے۔

اس نے دوسری سی ڈی بھی لگائی مگر کچھ نہ ملا۔ اچانک ہی ایک ہاتھ پیچھے سے آیا تھا اور اس کے ہاتھ میں تھامی سی ڈی کو پکڑ لیا۔ وہ ڈر کر مڑی۔ وہ حیدر تھا۔ وہ شاید کام کرتے کرتے اٹھ کر گیا تھا۔ وہ خجل سی ہو گئی۔

''دیکھ لیں سی ڈیز۔ کر لی تصدیق کہ یہ کوئی ایسی ویسی سی ڈیز نہیں ہیں۔'' وہ کیا جتانا چاہ رہا تھا۔ وہ سمجھ کر مزید کھسیا گئی۔ یعنی اس نے ساری گفتگو سنی تھی۔ مگر کمال ہے، اس نے کچھ کہا نہیں۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' اب مزید کیا کہتی۔

''میں سب مطلب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم یہ بتاؤ، انکار کیوں کر رہی ہو۔'' وہ یوں اچانک براہ راست پوچھ بھی سکتا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اب اس کے منہ پر کیسے اس کی برائیاں بتا سکتی تھی سو جلدی سے جانے کو پر تولنے لگی۔

''وہ مجھے بہت کام کرنے ہیں۔ میں نے''

''مجھے معلوم ہے، تم کتنی مصروف ہو مگر اس وقت جو پوچھا ہے۔ اس کا جواب بھی بہت ضروری ہے۔ ہاں بتاؤ۔ وجہ کیا ہے؟''

چیئر پر اطمینان سے بیٹھتے اس نے چائے کا کپ اٹھا کر گھونٹ لیا پھر اس کے رنگ اڑے چہرے کو بغور دیکھنے لگا۔ اس کا انداز اسے مزید بوکھلائے دے رہا تھا۔

''یوں تو محترمہ کی زبان خوب چلتی ہے مگر اس وقت تو لگتا ہے فرشتے بھی کوچ کر گئے ہوں جیسے۔'' اس نے سوچا تھا۔

''یہ سب تمہاری مرضی تھی نا تو اب یوں نخرے کیوں کر رہی ہو۔''

''میری مرضی کیا مطلب۔'' وہ چونکی۔

''ہر وقت مجھے متوجہ کرنے کو تم کیا کیا جتن کرتی رہتی تھیں۔ میرے حواسوں پر سوار رہنے کے لیے ڈرامے بھی خوب کیے تم نے، اب جب سب تمہاری خواہش کے مطابق ہو رہا ہے تو پھر یہ انکار کیوں؟''

اطمینان سے چائے پیتے اس کا لہجہ اسے آگ لگا گیا۔

''آپ کو کس نے کہا ہے کہ یہ میری مرضی ہے۔ کیسے اتنے دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو متوجہ کرنے کے لیے ڈرامے کرتی تھی۔ آپ کی توجہ حاصل کرنے کو۔''

اس نے کمال اطمینان سے اس کی بات کاٹ دی۔

''تو پھر ان سب کا مقصد کیا تھا؟''

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں.....'' اس

نے ہاتھ اٹھا کر پھر اسے بولنے سے روک دیا۔
"اگر میں غلط بھی رہا ہوں تو جہانگیر کے سامنے تم اس قدر آکورڈ حلیے میں کیوں آئی تھیں؟"
وہ تمہیں ہی دیکھنے آیا تھا۔ مگر تمہاری بدحواسیاں اور اتنا چیپ حلیہ دیکھ کر اس نے مجھ سے صاف کہہ دیا کہ اسے ایسی چھمک چھلو اور میک اپ زدہ لڑکیوں سے الرجی ہے۔ وہ سوبر اور ڈیسنٹ لڑکیوں کو پسند کرتا ہے۔ تم اس کے معیار سے کہیں آگے کی تھیں۔
حالانکہ اس رشتے پر میں نے سب کو راضی کر لیا تھا۔ بات تقریباً فائنل ہونے والی تھی مگر اب کیا کیا جائے۔ تمہاری پرسنالٹی نے سب کچھ بگاڑ دیا۔
"میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔" وہ چیخ گئی۔ "جناب کس خوش فہمی میں ہیں۔"
"پھر کیا تھا تمہارا میرے لیے بجنا سنورنا۔ حالانکہ تم جانتی ہو۔ مجھے یہ فضول حرکتیں قطعی پسند نہیں۔" اس نے باقی ماندہ چائے ایک گھونٹ میں ختم کر کے کپ رکھا۔ پھر قدرے معنی خیزی سے اس کے زچ ہوتے چہرے کو دیکھ کر لطف اٹھایا۔ (اس نے بھی مجھے کتنا تنگ کر رکھا تھا)
"اب چھپاؤ مت ۔ میں سب جان گیا ہوں۔ مگر یاد رکھنا۔ مجھے لڑکیوں کی یہ آزاد روی نہیں۔ پسند تم میری کزن ہو۔ میرے گھر کی عزت۔ اس لیے میں نے فوراً آگے بڑھ کر تمہارا ہاتھ مانگا ہے۔ تمہاری مشکل آسان کی ہے تاکہ کل کو تمہارے بارے میں کوئی بات نہ کر سکے۔ سب یہی سمجھتے ہیں کہ رشتہ میری مرضی سے طے ہو رہا ہے مگر میں جانتا ہوں۔ حقیقت کیا ہے۔"
تم فکر مت کرو۔ تمہارا راز ہمیشہ راز ہی رہے گا۔ آفٹر آل میں آفندی ہاؤس کا بڑا بیٹا ہوں۔ اس کی عزت میں نہیں سنبھالوں گا تو کون سنبھالے گا۔"
ماہا کا فشار خون بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ کس قدر خباثت سے یہ سب کہہ رہا تھا۔ وہ خوش فہمی کا شکار اکڑ رہا یہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس پر فدا ہوں۔ اف میرے خدا۔ مارے غم و بے بسی کے اس سے کچھ بولا نہیں جا رہا تھا۔
"ہاں یہ بھی سمجھ لینا کہ میں چھپ چھپا کر کچھ بھی کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ ہر کام ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ہوں۔ یہ ی ڈیز بہت ضروری ڈاکیومنٹس کی تھیں۔ اس لیے ان کو احتیاط سے رکھا تھا۔"
سی ڈیز اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی گئیں۔ وہ تو صدمے سے بت بنی اسے دیکھے جا رہی تھی جو حرکتیں اسے متنفر کرنے کو کی تھیں وہ تو الٹا اس کے گلے پڑ گئیں۔ وہ مغرور اس کے عوض اسے اپنا کر احسان کا ٹوکرا اس کے سر پر لاد رہا تھا تاکہ ساری زندگی وہ اس کے بوجھ سے دبی رہی۔
"ہائے یہ کیا ہو گیا تھا۔"
"لگتا ہے شادی، مرگ ہو گیا ہے تم کو۔ ہونا بھی چاہیے۔ مجھ جیسا لائف پارٹنر ہر لڑکی کا خواب ہوتا تھا۔ اور تمہیں تو بن مانگے تمہاری چاہت مل رہی ہے۔" اس کی خود پسندی ...... اسے زور کا دھچکا لگا اور ہوش آیا۔
"یہ آپ کی غلط فہمی + خوش فہمی + خود ستائی ہے۔ میرا ایسا کوئی مقصد نہیں تھا۔ آپ خود سے نجانے کیا کیا افسانے بنائے جا رہے ہیں۔"
"اچھی مشرقی لڑکیاں یونہی کہتی ہیں۔ چلو کچھ تو مشرقیت تم میں زندہ ہے۔" اس نے جیسے خراج تحسین پیش کیا۔
"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں۔" وہ جھنجھلانے لگی۔ آخر کیسے اسے یقین دلائے۔
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" وہ یوں بولا جیسے بچوں کی کسی بچکانہ بات پر بڑے پچکارتے ہیں۔
"آپ ...... آپ مجھے کچھ بولنے دیں گے۔" وہ زچ ہو رہی تھی۔ رونا الگ آ رہا تھا۔
"ہائے ...... یوں بھی تقدیر پلٹا کھا سکتی ہے۔"

بولنا ..... ضرور بولنا۔ بڑی امی کے سامنے اب یہ انکار تمہارے منہ سے نہ سنوں ۔ اچھی لڑکیوں کی طرح شرافت سے بڑوں کے فیصلے پر سر جھکا دینا ورنہ دوسرا آپشن ہے۔

''عابد کا رشتہ بھی آیا ہوا ہے اور میں چاہوں تو سب کو اس پر بھی راضی کر سکتا ہوں اب جاؤ۔''

قدرے رکھائی سے کہتا وہ وارننگ دے کر لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گیا اور ماہا اسے تو دن میں بھی تارے نظر آنے لگے تھے۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ باہر نکلتی اس کی وارننگ کو سوچ رہی تھی اور اس کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

وہ پڑھا لکھا جاہل عابد۔ جس کی پانچ فٹ دو انچ ہائیٹ پر وہ خاندان بھر میں ''کوڈو'' کے نام سے مشہور تھا۔ اور جس کی گھنی مونچھیں دیکھ کر جنگل کا خیال آتا تھا۔ چمکتا ہر گنج پن کا شکار تھا اور ہر لڑکی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جاتا ہابی۔

''ہائے میری سکھیو ...... بیڑا غرق ہو تم لوگوں کا۔ تمہارے الٹے سیدھے مشوروں نے مجھے کس حال میں پہنچا دیا ہے۔ اللہ کرے حماد تمہیں دیکھ کر پہچاننے سے انکار کر دے اور عروین شادی والے دن تمہیں موشن لگ جائیں اور سبطین کو کرونا ہو جائے۔ ایک دوسرے کو دور دور سے دیکھو ...... ترسو۔''

وہ بددعائیں دیتی بے تحاشا روئے جا رہی تھی۔ وہ تینوں نا سمجھی سے اس کے آنسو دیکھے جا رہی تھیں۔ دل میں کیا کیا کہا جا رہا تھا وہ تو سیکرٹ تھا نا کہ زبان پر لا کر ان کی مورل سپورٹ سے ہاتھ نہیں دھو سکتی تھی۔ یہ تو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا تھا۔

اور جب بات کھلی تو نوین سے ہنسی روکنا دشوار ہو گیا جبکہ وہ دونوں اس کے غم میں برابر کی شریک تسلی دیے جا رہی تھیں۔ اور اسٹڈی میں لیپ ٹاپ کو بھولے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے حیدر آفندی اس ساری صورت حال کو سوچتا لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کے لٹکے ہوئے سرخ چہرے کو تصور میں لاتا مسکراتے ہوئے سوچے جا رہا تھا۔

اس دن اس قدر جلوؤں نے حیدر آفندی کی آنکھیں چکا چوند کر دی تھیں۔ تو جہانگیر کی بھی اس نازک سی لڑکی میں دلچسپی محسوس کر کے نجانے کیوں برا لگا تھا گو کہ وہ آیا ہی اسے دیکھنے تھا مگر اس کا دل چاہا کہ وہ سارے منظر سے ماہا کو غائب کر دے ، ڈارک میرون کپڑوں میں اس کی انتہائی سفید رنگت چمک رہی تھی گو کہ اتنا ہیوی میک اپ اور کھلے بالوں کو دیکھتا وہ بھی حیرت زدہ رہ گیا تھا مگر جب اس نے خود کو سنبھالنے کے لیے اس کا سہارا لیا تو اتنے پاس سے اس کی وہ بھی آنکھیں اسے عجیب سے احساسات سے دوچار کر گئیں۔ پھر بہت سوچنے کے بعد اس نے جہانگیر والے رشتے پر امی سے بات کی اور اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا۔

وہ بے پایاں خوش ہو گئیں۔ اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا۔ سب معاملات آسانی سے طے ہو گئے مگر ماہا کے انکار نے اسے دھچکا پہنچایا۔ پھر نوین کو راز دار بنا کر اس نے سب کچھ اگلوا لیا۔ وہ مان گیا تھا کہ یہ گھی سیدھی انگلی سے نہیں ٹیڑھی سے ہی نکلے گا۔ سب کچھ ویسا ہی ہوا جو اس نے سوچا تھا۔ ماہا کو اپنی باتوں میں پھنساتا، وہ اس کے تاثرات کو دیکھتا وہ اپنی مسکراہٹ روک رہا تھا۔ جانتا تھا تیر نشانے پر بیٹھا ہے اور نتائج بھی من پسند آئیں گے۔ اب بس انتظار تھا تو اس کی ہاں کا۔

ویسے وہ اب تک بے یقین تھا کہ اس دن وہ اسے کیسے کسی پری، کسی مس ورلڈ سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ شاید کیوپڈ کا تیر یونہی چلتا ہے۔ اور وہ بے وقوف شاید کبھی نہ جان سکے کی اس سرکس کے جوکر والے حلیے میں وہ حیدر آفندی جیسے بندے کو اتنا بھائی تھی کہ سادہ اور سوبر لڑکیوں کو پسند کرنے والا حیدر آفندی ''تیر محبت'' کا شکار ہو گیا۔ اور اپنے دام میں آپ پھنس گیا تھا۔

☆☆

ثمین صداقت

وہ ایک لمبے عرصے بعد لاہور آئی تھی۔ کافی آرڈر کر کے وہ کیفے کے سب سے پرسکون گوشے میں بیٹھ گئی۔ لاہور میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بس سموگ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا تھا اس کے ساتھ درختوں میں کمی۔

اس نے ارد گرد دیکھا۔ خوش باش لوگ بیٹھے تھے۔ ہنستے مسکراتے۔ لاکھوں پریشانیاں اپنے اندر چھپائے بظاہر مکمل انسان لگتے۔

اس نے گہرا سانس لیا اور اسی لمحے ایک شخص ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تھا۔ لاہور کی طرح اس میں بھی ایک عدد سگریٹ کے علاوہ کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ وہ تین سال بعد بھی پہلے جتنا خوب صورت، ہینڈسم کی تعریف پر مکمل اترتا ادھورا انسان تھا۔

منال نور کو قسمت کی ستم ظریفی پر ہنسی آئی۔ اسے یقین تھا لاہور میں وہ اس شخص سے ضرور ٹکرائے گا۔ اسے [illegible] تھا، تقدیر دونوں کو دوبارہ ضرور ملوائے گی۔ لیکن پہلے ہی دن۔

وہ اسے دیکھے گئی۔ نیلے رنگ کا سوٹ پہنے، بالوں کو جوڑے کی شکل میں باندھے وہ لڑکی اپنی ساری زندگی داؤ پر لگا سکتی تھی، اس بات پر کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی مگر کوئی احساس نہیں جاگ رہا تھا۔

اس نے آرڈر دیا اور کرسی پر بیٹھنے لگا مگر نظروں کے ارتکاز پر ادھر، ادھر دیکھا۔ کافی میں چمچہ چلاتی لیکن اپنی طرف دیکھتی لڑکی نظر آ گئی تھی۔ منال نور نے بھی دیکھا کہ وہ گردن پیچھے کر کے ہنسا تھا۔

سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر وہ اس کی ٹیبل کی طرف بڑھا۔ وہ کافی میں بے مقصد چمچہ چلاتی رہی۔

"واٹ اے سرپرائز۔" کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا تھا۔

"تم مریں نہیں ابھی تک؟" یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے پر سب کچھ تھا سوائے مسکراہٹ کے۔

☆☆☆

احمد ہاؤس میں دو بھائی آباد تھے۔ بڑے بھائی ابصار احمد اور چھوٹے بھائی رحیم احمد۔ گھر کا ماحول پرسکون تھا۔ دونوں کی بیگمات اپنے مسئلے مسائل خود حل کرنے کی عادی تھیں۔ کبھی بچوں کو یا بھائیوں کو درمیان میں نہیں گھسیٹا۔ اسی طرح دونوں بھائیوں کے مشترکہ بزنس کے مسائل نے بھی گھر کی چوکھٹ پار نہیں کی تھی۔

دونوں بھائیوں کی اکٹھے شادی ہوئی تھی۔ اس لیے اولاد بھی ہم عمر ہی تھی۔ ابصار احمد کے دو بچے تھے۔ بڑا بیٹا ہادی ابصار اور چھوٹی بیٹی منال نور۔ رحیم احمد کے بڑے دو بیٹے جڑواں تھے اسفند اور جنید ، بیٹی منال کی ہم عمر تھی ثروت رحیم۔

منال اور ثروت ایک ساتھ پڑھی، کھیلی اور لڑیں لیکن دونوں کی لڑائیاں کمرے تک محدود ہوتی تھیں۔ انہوں نے کبھی اپنے بھائیوں کو بھی اپنے جھگڑوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی بہترین راز دار پکی سہیلیاں جنہیں ایک دوسرے کے راز رکھنے آتے تھے۔ منال ہمیشہ سے اپنے میں گم رہنے والی تھی اور ثروت اس کے برعکس۔

وہ منائل کی ہم عمر ہونے کے باوجود اس کی بڑی بہن تھی۔ ثروت کی کبھی گھر کے لڑکوں سے نہیں بنی تھی ہمیشہ ایک ان بن رہی ان کے درمیان میں۔

گھر کے تینوں بیٹے پڑھائی میں اچھے تھے۔ پر جو چیز منائل اور ثروت کو سب سے زیادہ کھلتی وہ تھی اپنے بھائیوں کی لڑکیوں سے دوستی۔

سب سے پہلے ہادی کی فرسٹ ائیر میں ایک لڑکی سے دوستی ہوئی۔ جب اماں کو یہ بات پتا چلی تو انہوں نے منائل سے کہا تھا کہ اس لڑکی کا نمبر ملائے اور اس کے سامنے ہی اماں نے لڑکی کو بے نقط سنائی تھیں۔

"تم جیسی لڑکیوں کو لڑکے پٹانے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہے۔ ماں باپ کی عزت کا خیال نہیں۔ میرے بیٹے کا پیچھا چھوڑ دو واہیات لڑکی" منائل نے اسی وقت اپنے اعتراضات کا گلہ گھونٹ دیا کہ ہاں صحیح بات ہے، ان لڑکیوں کی غلطی ہے۔ ان جیسی لڑکیاں توجہ کے لیے ہمارے بھائیوں کو تنگ کرتی ہیں، یہ لڑکیاں بری ہیں۔

جب اس نے یہ بات ہادی کو بتائی تو وہ ہنس دیا" صحیح کیا اماں نے یار۔ ایویں پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ اتنی موٹی ہے۔ بھلا میں منہ لگاتا ہوں اسے۔ یار تمہارا بھائی ہے ہی اتنا ہینڈسم۔ ایک نہیں دس لڑکیاں پیچھے ہیں۔"

وہاں بیٹھے جنید اور اسفند نے بھی قہقہہ لگا لیا۔ وہ اپنے بھائی سے کہہ نہیں سکی کہ اس نے میسج پڑھے تھے۔ جب اپنوں کی بات آجائے تو کچھ غلط ہو رہا ہے کے سارے ریڈ الارم۔ حذف کرنے میں لمحے لگتے ہیں ہم لڑکیوں کو اور ہادی تو منائل کا دل عزیز بھائی تھا، وہ اس کی مخالفت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔

پھر ساری عمر اپنے گھر میں یہی دیکھا جنید، اسفند اور ہادی راتوں کو لڑکیوں سے باتیں کرتے۔ وہ کبھی مانتے ہی نہیں تھے کہ وہ لڑکیوں سے باتیں کرتے ہیں ایک ہی جملہ ہوتا کہ لڑکیاں ہی ان کے پیچھے پڑی ہوئی ہیں، ورنہ ہم تو منہ نہیں لگاتے۔ ثروت خاموش ہو جاتی۔ منائل بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتی ورنہ زیادہ تر نظر انداز کر دیتی۔ اسے ان چیزوں سے فرق پڑتا تھا نہ ہی اپنے

بھائیوں سے بحث کرنے کی قوت تھی اس کے پاس۔

ایک دن ثروت بیچی۔ ت ان کی اس حرکت پر لڑی تھی کہ وہ کیوں منع نہیں کرتیں تو چچی کے ساتھ

مناہل بھی بولی۔

تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ ان لڑکیوں کی مکمل رضامندی شامل ہوتی ہے۔ تب ہی بھائی لوگ بات کرتے ہیں۔ اپنے ماں باپ کو دھوکا دیتی ہیں تف ہے ایسی لڑکیوں پر۔ ثروت نے فی الفور اسے ٹوک دیا۔

"ہمارے بھائیوں پر تف نہیں ہے مناہل، جو اس سب میں برابر کے شریک ہیں۔" مگر ثروت کو خاموش ہونا پڑا کیونکہ جنید نے اس کی بات سن لی تھی۔

"نہیں اماں بی بی ذرا بتاؤ ہم پر کس بات کی لعنت ہے؟ آئیں بڑی تم فیمینسٹ۔ ہم مجبور کرتے ہیں انہیں؟ دودھ پیتی بچیاں ہیں؟ اپنے برے بھلے کا نہیں پتا انہیں۔ تمہیں زیادہ ان کی ماں بننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

جنید نے اسے سو باتیں سنائیں۔ ان سب باتوں میں والدین کی طرف سے ملی ہوئی بے جا حمایت بھی شامل تھی۔ کبھی بڑوں نے منع نہیں کیا تھا۔ ثروت آرام سے اٹھی اور کمرے سے باہر چلی گئی اسے اس کی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا اسے پتا تھا۔ کیا ٹھیک ہے اور کیا غلط۔

اور یہ قصے کہانیاں ایسے ہی چلتے رہے کہ ایک دن ہادی بھائی ان سب کو آئس کریم کھلانے باہر لے کر گئے۔

"یار ایک لڑکی فدا ہوگئی ہے تم لوگوں کے بھائی پر۔"

رانیہ جنید اور اسفند کو شاید سارے معاملے کی خبر تھی اس لیے ان دونوں نے قہقہہ لگایا۔ مناہل نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ثروت اپنی آئس کریم کے ساتھ کھیلتی، کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ اندر کی گھٹن سے بہتر باہر لیٹی سڑک تھی۔

"بڑا تیز ہے تم لوگوں کا بھائی بھی۔ بڑا فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مزا آ رہا ہے گیم میں۔" لڑکوں کے قہقہوں نے اسے شاید تقویت دی تھی کہ بولتے گئے کیونکہ زیادہ تر وہ ثروت کی موجودگی میں اس طرح کی باتوں سے گریز کرتے تھے۔

"کسی اور سے بات کرے تو ایسے چلاتا ہوا جیسے بیوی ہے میری۔" پہلی دفعہ مناہل کو وحشت محسوس ہوئی۔ مناہل اور ثروت نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور پہلی دفعہ مناہل نے اپنے عزیز از جان بھائی کو ٹوک دیا۔

"آخر میں وہ ہرٹ ہوگی۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ ہادی نے پوری گردن موڑ کر پیچھے مناہل کو دیکھا۔

"یہ تمہارے منہ میں ثروت کی زبان آ گئی ہے کیا" تینوں نے مشترکہ قہقہہ لگایا۔ مناہل نے ثروت کو دیکھا وہ چپ چاپ باہر دیکھ رہی تھی۔

"میری بہن تم لوگوں کو نہیں پتہ ان معاملوں کے بارے میں یہ وہ خود سب کو بتاتی پھرتی ہے کہ ہادی سے میری انگیجمنٹ ہوگئی ہے۔" وہ مزے سے بتا رہا تھا مناہل نے اسے پھر ٹوک دیا۔

"آپ نے کچھ کہا ہوگا۔" اب کی بار ہادی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔

"اوہو۔ آپ تو بہت بڑی ہوگئی ہیں مناہل صاحبہ۔" جب بھائیوں کو چھوٹی بہنوں کی بات بری لگے تو زیادہ تر ان کے پاس یہی طنزیہ طعنہ ہوتا ہے۔

"نہیں ہادی نے کوئی پستول رکھی ہے اس کے سر پر۔ خود اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ شوق ہوتا ہے انہیں" جنید فوراً ہادی کی طرف داری میں کود پڑا۔

"تم دونوں کی سوچنے کی باتیں نہیں ہیں یہ۔ بچی ہو۔ بچی ہی رہو۔" اسفند نے بھی بڑے پن کا کارڈ کھیلا۔

ثروت کچھ نہیں بولی وہ ان سارے کھیلوں سے مکمل اکتا گئی تھی۔ اس کے برعکس مناہل نور نے سارے لال جھنڈوں کو بالائی طاق رکھتے ہوئے اپنے بھائیوں کو ہر الزام سے بری الذمہ ٹھہرایا۔ بھلا ہادی احمد ہاؤس کا بڑا وارث، ڈاکٹر سپوت غلط ہو سکتا تھا؟ یہ بہنیں اتنی عجیب ہوتی ہیں نا۔ کیوں اپنے بھائیوں کو فرشتہ سمجھتی ہیں؟

وہ ساری زندگی اپنے بھائی کو فرشتہ ماننے کو تیار تھی مگر اس رات مناہل نور کے دل میں بھی بال آ گیا تھا۔

ہادی اپنے فائنلز سے پہلے دو دن کے لیے گھر آیا تھا۔ کل

اس نے واپس ہاسٹل چلے جانا تھا۔ مناہل اس کے کمرے میں اپنی فرمائشی لسٹ دینے گئی لیکن اسے دروازے میں ہی رکنا پڑا۔ اونچی آواز میں چیخ رہا تھا۔

رانیہ! تمہارا دماغ درست ہے یا نہیں" لڑکی کی رونے کی آواز دروازے کی درز سے بھی صاف سنائی دیتی تھی۔ مناہل نے کمرے میں جھانکا۔ ہادی کا چہرہ بیڈ کی طرف تھا۔ اس کے فون کا اسپیکر اون تھا۔ بیڈ پر سارے کپڑے بکھرے ہوئے تھے وہ کپڑے تہہ کر کے بیگ میں رکھ رہا تھا۔ یقیناً دروازہ باہر چلتی ہوا سے کھلا تھا۔ اسے کھلے دروازے اور وہاں کھڑی مناہل کا علم نہیں تھا۔

"ہادی! میرے گھر والے میرا نکاح کر رہے ہیں۔ میں تم سے، صرف تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ تم۔ ہادی تم نے بھی تو۔ کتنے وعدے کیے تھے۔ تم کیسے بھول سکتے ہو؟" وہ رو رہی تھی۔

"کون سے وعدے۔ کون سے میں نے تمہارے ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے تھے ہاں؟" وہ اکتا کے بولا تھا۔

"رانیہ! ہم اچھے دوست تھے یار بس۔ شادی محبت کہاں سے آ گئی اس میں۔" اب وہ سمجھانے کے انداز میں بول رہا تھا۔

"دوست تھے صرف؟ دوست؟ تمہارے میسج پڑھ کے سناؤں تمہیں میں ہادی۔" اس لڑکی کی بھیگی آواز میں اب کی دفعہ فقط افسردگی تھی۔

"یار" اس نے شرٹ اٹھا کر بیڈ پر پھینکی۔ "وہ چند جملے ہر لڑکا لڑکی سے بول رہا ہوتا ہے میڈم۔ وہ صرف ٹائم پاس ہوتا ہے۔ تم۔" رانیہ نے اس کی بات کاٹی۔

"وہ پانچ سال تمہارے لیے ٹائم پاس ہوں گے ہادی ابصار۔ میرے لیے کبھی نہیں تھے۔ کبھی بھی نہیں تھے۔ میں مر جاؤں گی۔ میں مر جاؤں گی۔ میں" اب اس کی رونے کی آواز نہیں آ رہی تھی ایک وحشت تھی۔ کوئی بددعا تھی۔

"میں تمہیں اللہ کا واسطہ دوں پھر بھی۔ پھر بھی تم کچھ نہیں کرو گے؟"

"رانیہ" وہ چیخا تھا۔ "یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے یار؟ شادی بیاہ بچوں کا کھیل ہوتا ہے؟ اور تم مجھے مفاد پرست کہو، خود غرض یا جو بھی یہ ناممکن ہے کہ میری تم سے شادی ہو۔ میں ہادی ابصار۔ میں کسی سے بھی شادی کر لوں کیا؟" اس کی آواز میں استہزا ہی استہزا تھا۔

"کسی سے بھی؟ میں رانیہ ہوں۔ جس سے تم پانچ سال وعدے کرتے رہے ہو۔ ہادی دیکھو اگر تمہارے پیرنٹس نہیں مانتے تو ہم کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے؟ پاگل ہو۔ عقل سے پیدل ہو؟ کورٹ میرج کا مطلب پتا ہے؟ تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہیں یار" وہ اپنا بیگ بند کر کے زمین پر رکھ رہا تھا۔

"تم بھی مجھے سمجھو ہادی" وہ روتے ہوئے بولی تھی۔ "تمہیں اللہ کا واسطہ ہے۔ میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں کیسے زندہ رہوں گی؟"

"ہادی اکتا کر اسپیکر آف کرتے ہوئے پیچھے مڑا تو مناہل پر نظر پڑی۔ اس نے ابرو اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ مناہل نے ہاتھ میں پکڑا کاغذ اوپر اٹھایا۔ اسپیکر آف ہونے کے باوجود لڑکی کے رونے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"تمہیں بھی اللہ کا واسطہ ہے بند کرو یہ۔" وہ بولنے کے دوران مناہل کی طرف دیکھ کے رکا۔ وہ رو رہی تھی۔ ہادی سمجھا تھا کہ وہ ابھی آئی ہے پر اس کے رونے سے سمجھ میں آیا کہ وہ کافی دیر سے وہاں کھڑی تھی۔

"مناہل جاؤ، میں آتا ہوں۔" اس نے غصے سے اسے کہا۔ مناہل فوراً پیچھے ہٹی اور بھاگتی ہوئی کمرے میں آئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

اپنے بھائی کا بت اپنے سامنے زمین بوس دیکھنا اذیت ناک ہوتا ہے۔ وہ کیا تھا؟ اتنے سال کسی کے جذبات کو استعمال کر کے اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیا اور کہا کہ وہ سب تو وقت گزاری کے لیے تھا۔

ثروت نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"مناہل آر یو اوکے؟ کیا ہوا ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"چچا، چچی نے کچھ کہا ہے؟ ہادی بھائی نے ڈانٹ دیا؟ کیا ہوا ہے؟" وہ پریشانی سے اس سے پوچھ رہی تھی اسی وقت ہادی اندر آیا۔

"ثروت چلو یار ذرا کچھ دیر کے لیے باہر۔ میں نے منال سے اکیلے میں بات کرنی ہے۔" اس نے ثروت سے کہا جو پریشانی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"آپ نے ڈانٹا ہے اسے؟" اس نے حیرت سے ہادی کو دیکھا۔

"یار نہیں۔ تم باہر جاؤ میں اس سے بات کرتا ہوں۔" ہادی نے اسے کمرے سے بمشکل باہر نکالا پھر منال کی طرف آیا۔

"اچھا یار۔ کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو روز کا تھا۔ لڑکیاں ایسے ڈرامے کرتی رہتی ہیں۔" وہ ہاتھ جھلا کر بولا۔

"وہ ڈرامہ نہیں کر رہی تھی۔ وہ سچ بول رہی تھی۔ وہ مر گئی تو" منال نے افسردگی سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ اتنا بے فکر کیوں تھا؟

"منال اپنے دماغ کو تھوڑا چلا بھی لیا کرو۔ کون مرتا ہے کسی کے لیے؟ دو چار لفظ غلطی سے منہ سے نکل گئے اور وہ پاگل لڑکی پتہ نہیں کیا سمجھ کے بیٹھی۔ کل تک ٹھیک ہو جائے گی۔ شادی ہے اس کی۔ اور ٹھیک ہے تمہارا بھائی بہت ہینڈسم ہے، بہت اچھا ہے لیکن اب ایسا بھی کوئی اندھیر نہیں مچا کہ رانیہ خودکشی کر لے۔" وہ ہنس کر بولا۔

"اگر وہ مر گئی تو؟" ہادی نے بے یقینی سے اپنی بہن کو دیکھا۔

"میری بات سنو۔ اپنے دماغ کو درست کرو۔ میں نے اسے کوئی دھوکہ نہیں دیا۔ دو چار لفظ بول لیے، وہ اتنی بے عقل ہوئی کہ انکی وجہ سے مرتی ہے تو مرتی رہے" وہ سرد لہجے میں بولا۔

"ثروت سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں ہے وہ مزید خناس بھر دے گی تمہارے اس چھوٹے سے دماغ میں۔" وہ بے مروتی سے بولا۔ اکتا کر، جھلا کر۔

"آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔ کیا آپ اس سے شادی نہیں کر سکتے۔ جب پانچ سال آپ لوگ باتیں کرتے رہے ہیں تو اس سے شادی کیوں نہیں کر سکتے؟" منال نے افسوس نے اسے دیکھ کر کہا۔

"شادی؟ تمہیں لگتا ہے اما ابا مان جائیں گے؟ کاسٹ کا ڈیفرنس ہے۔ اور ہزار مسئلے۔"

منال نے اس کی بات کاٹی۔

"اگر آپ منائیں گے تو مان جائیں گے" اسے ان ساری باتوں میں جھوٹ کی بو آ رہی تھی۔

ہادی نے چند گہرے سانس لیے۔

"منال! وہ لڑکی دو سال میرے پیچھے لگی رہی۔ کبھی کچھ کرتی تھی، کبھی کچھ۔ تا کہ میری نظروں میں آ سکے۔ اپنی اسائنمنٹس تک دینے کو تیار ہوتی تھی۔ اتنی لف پڑھائی ہونے کے باوجود میرے آگے پیچھے پھرتی تھی۔ سارا وقت وہ ان کاموں میں لگی رہتی تھی۔ میں نے صرف۔ صرف اسے اس سب سے روکنے کے لیے لفٹ کروائی تا کہ لوگوں کے سامنے اس کا تماشا بنے نہ ہی میرا۔ اس لیے اسے وقت دیا تا کہ وہ پڑھائی پر توجہ دے سکے۔ اوٹنگے بوٹنگے کاموں میں پڑھ کر اپنا فیوچر نہ خراب کر لے۔ میں نے تو بھلا چاہا تھا اس کا۔ ثروت اور تم میری بہن ہو۔ رانیہ کو بھی ہمیشہ اسی طرح سمجھا۔ وہ اللہ جانے کیا سمجھ بیٹھی۔ میں تو خود پریشان ہوں۔ اور اب تم یہ شادی کا رولا ڈال دو۔ کیسے کر لوں میں شادی؟ جاب تو ہے نہیں میرے پاس۔ اور میں کیوں اس سے شادی کر لوں۔ میری سگی میرے گلے پڑ گئی ہے۔"

منال نے اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھا تھا۔ ہادی اس سے جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ یہ خوش فہمی تھی بھی تو منال اسے جھٹلانا نہیں چاہتی تھی۔

"رانیہ کم ہے تنگ کرنے کے لیے کہ اپنی۔ اپنی سگی بہن کو بھی مجھے اپنی صفائی دینی پڑ رہی ہے۔ سب سے زیادہ افسوس کا مقام تو یہ ہے۔" ہادی اٹھ کر جانے لگا۔ منال کو شرمندگی نے گھیرا۔

"سوری بھائی۔ ایم سوری۔" اس نے ہادی کا ہاتھ پکڑا۔

"ایک طرف کی کہانی سن کر اپنے بھائی پر الزام لگا دیا۔ کل کو کوئی کہے گا کہ ہادی نے قتل کر دیا تو بھی تم مان لوگی۔ ہاں ناں" وہ افسردگی سے بول رہا تھا۔

"سوری بھائی۔ مجھے بس۔ پتا نہیں وہ رو رہی تھی۔ لڑکیاں بہت ایموشنل ہوتی ہیں۔ وہ مر جاتے تو۔" وہ روہانسی ہوئی۔

"لڑکیاں ایموشنل ہوتی ہیں عقل سے بھی پیدل ہوتی ہیں کیا؟۔ اور سوری رہنے دو تم۔ رانیہ کی فکر ہے تمہیں بس۔ اپنا بھائی چاہے اس سارے ڈرامے کی وجہ سے فیل ہو جائے۔" وہ اب مسکرا کر بولا۔ اسے ہو گیا تھا اس کی بہن اب ٹھیک ہے۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی۔ شادی کے بعد لڑکیاں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گیا۔ لیکن کاش اس سے کوئی پوچھتا اس دنیا میں کب سب ٹھیک ہونے کے لیے ہوتا ہے۔

ہادی کے جانے کے بعد اس نے ثروت کو سب بتا دیا تھا۔

"میں نے تم لوگوں کی باتیں سن لی تھیں۔ میں دروازے کے باہر ہی کھڑی تھی۔" وہ کرسی پر پیر اوپر کر کے بیٹھی آرام سے بولی تھی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے۔؟" منال نے ڈرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

"جو مجھے لگتا ہے وہ تمہیں پسند نہیں آئے گا۔ اس لیے بہتر ہے ہم اس بات کو چھوڑ دیں۔" منال نے دوبارہ اس سے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ ثروت بھی یہی چاہتی تھی۔

☆☆☆

اس واقعے کو تین سال گزر گئے تھے۔ منال نے کبھی رانیہ کے بارے میں کوئی بات سنی نہ کہی۔ اسے اس کہانی کا اختتام چاہیے تھا اور منال نے دی اینڈ یہ کیا کہ "بھلا میرا بھائی کیوں اس لڑکی سے شادی کرتا جسے اپنے والدین کی پروا نہیں، بلکہ اپنی خود کی عزت نفس کی بھی پرواہ نہیں۔ وہ بھائی کے انکار کے باوجود شادی کیا کورٹ میرج کرنے کو بھی تیار ہے۔" سارا الزام رانیہ کے سر ڈال کر وہ خوش تھی یا نہیں بس پر سکون ہو گئی تھی اپنے بھائی کو بری الازمہ ٹھہرا کر۔ ایسے سکون ملے تو ایسے ہی ٹھیک۔ لیکن اس سب کے باوجود وہ کبھی بھی اس لڑکی کی آواز اپنے ذہن سے نہیں نکال سکی تھی۔ سالوں گزرنے کے بعد بھی وہ اس دن کو نہیں بھلا سکی تھی۔

☆☆☆

وہ پہلی دفعہ اپنے سامنے بیٹھے شخص سے کب ملی تھی؟ ہوتا ہے نا کوئی ایسا منظر آپ کی زندگی میں۔ جس کا نام لیتے ساتھ ہی ایک مکمل فلم چلنا شروع ہو جاتی ہے۔ وہ منظر خوش گوار ہو یا غم زدہ کرنے والا۔ جو بھی ہو لیکن وہ دل کے اتنا قریب کیوں ہوتا ہے؟

منال نور کی زندگی میں بھی فلم کی طرح چلنے والا منظر تھا۔

ثروت اور اس کا بی اے میں ایڈمیشن ہو گیا تھا۔ پہلے لگتا تھا کہ کوئی یونیورسٹی منہ نہیں لگائے گی لیکن دونوں کا بہترین یونیورسٹی میں داخلہ ہوا۔ دونوں نے دل لگا کر محنت کرنے کا فیصلہ کیا اور اسی فیصلے کی بدولت، اتنی بڑی کلاس میں بمشکل دو سہیلیاں تھیں۔ یونیورسٹی لائف میں ویسے بھی کتابی کیڑوں کو کام یا پیپرز کے وقت منہ لگایا جاتا ہے۔ ایک رمشا تھی جو منال جیسی تھی، اپنے کام سے کام رکھنے والی، پڑھاکو ٹائپ۔ اور دوسری نیہا جس کا ان کا گروپ میں شامل ہونے کا واضح مقصد نوٹس تھا۔

یونیورسٹی میں ایک نمائش تھی۔ وہ چاروں کلاسز سے فارغ ہو کر کیمپس میں گھومنے لگیں۔ مختلف بلڈنگوں کے نمونے دیکھتے ساتھ تبصرے کرتے منال اپنے دھیان میں آگے بڑھ رہی تھی۔ یک دم ایک لڑکی سامنے آ گئی۔ اس لڑکی کو بچانے کی خاطر وہ سائیڈ پر ہوئی تھی۔

ارسل جو دھیان سے چل رہا تھا اپنے تین عدد دوستوں کے ساتھ۔ اس کی بری طرح سے منال سے ٹکر ہوئی تھی کہ جہاں منال کے ہاتھ میں پکڑے نوٹس زمین پر گرے وہیں ارسل کے پمفلٹس آس پاس بکھر گئے۔

اس نے کھا جانے والی نظروں سے منال کو دیکھا۔ بہر حال غلطی منال کی تھی وہ شرمندگی سے

چہرہ جھکا گئی۔

"آئی ایم رئیلی سوری" جلدی جلدی پمفلٹس اکٹھے کرنے لگی۔

"یار! اتنی مشکلوں سے ترتیب دیئے تھے۔" پتا نہیں کون سی ترتیب تھی جس کے خراب ہونے کا ان چاروں کو اتنا غم تھا۔غم کے پتلے بن کر کھڑے ہوئے تھے۔

منا ہل نے ارسل کو دیکھا جو لال سرخ چہرے کے ساتھ غصے کو برداشت کرتے ہوئے دوبارہ نیچے بیٹھا صفحے ترتیب دے رہا تھا۔اس نے وائٹ شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کے بازو کہنیوں تک فولڈ تھے۔وہ خوبصورت تھا یا شاید اس کے نین نقش اسے سب میں ممتاز بناتے تھے۔

"ایکسٹریملی سوری۔ مجھے نظر نہیں آیا۔" کہتے ہوئے چہرہ جھکالیا اور کیا دیکھا کہ ارسل صرف اپنے صفحے اٹھا رہا تھا کہیں منا ہل کے نوٹس آتے تو انہیں جھٹکنے کے انداز میں پیچھے ہٹا دیتا۔انداز ایسا تھا کہ اس کے نوٹس پھٹ ہی جائیں۔

منا ہل نے اپنے ہاتھ کو دیکھا وہ صرف ارسل کے نوٹس اٹھا رہی تھی۔اب کی دفعہ اس نے ارسل کی بڑبڑاہٹ بھی سنی۔

"پتا نہیں اندھی ہوتی ہیں تو عینک کیوں نہیں لگا تیں۔ عجیب۔ انتہائی عجیب۔ ان لڑکیوں کے ڈرامے ہی ختم نہیں ہوتے۔" ثروت اور اس کی دوستیں منا ہل کے نوٹس اٹھانے لگیں۔سوئی قوم جاگ گئی تھی۔

ارسل نے ہاتھ آگے بڑھایا کہ منا ہل اس کے نوٹس واپس کرے مگر منا ہل نے اس کے فرمودات سننے کے بعد پاس پڑی ٹیبل پر کاغذ پھینک دیے۔یہ سب اس کی برداشت سے باہر تھا۔جن لوگوں نے ارسل کی بات سنی تھی،ان کا اس منظر کے بعد ہنسی روکنا محال ہو گیا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے؟" منا ہل نے اس کی طرف ابرو اٹھا کر دیکھا۔

"کیا میں نے آپ کو سوری نہیں بولا تھا؟" اس کے ساتھ ہی اس نے ان تینوں کو اشارہ کیا کہ چلو۔

"عجیب بدتمیز لڑکی ہے" ارسل نے دونوں ہاتھ جھلا کر اس لڑکی کو دیکھا جو کالی لمبی قمیص پہنے اپنی دوستوں کے ساتھ جا رہی تھی۔

دوسری طرف نیہا منا ہل کو برا بھلا دینے میں مشغول تھی۔وہ ارسل کو جانتی تھی اس کی کزن کا کلاس فیلو تھا۔

"یار منا ہل! اتنی گھٹیا حرکت؟ یہ کوئی فلمی سین بھی ہو سکتا تھا لیکن مجال ہے کہ آپ جناب سے غصہ برداشت ہوتا ہو۔ وہ محمد ارسل تھا۔ملٹی ٹیلنٹڈ بندہ۔ عزہ بتاتی ہے کیا کمال اسپیچ دیتا ہے۔پڑھائی میں ایوریج ہے لیکن صرف اپنی دیگر ایکٹیویٹیز کی وجہ سے سب کا پسندیدہ ہے۔" منا ہل نے اس کی ساری باتوں کو نظر انداز کیا۔ابھی وہ حواس میں نہیں تھی دل تھا کہ دھڑکے ہی جا رہا تھا۔

"اچھی اسپیچ دیتا ہوگا اسٹیج پر،یہاں تو زہر اگل رہا تھا۔اور ہے ہینڈسم تو کیا پوجا کریں؟ پتا نہیں اللہ شکل اچھی دے دے تو غرور کس بات کا ہوتا ہے ان میں؟ ان کا کیا کمال ہے اس میں؟" ثروت نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔اس نے تو بہت لطف اٹھایا تھا اس کی ڈرپوک بہن بہادر ہو رہی تھی۔ثروت نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔اسے بھی یقین تھا اس بہادری کے بعد ایک عدد گلوکوز کی بوتل لگوانی پڑے گی اپنی بہن کو۔

"یار منا ہل! زیادہ مزا آتا اگر تم منہ پر کاغذ پھینکتیں۔کیوں ثروت! کسی ڈرامے میں تو ایسا ہوا ہوگا؟" رمشا نے نیہا کو تنگ کرنے کے لیے کہا۔

"ہاہ پہلے تم نے یہ راہ کیوں نہیں بھائی تھی؟"۔ منا ہل نے اپنی سانس بحال کرتے ہوئے کہا اور نیہا کا منہ حیرت سے کھلا۔

"مطلب محمد ارسل کے منہ پر؟" ان سب کے قہقہوں کی پرواہ کیے بغیر وہ حیرت سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

یونیورسٹی کا کیفے جتنا بھی فضول ہو،طلبا جتنی بھی گالیاں دیں لیکن آپ کو یہ کبھی خالی نہیں ملتا۔ دوپہر کے ٹائم بھی کیفے کھچا کھچ بھرا تھا۔

کتو بر کا مہینہ چل رہا تھا،موسم گرما اپنے جانے

کی خوشی میں ہلکی، ہلکی الوادعی ہوا سے لوگوں کی اپنے بارے میں رائے تھوڑی قابل قبول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہاسٹل میں ماش کی دال کی شکل دیکھنے کے بعد منال اور ثروت نے کینٹے کے سموسے اور چپس کھانے کو ترجیح دی تھی۔ دونوں کو کونے میں ایک ٹیبل خالی ملی اور اس کے ساتھ ایک عدد بلی مفت۔ (طلبا اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے بعد یونیورسٹی میں سب سے زیادہ بلیاں پائی جاتی ہیں)

ثروت نے بیٹھتے ہی اپنے ڈراموں کی پٹاری کھول لی تھی۔ اس کے پاس دنیا میں کرنے کے دو ہی کام تھے ایک پڑھائی۔ دوسرا ہر ملک کے ڈرامے۔ ایرانی، ترکش، کورین، پاکستانی، فلپائنی۔ شاید ہی کوئی ڈرامہ اس کی نظروں سے بچ سکا ہو۔ منال کھانے کے ساتھ بے دھیانی میں اس کی باتیں سن رہی تھی اسے اس کے ڈراموں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے کتابیں، ناولز بھی اتنے پسند نہیں تھے۔

لوگ کہتے تھے۔ منال اس دنیا میں صرف کورس کی کتابیں پڑھنے یا میٹھا کھانے اور بنانے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ منال سے پوچھو تو اسے بولنے اور سننے کا شوق تھا لیکن قسمت سے اسے ہمیشہ ایسے لوگ ملے جن کا بہترین مشغلہ ہی بولنا تھا اس لیے وہ صرف سننے پر ہی اکتفا کر لی تھی۔ اس نے ثروت کو دیکھا۔ وہ اب بھی بول رہی تھی۔ پتا نہیں اس کا ہیرو کتنے لوگوں کو ہیروئن کو تنگ کرنے پر ہسپتال بھیج چکا تھا۔

منال نے دوبارہ سموسوں پر توجہ مرکوز کی۔ لیکن کچھ عجیب تھا کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی تیز چھٹی حس نے الارم بجائے تو اس نے ارد گرد دیکھا۔ اتنے رش میں بھی اسے محمد ارسل نظر آ گیا تھا۔ اس کے دیکھنے کے باوجود اس نے نظروں کا زاویہ نہیں بدلا تھا۔ اسے لگا شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن نہیں لال بتی اسے بتا رہی تھی کہ یہ کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ کر ثروت کی کہانی کو بریک لگی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" ثروت نے ہاتھ ہلایا۔

"یار! یہ مجھے ایسے کیوں دیکھ رہا ہے؟" منال کے کہنے پر ثروت نے اطراف میں سر گھمانا شروع کیا۔

"کون دیکھ رہا ہے؟"

"یار! تم اپنا سر گھمانا بند کرو۔ اس دن والے ارسل کی بات کر رہی ہوں۔ وہ پیچھے ٹیبل پر بیٹھا ہے اور کافی دیر سے یہاں دیکھ رہا ہے" منال کی آواز میں تشویش تھی۔ ثروت نے اب کی دفعہ پوری طرح گھوم کر پیچھے کا جائزہ لیا اور ارسل کو دیکھا وہ واقعی میں ادھر دیکھ رہا تھا۔

"مانو نہ مانو کوئی بدلہ پلان کر رہا ہے۔" اسے اپنے ڈرامے کی کہانی یاد آ گئی۔ "کل رات ہی دیکھا ہے میں نے، ایک خوب صورت ولن نے۔"

"ثروت! میری کون سی اس سے کوئی زمین کی دشمنی ہے یار۔ اور اس چھوٹے سے واقعے کو ہفتہ گزر گیا ہے۔" منال نے دوبارہ ارسل کی طرف دیکھا وہ اب کے ہلکا سا مسکرایا لیکن آنکھیں دیکھو تو وہ سرد تھیں۔

"تمہیں نہیں پتا ان لڑکوں کی ایگو ہرٹ ہو جائے تو دشمن بنانے میں سیکنڈ نہیں لگاتے۔ مرنے مارنے تک بات آ جاتی ہے۔ میرے ڈرامے میں ولن۔" ثروت کے سر پر ڈراما سوار تھا۔

"بڑی مہربانی اتنی اچھی خبر سنانے کے لیے" اس نے اسے ڈپٹا اور بے خیالی میں ارسل کی طرف نگاہ اٹھی اور اٹھی رہ گئی۔ وہ اسی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ہاتھ ہلا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ پھر وہ اٹھا اب وہ اس کی ٹیبل کی طرف آ رہا تھا۔ منال نے بڑبڑا کر ثروت کو دیکھا لیکن وہ میڈم سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں غائب تھی۔

کیا سامنے آتے شخص کی ہچی میں اتنا ہرٹ ہو گئی تھی؟

"ہیلو مس۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"ہیلو!"

منال کی مری مری آواز نکلی۔ "زندگی میں پہلی دفعہ پنگا لیا تھا۔ لگتا ہے وہ بھی مہنگا پڑ گیا۔ اور اس ثروت کو تو کچا چبا جاؤں گی میں۔"

"پہلے تو میں اپنی اس بکواس کے لیے معذرت

کرتا ہوں جو اس دن غصے میں کی تھی" وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھاتے ہوئے بولا۔ معذرت کرتے ہوئے بھی عجیب شاہانہ انداز تھا۔

"اور آپ کا شکریہ اپنی بکواس کو بکواس ماننے کا" منا ہل نے اپنی آواز کو حیرانی سے سنا۔ پتا نہیں اس سامنے والے شخص میں ایسا کیا تھا کہ اس سے بات کرتے ہوئے اسے کوئی ڈر، خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔ شاید سب کی زندگی میں ایسے لوگ آتے ہیں جن سے بلا جھجک سب کہہ دیا جائے۔

"اوہ۔" وہ بے اختیار ہنسا۔ اس کی ساری شخصیت میں سب سے خوب صورت اس کی ہنسی تھی۔

"آپ کیسی ہیں مس نور؟" منا ہل نے اسے دیکھا۔ یہ انہونی بات نہیں تھی کہ وہ اس کا نام جانتا تھا۔

"الحمدللہ۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟" وہ سید ھا مدعا پر آئی۔ سامنے بیٹھے شخص کو برداشت کرنا کافی مشکل امر تھا۔

"میں بھی اللہ کا شکر ٹھیک ہوں" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ منا ہل ٹیبل سے اٹھنے لگی۔

"ہادی ابصار آپ کے کیا لگتے ہیں؟" منا ہل واپس کرسی پر بیٹھ گئی اسے ایک فیصد بھی اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

"کیا؟ کون؟" اس نے ابرو اٹھا کر سوال پوچھا۔

"ہادی۔ ابصار" اس نے نام دہرایا۔

"بھائی ہیں میرے۔ خیریت؟ آپ کیسے جانتے ہیں انہیں؟" منا ہل نے اپنی حیرانگی میں بھی سامنے بیٹھے شخص کی ساری جوت بجھتی ہوئی دیکھی تھی۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

"اصل میں، میں انہیں جانتا ہوں۔ میرے دوست کی ایک دفعہ کافی ہیلپ کی تھی انہوں نے۔ کل آپ کو ان کے ساتھ یونی گیٹ پر دیکھا تو سوچا آج پوچھ لوں۔ اب آپ کو کوئی بھی کام ہو، آپ مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔ آفٹر آل آپ کے بھائی کا احسان بھی تو چکانا ہے۔"

منا ہل کے کچھ کہنے سے پہلے وہ مڑ چکا تھا۔ ثروت ہاتھ میں جوس لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا کر رہا تھا یہاں" منا ہل نے ارسل کی پشت سے نظریں ہٹا کر ثروت کو دیکھا۔

"کہہ رہا تھا۔ آپ کو اب کوئی کام ہو تو مجھ سے کہنا۔" منا ہل نے آخری بات بے دھیانی میں دہرائی۔

"ہیں کیا؟ اس سے کیوں کہیں؟ یہ ایسے بدلہ لے گا اب؟"

منا ہل نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور اٹھ کر چلی گئی۔

☆☆☆

ہفتے بعد۔

نیہا اور منا ہل کا گروپ پروجیکٹ تھا۔ ہر گروپ کی طرح۔ نیہا ان لڑکیوں میں سے تھی جو اکیلے بہت اچھا کام کرتے ہیں لیکن جیسے ہی گروپ ورک آئے انہیں پینسل پکڑنا بھی بھول جاتی ہے۔ سائیکولوجی میں اسے سوشل لوفنگ کہتے ہیں اور عام زبان میں کام چوری، کاہلی اور بے غیرتی۔

دس دن سے منا ہل پروجیکٹ پر کام کر رہی تھی۔ ان کا بی بی اے کا پہلا سال تھا۔ سارا مشکل اینالیسز کا کام منا ہل کر چکی تھی بس لکھنے کا کام بچا تھا اور اب منا ہل نے بھی سوچ لیا تھا، قیامت آجائے گی تب بھی وہ باقی کام نہیں کرے گی۔ اسی لیے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق نیہا لیپ ٹاپ پر لکھ رہی تھی اور منا ہل اس کے سر پر بقول نیہا ڈنڈا لیے بیٹھی تھی۔

"السلام علیکم!" پیچھے آواز پر دونوں نے سر موڑ کر دیکھا اور پھر سر مڑے ہی رہے۔

"السلام علیکم مس نور" وہ دوبارہ بولا۔ نیہا نے منا ہل کی طرف معنی خیز انداز سے دیکھا۔

"وعلیکم السلام۔ کیا حال ہے آپ کا؟" منا ہل کے منہ کے بدلتے زاویے دیکھنے کے بعد نیہا نے فی الفور سلام کا جواب دیا۔

"اللہ کا شکر۔ لگتا ہے میں نے آپ لوگوں کے کام میں دخل دیا ہے" اس نے منا ہل کے بعد نیپ

ٹاپ کی اسکرین کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ایک سیکنڈ۔ یہ ذرا دکھائیں۔" اس نے فاصلے پر بیٹھتے ہوئے نیہا سے لیپ ٹاپ مانگا۔
"یہ ایسے نہیں لکھتا۔ ڈاکٹر ام رباب کی اسائنمنٹ ہے نا یہ۔ اگر انٹرپریٹیشن ایسے کی تو انالیسز کے مارکس بھی جائیں گے۔ مطلب آپ کا سارا کام صفر۔" وہ اسائنمنٹ کو پڑھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ ان سے دو سال سینئر تھا۔
"اوہ۔ پھر ہم کیا کریں؟" نیہا کو کام سے بچنے کا بہانا مل گیا تھا اور بہانے کے ساتھ ایک عدد استاد مفت۔
"ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے۔ آپ رہنے دیں۔" مناہل نے کہتے ہوئے لیپ ٹاپ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔
"کیسے کر لیں گے؟ اور تم لکھو گی؟ ابھی تو کہہ رہی تھیں مر بھی گئی تو نہیں لکھوں گی۔ دوبارہ سوچ لو۔ میں نے نہیں کرنا پھر۔ نیہا نے اس کے آگے بڑھے ہاتھ پر چیٹر مارتے ہوئے ڈپٹ کے کہا۔ مناہل نے دانت بھینچ کر اسے دیکھا۔
"اگر آپ لوگ خود کر لیں گے تو۔" ارسل لیپ ٹاپ واپس رکھتے ہوئے، مناہل کو دیکھ کر بولا۔ لیکن اندھا بھی بتا سکتا تھا اس کا اٹھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
"نہیں بالکل نہیں۔ ہمیں آپ کی یہ آفر دل و جان سے قبول ہے" نیہا نے لیپ ٹاپ اس کے آگے کھسکایا۔ مناہل تھوڑا پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی اسے اس سے کچھ نہیں سیکھنا تھا۔ لیکن کیا واقعی؟
"آپ لوگوں کا باقی کام اچھا ہے۔ کس نے کیا ہے؟" وہ ساری اسائنمنٹ پڑھنے کے بعد کہہ رہا تھا۔ نیہا نے خلا میں گھورتی مناہل کی طرف اشارہ کیا۔ ارسل نے اس کی طرف دیکھا اور ہنس دیا۔ وہ خلا میں گھورتی بدھا کو مات دے رہی تھی۔ پھر اس نے کالی پنسل پکڑی اور پوری دل جمعی سے لکھنے کا طریقہ سکھانے لگا اس کا سکھانے کا انداز اتنا دلچسپ تھا کہ مناہل نے بھی ان کی طرف رخ موڑ لیا اور رجسٹر پر لکھنے لگی۔ گھنٹے بعد جب وہ اٹھنے لگا تو نیہا سے پہلے مناہل نے بہت سنجیدگی سے شکریہ کہا تھا۔
"یو آر موسٹ ویلکم مس نور۔" وہ بھرپور انداز میں مسکرایا ایسی مسکراہٹ جس میں آنکھیں سب سے خوبصورتی سے مسکراتی ہیں۔ مناہل نے اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا، چیزیں پکڑیں اور کھڑی ہو گئی۔ دور تک جانے کے بعد بھی اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ دو مسکراتی اور سوچتی آنکھوں نے اس کا پیچھا کافی دیر تک کیا تھا۔

☆☆☆

ڈاکٹر ام رباب نے کلاس میں کھڑے ہو کر نیہا اور مناہل کی تعریف کی تھی۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ اسائنمنٹ کسی نئے اسٹوڈنٹ نے بنائی ہے۔
"آؤ اس کا شکریہ ادا کر آئیں۔" نیہا نے کلاس کے بعد مناہل سے کہا۔
"کس کا؟ ارسل کی بات کر رہی ہو۔" مناہل نے پورا گھوم کر نیہا کو دیکھا۔ نیہا نے سر ہلایا۔
"ایسا کرو، ایک عدد گلدستہ بھی لے جاؤ نیہا۔" ثروت نے ہنستے ہوئے کہا سب کو معلوم تھا نیہا ارسل پر فدا ہے۔
"ایک تو اس بندے کی وجہ سے ڈاکٹر ام رباب نے تعریف کی ہے۔ اب دیکھنا اس امپریشن کی وجہ سے پیپرز میں مارکس بھی اچھے ملیں گے۔"
"اُفوہ گلدستے کو چھوڑو۔ شکریہ کہنے کے ہزار طریقے ہوتے ہیں۔ آج ڈیبیٹ کا سیشن ہے اس کا۔ ہم تالیوں سے بھی شکریہ کہہ سکتے ہیں۔" ان تینوں نے چلتے ہوئے اسے گھور کر دیکھا اور قہقہہ لگا کر ہنس دیں۔
"اچھا بھئی چلو۔ چلتے ہیں۔ ارسل صاحب کا تالیوں سے شکریہ ادا کرنے۔" ثروت نے فیصلہ سنایا تو مناہل اس کی طرف مڑی اور نہ میں گردن ہلائی۔ وہ وہاں نہیں جانا چاہتی تھی۔ کبھی نہیں لیکن وہ تینوں اسے لے گئیں۔
ہال میں اس کے مداح پہلے ہی کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان کے ڈیپارٹمنٹ کا سارا اسٹاف آگے بیٹھا تھا۔ وہ اسٹاف کے ساتھ بیٹھا کسی بات پر ہنس

رہا تھا۔ مناہل نے اسے دیکھا اور اسے معلوم ہو گیا وہ وہاں کیوں نہیں آنا چاہتی تھی۔ صرف اس ایک مسکراہٹ کی وجہ سے۔

اسی وقت اس نے اوپر دیکھا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور چند سیکنڈ ہوا، روشنی، مسکراہٹ، سانس سب رک گئی۔ وہ بھرپور انداز میں مسکرایا۔ یہ فتح کی مسکراہٹ تھی۔ اس کی مسکراہٹ اتنی گہری تھی کہ اس کے ساتھ بیٹھے سر نے بھی اس مسکراہٹ کی وجہ تلاش کرنی چاہی۔

ان کے دیکھنے سے پہلے مناہل نور پلٹ گئی تھی اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ نیہا، ثروت اور رمشا تینوں نے ارسل اور مناہل کو دیکھا تھا، کچھ تھا اس کی مسکراہٹ، میں ان کہا سا۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک حرف نہیں بولا تھا پر ثروت کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی تھی۔

نیہا نے مناہل کو دیکھا پھر ارسل کو، وہ اسٹیج پر جا رہا تھا۔

"یہ کدھر گئی؟ دیکھو وہ ہمیں پہچان گیا ہے۔ میں نے مناہل کو بولا۔"

ثروت نے نیہا کا ہاتھ پکڑا اور کرسی پر بیٹھا دیا۔

"چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ اسے جانے دو۔"

ثروت کو اس وقت اپنے کسی ڈرامے کا سین یاد نہیں آیا بس ایک خوف تھا کہ کچھ غلط ہوگا۔

بعد میں نیہا سارا دن گاتی رہی کہ کتنی خوب صورت تقریر ارسل نے کی تھی۔ ثروت اس سے متفق تھی لیکن مناہل کی وجہ سے کچھ نہیں بولی۔ مناہل کی آنکھیں سارا دن گیلی رہیں اسے خود نہیں معلوم تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ آخر اسے ہوا کیا ہے؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور مسکراتی آنکھوں کے علاوہ کچھ سجھائی نہ دیا۔

رات دونوں سونے کے لیے لیٹیں تو ثروت کی آواز آئی تھی۔

"مناہل نور کیا تم بات کرنا چاہتی ہو؟" ثروت اسے جانتی تھی، وہ خود نہیں بتائے گی۔ ہمیشہ اسے بات شروع کرنی پڑتی تھی، پھر وہ ساری بھڑاس نکال دیتی تھی۔

"نہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔

☆☆☆

پھر اس کی روٹین بن گئی۔ وہ روزانہ آتے جاتے ایک مسکراہٹ کے ساتھ سلام کرتا۔ مناہل کا گروپ جہاں نظر آتا، وہاں رک کر حال چال پوچھتا۔ کینٹین میں بھی ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھے ہوتے تو کچھ کھانے کی آفر کرتا۔ کسی کام میں مسئلہ ہوتا اور اسے معلوم ہو جاتا تو وہ چٹکیوں میں حل نکال دیتا۔

مہینے میں اس نے ان کے سارے گروپ کا دل جیت لیا تھا۔ لڑکیوں کے دل جیتنا کون سا مشکل تھا۔ اچھے سے سلام دعا کر لو، اچھے سے بات کرو، نوٹس دے دو۔ کام ختم۔ لیکن مناہل وہ اس سے گریز کرتی تھی۔ ثروت نے دو تین مرتبہ اس سے پوچھا بھی کہ کوئی مسئلہ ہے؟ لیکن مناہل کنی کترا گئی، بس جس جگہ وہ نظر آتا وہاں سے الٹے قدم ہو لیتی۔ اسے بس اس شخص کے سامنے نہیں آنا تھا اور کیوں؟ اس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔

اس دن بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ نیہا اور مناہل کے میسج ایک تھے۔ وہ کلاس سے باہر نکلیں تو وہ سامنے اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ ماتھے پر بکھرے بال، سفید ٹی شرٹ پہنے۔ ایسا لگتا تھا سارے سفید رنگ کے کپڑے اس نے خرید لیے ہیں۔ کسی بات پر وہ بے تحاشا ہنس رہا تھا۔ مناہل نے اسے دیکھا اور واپس کلاس میں بیٹھ گئی۔

"تمہیں پتا ہے، یہ کتنی ال مینرڈ چیز ہے۔" نیہا کی برداشت بس یہیں تک تھی۔

"مہینہ ہو چکا ہے اس واقعے کو جس میں غلطی بھی سراسر تمہاری تھی اس کے باوجود ارسل ٹھیک ہو گیا لیکن تم پتا نہیں کیوں نخرے دکھا رہی ہو۔" نیہا نے اسے گھورا۔

"میں کوئی نخرے نہیں دکھا رہی۔ بس مجھے پسند نہیں ہے۔" مناہل نے سر اٹھا کر کہا۔

"کیا نہیں پسند؟ سلام کا جواب دینا؟ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم اس سے دوستی کرو یا لمبی لمبی باتیں کرو لیکن ایک سلام کا جواب دینے میں کیا جاتا ہے۔ صرف وعلیکم السلام ہی تو کہنا ہے۔" نیہا نے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اچھا دیکھیں گے" منا ہل اٹھ گئی۔ نیہا کی بات ٹھیک تھی لیکن۔

"یار! ہم لوگ ایک ساتھ پڑھتے ہیں۔ وہ بندہ کوئی فلرٹ نہیں ہے۔ تمیزدار اچھے گھرانے کا لڑکا ہے۔ ہماری ساری کلاس اس کے اچھے سے بات کرنے سے ہم سے جیلس ہوتی ہے۔ اور ایک تم ہو۔"

نیہا کا اخلاقیات پر لیکچر کبھی ختم نہیں ہوتا تھا منا ہل دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسی وقت ارسل اندر آیا اگر وہ بروقت نہ رکتی تو پہلے دن والا منظر پھر دہرایا جاتا۔

"اوہو ہو یار! شکر ہے ورنہ آج پھر ایک عدد جنگی سین دیکھنا پڑتا۔" اس کے دوست نے پیچھے سے آواز لگائی۔

"آپ ٹھیک ہیں؟" ارسل نے اپنے ہاتھ میں پکڑے کاغذوں کا پلندہ ٹھیک کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جس کے دماغ میں چل رہا تھا کہ سلام کا جواب دینے میں کیا جاتا ہے۔

"جی۔ وعلیکم السلام۔ میں ٹھیک۔" منا ہل نے تیزی سے بول کر نکلنا چاہا لیکن یہ کیا ہوا تھا۔

اس نے ارسل کی طرف دیکھا، وہ بھی آنکھیں چھوٹی کیے اور تھوڑا منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔ نیہا جسے اس جواب کا پس منظر پتا تھا، وہ قہقہہ لگا کر ہنسی۔ منا ہل نے مڑ کر اسے گھورا اور جلدی سے دروازے سے نکل گئی۔ پیچھے نیہا انہیں کچھ بتا رہی تھی۔

ہوسٹل آ کر اس نے ثروت کو ساری بات بتائی۔

"کیا یار منا ہل۔" ثروت ہنستے ہوئے اس کے پاس آئی۔

"تم پر ایک عدد ڈرامہ نہ لکھ دوں میں میری بہن" وہ اس کے پاس آ کر بیٹھی۔

"تم مجھے یہ بتاؤ، اصل میں مسئلہ کیا ہے منا ہل؟"

ثروت اب سنجیدگی سے اپنی کزن کو دیکھ رہی تھی۔ منا ہل کوئی بہت خوبصورت نہیں تھی لیکن اس کے سیدھے، گھنے کندھوں تک آتے بال، لمبا قد اور اوپر کو مڑی پلکیں اسے چلتے پھرتے لوگوں میں ممتاز بناتی تھیں۔

"تم لوگوں کو کیوں لگتا ہے کہ مجھے کوئی مسئلہ ہے ثروت؟" وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔

"کوئی اندھا بھی بتا سکتا ہے منا ہل! کہ تمہیں ارسل سے مسئلہ ہے۔ مطلب مجھے بھی وہ کوئی نیہا جتنا پسند نہیں ہے لیکن اگر وہ اچھے سے مل رہا ہے تو آگے سے سلام۔" منا ہل نے اس کی بات کاٹی۔

"سلام کی بات نہ کرنا میرے سامنے تم اب۔" ثروت نے قہقہہ لگایا اور اس کی طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔

"پھر تم بتاؤ۔ تمہیں کیا مسئلہ ہے" ثروت چاہتی تھی وہ اسے بتائے لیکن وہ خاموش رہی۔

"تمہیں پسند ہے وہ؟" یہ کہنے کی دیر تھی منا ہل تیر کی تیزی سے سیدھی ہوئی۔

"تم!! میرے ساتھ نہیں تمہارے ساتھ مسئلہ ہے۔ اٹھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے" منا ہل نے تکیہ اس کے سر پر مارا۔ ثروت وہیں لیٹی ہنستی رہی۔

"اگر تمہیں پسند نہیں تو پھر کچھ نہیں ہوتا یار۔ اصل میں تم اتنا کونشس رہتی ہو اس کے سامنے اسی لیے ایسی غلطیاں ہوتی ہیں۔ جیسی تم ہو ویسی ہی رہو" ثروت اٹھ گئی۔

"مجھے تم لوگوں کی کوئی بکواس نہیں سننی۔ سب پیچھے لگ گئے ہو میرے۔"

"نہ سنو پھر کل وعلیکم السلام دوبارہ بول دینا۔" جوتا آنے سے پہلے ثروت کمرے سے باہر تھی۔

☆☆☆

اس سارے سمجھانے بجھانے کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ جہاں نظر آتا وہاں سے بھاگنے کے بجائے وہ اس کے پاس سے گزر جاتی۔ کبھی سلام کر لیتی، کبھی سر جھکا کر گزر جاتی، کبھی اس کی طرف دیکھتی ہی نہیں اور کبھی

اس کی مسکراہٹ کا جواب ہلکی مسکراہٹ سے دے دیتی۔ نیہا یا ثروت ساتھ ہوتیں تو وہ ایک دو باتیں کر لیتا لیکن اگر اکیلی مناہل ہوتی تو وہ اسے کبھی نہیں روکتا تھا۔ چلتے چلتے سلام کر لیتا یا مسکرا دیتا اور بس۔

کلاس سے فارغ ہو کر وہ چاروں ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کا اینول ڈنر تھا۔

"مزہ بتا رہی تھی، ہمارے ڈیپارٹمنٹ کی مینجمنٹ ٹیم پوری یونیورسٹی میں مشہور ہے۔ کیونکہ ہمارے ایونٹس کی ہر ایک چیز پرفیکٹ ہوتی ہے۔ شروع سے لے کر آخر تک" نیہا نے سامنے لگے پوسٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بڑا سا پوسٹر دیوار پر لگا ہوا تھا۔

"جی ہر سال، ہر چیز پرفیکٹ ہوتی تھی لیکن لگتا ہے اس سال ساری یونیورسٹی کی ہی نظر لگ گئی ہے مجال ہے کوئی ماشاء اللہ بول دیتا ہو۔" ارسل ان کے پیچھے سے نکلا اس کے ہاتھ میں کاپی پنسل تھی۔ وہ سب ہنس دیں۔

"کیا ہوا ہے؟" نیہا نے اس سے پوچھا جو آج سفید رنگ کے اوپر کالی لائنوں والی شرٹ پہن کر کھڑا تھا، بال ماتھے پر گرے ہوئے تھے۔ مناہل نے اسے ایک نظر دیکھنے کے بعد دوبارہ نظریں پوسٹر پر مرکوز کر لیں۔

"ہماری آدھی مینجمنٹ ٹیم سیر و تفریح پر نکلی ہوئی ہے، ان کا بھی قصور نہیں ہے۔ ڈنر دسمبر میں ہونا تھا اور سر نے کہا ہے کہ طوفان، سیلاب، قیامت کچھ بھی آ جائے ڈنر تو نومبر میں ہی ہو کر رہے گا۔" اس کے پاس ایک لڑکا آ کر رکا جسے وہ رجسٹر میں سے صفحہ پھاڑ کر دینے لگا اس پر کوئی بجٹ لکھا ہوا تھا۔

"ہم لوگ فارغ ہیں۔ اگر ہم مدد کر دیں؟" ان تینوں نے گردن موڑ کر نیہا میڈم کو دیکھا۔ پڑھنے کے بعد ایک یہی ہفتہ ملا تھا انہیں چھٹیوں کا اور یہ بھی کام نہ کرنے والی بندی انہیں پھنسا رہی تھی۔

"بالکل۔ نئے بچے ڈھونڈے تو ہیں لیکن وہ تھوڑے سلو ہیں اور ان کا پریزنٹیشن ویک ہے یہ۔" وہ اب ان چاروں کے سامنے آ کر بول رہا تھا۔

"آپ لوگوں کو مزا آئے گا، پڑھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے کام بھی کرے انسان تو بور نہیں ہوتا۔ فریش ہو جائیں گے آپ لوگ۔" اس نے باری باری ان تینوں کی شکلیں دیکھ کر کہا جو مرجھا گئی تھیں۔ اس کی بات پر صرف ایک سر ہاں میں ہلا۔

"بس دن رات ایک کرنا ہوگا کیونکہ وقت کم ہے اور کام زیادہ" ارسل اب انہیں چھوٹی چھوٹی باتیں بتا رہا تھا۔ اسی دوران نیہا اپنی جگہ سے اٹھی۔

"انہیں کوئی اتنا خاص آئیڈیا نہیں ہے کہ کیسے کام کرنا ہے لیکن اگر آپ گائیڈ کریں گے تو مجھے یقین ہے یہ تینوں بہت اچھا کام کریں گی۔ اصل میں مجھے گھر پر کام ہے تو میں تو نہیں آ سکوں گی اس ہفتہ لیکن ان شاء اللہ ڈنر پر ملاقات ہو گی" ارسل کو بولتے ہوئے بریک لگی۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی چلی گئی۔

"شکر کریں اس نے اس دفعہ اپنے آپ کو اس دفعہ بیمار نہیں کیا۔" ثروت نے چپ چاپ کھڑے ارسل کو دیکھ کر کہا۔

"لیکن یہ تو سب سے پہلے بولی تھیں" اس کے بعد اس کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ رمشا اور مناہل نے گہرا سانس لے کر سر جھکا لیا۔ انہیں پتا تھا یہی ہونا ہے۔

ایک دن گزرنے کے بعد انہیں معلوم ہوا یہ ان تینوں کا یونیورسٹی میں گزرا سب سے اچھا ہفتہ ہوگا۔ صبح نو بجے ارسل یا اس کے کسی دوست کا فون آنا شروع ہوتا اور جب تک یہ دونوں ہوسٹل سے آ نہ جاتیں وہ لگاتار فون کرتے رہتے۔ ارسل سب سے پہلے ہر کسی کو آج کا کام سمجھاتا اور پھر سب اپنے کاموں میں لگ جاتے۔ ثروت اور مناہل کا کام یونیورسٹی کے اندر ہی تھا انہوں نے اس سے خود کہا تھا کہ وہ باہر نہیں جا سکتیں۔

مناہل چپ چاپ اپنا کام کرتی لیکن ثروت کی باقی سب سے اچھی دوستی ہو گئی تھی، وہ سب اچھے تھے۔ اپنے کام سے کام رکھنے والے، دل لگا کر کام کرنے والے، مدد کرنے والے اور سونے پر سہاگا اسے دو جڑواں بہن بھائی مل گئے جو اس کی طرح

ڈراموں کے شیدائی تھے پھر کیا تھا اسے بھول گیا کہ اس کی کوئی بہن بھی اس دنیا میں ہے۔ منال بس دور سے اسے گھورتی رہتی۔

"ثروت جلد بیمار پڑنے والی ہے۔" ارسل نے ایک کرسی چھوڑ کر دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اس کے ہاتھ میں دو پانی کی بوتلیں تھیں۔ منال نے اس کی طرف دیکھا، وہ ہنستے ہوئے پانی کی بوتل کھول رہا تھا۔ موسم ٹھنڈا تھا، اس کے باوجود اس کے بال پسینے سے گیلے ہو کر ماتھے پر چپکے ہوئے تھے شاید وہ باہر سے آیا تھا۔ منال نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ہاتھ میں پکڑی تصویر کاٹتی رہی۔

"کیا ہوگا اسے بخار، نزلہ یا نظر؟" اپنی بات پر خود ہی ہنس کر وہ بوتل کا ڈھکن بند کر رہا تھا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے ایک پانی کی بوتل منال کی طرف بڑھائی۔ منال نے اسے دیکھا وہ اشارے سے اسے لینے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"لے لو۔ زہر نہیں ہے" اس نے بوتل پکڑ لی۔

"آپ کیوں نہیں دوست بناتیں۔" وہ اس کی طرف رخ کیے مشورے دینے کے موڈ میں لگتا تھا۔

"ضرورت نہیں ہے۔" منال نے اپنی نظریں ہاتھ پر پکڑی تصویر پر ہی رکھیں۔

"ضرورت کے لیے دوست بنائے جاتے ہیں؟" اب وہ سوال پوچھ رہا تھا۔

"یہاں سب ضرورت کے لیے ہی دوست بناتے ہیں۔ ضرورت نہ ہوتی تو آپ یہاں نہ بیٹھے ہوتے اور میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟"

منال نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا اس کی نگاہوں میں افسوس تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے اس کی یہ بات بری لگی تھی پر منال کو اسے وہاں سے ہٹانے کا کوئی اور طریقہ نہیں سوجھا تھا۔

چند سیکنڈ وہ دونوں ایسے ہی بیٹھے رہے پھر کسی نے اسے آواز دی تھی اور وہ اٹھ کر چلا گیا لیکن منال اسے دیکھتی رہی۔ باقی سارا دن اور شام وہ اسے کچھ سمجھانے بھی آیا تو سنجیدہ تھا۔ ثروت نے اس سے پوچھا۔

"تمہاری اور ارسل کی کوئی لڑائی ہوئی ہے؟"

منال نے اسے ساری بات بتا دی۔"

"یار منال۔ وہ ایسے ہی بات کر رہا تھا۔ تم بھی یقین مانو سمجھ میں نہیں آتیں مجھے کوئی بندہ اتنا خاموش کیسے رہ سکتا ہے۔ اور پھر کوئی انسان سوال پوچھ رہا ہے تو اس کا سیدھا جواب بھی ہوتا ہے۔" ثروت نے سر پر ہاتھ مار کر کہا۔ منال کو اس کو بھی سیدھا جواب دینے کی خواہش نہیں تھی۔ اس لیے وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ لیکن اندر کہیں اسے بہت شرمندگی تھی۔ ارسل اچھا تھا صرف اس کے ساتھ نہیں سب کے ساتھ ہی۔ اس سے تو وہ اتنی بات بھی نہیں کرتا تھا۔ پر اس کی چھٹی حس لال بتی بجھا ہی نہیں رہی تھی۔ اسی لیے وہ چاہتی تھی یہ شخص اس سے بات نہ کرے مگر آگے کیا ہونا ہے، یہ کسے پتا ہے؟

☆☆☆

سب کچھ بہترین اور وقت کے حساب سے کرنے کے باوجود بہت سی کمی رہ گئی تھی۔ ارسل خود بھی بھاگتا رہا اور ساری ٹیم کو بھی بھگائے رکھا۔ آخر جب ڈنر شروع ہونے میں دو گھنٹے رہ گئے تو سب نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے کہ اور ہم سے نہ ہو پائے گا۔ پھر اس نے سب کو جانے کی اجازت دی اس شرط پر کہ گھنٹے بعد سب اسے لائن میں کھڑے ملیں۔

"خود تو منہ بھی دھو کر آ جائے گا تو اچھا لگے گا ہم نے تو بھی لیپا پوتی کرنی ہے۔ ایک گھنٹہ صرف۔"

ایک لڑکی نے جل کر کہا تو منال اور ثروت دور کالی عینک لگائے کھڑے ارسل کو دیکھ کر دل کھول کر ہنسیں۔ دور کھڑے ارسل نے بھی ان دونوں کو دیکھ کر ہاتھ کے اشارے سے پوچھا تھا کہ کیا ہوا ہے اس لڑکی نے کچھ نہیں کا اشارہ کیا اور ان دونوں کو گھورا۔

منال نے رات کے فنکشن کے لیے سیاہ رنگ کا سوٹ چنا تھا اور اس پر ہلکا میک اپ کرنے کے ساتھ اس نے میرون رنگ کی لپ اسٹک کا انتخاب کیا۔ کندھے تک آتے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا۔ کانوں

میں چھوٹے چھوٹے سلور رنگ کے چمکتے ٹاپس پہنے۔ پیروں میں لمبی سیاہ ہیل۔ وہ پہلی دفعہ یونیورسٹی کے کسی ایونٹ کے لیے تیار ہوئی تھی۔ آئینہ اسے بتا رہا تھا کہ وہ خوبصورت لگ رہی ہے۔ پیچھے سے ثروت کا "اوہ ماشاءاللہ" مزید پرسکون کر گیا۔ اور اسی کے ساتھ گھنٹہ ختم ہوا تھا۔

وہ کمرے کو لاک کرنے لگیں تو ارسل کا فون آنا شروع ہو گیا۔

"یا اللہ۔ یہ بندہ تیار بھی ہو گیا۔" منال نے ثروت کو فون دکھایا۔

"اٹھا لو شاید کوئی کام ہو۔" لاک لگاتی ثروت نے کہا تو اس نے فون اٹھایا۔

"ہم آ رہے ہیں، ابھی پانچ منٹ ہیں گھنٹہ ہونے میں۔" وہ آہستہ سے بولی۔ کل کی اپنی بات کی وجہ سے وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔

"الوینہ کو مسکارا اور لائنر چاہیے، وہ کہہ رہی ہے لیتی آنا۔" وہ آگے اکتاہٹ سے کہہ رہا تھا۔ الوینہ ارسل کی کلاس فیلو تھی، وہ لوگ کسی ہوٹل گئے تھے تیار ہونے کے لیے کیونکہ ان کے گھر دور تھے اور منال کے ہاسٹل میں باہر سے کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔

"منال آ کوئی لپ اسٹک بھی۔" الوینہ کی آواز آئی اور ارسل کی آہ بھی صاف سنائی دی تھی۔

"محترمہ کہہ رہی ہیں، کوئی لپ اسٹک بھی لیتی آنا۔" ارسل نے کچھ غصے میں کہہ کر فون بند کر دیا۔

"کیا کہہ رہا ہے؟" ثروت نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

"کہہ رہا ہے۔ لائنر، مسکارا اور لپ اسٹک لیتی آنا" منال نے اس کے الفاظ دہرائے۔

"ارسل نے لگانی ہے؟" ثروت نے پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"یار! اب تمہارے کون سے ڈرامے میں ہیرو مسکارا اور لائنر لگاتا ہے؟"

"تم بھی تو بات پوری بتایا کرو ناں" ثروت نے اس کے کندھے پر تھپڑ مارا جو ہنستے ہوئے دروازہ کھول رہی تھی۔

☆☆☆

ڈنر بہترین تھا۔ اور کی بتیوں سے لے کر نیچے بچھے قالین تک۔ شوز سے لے کر کھانے تک۔ ہر ایک چیز بہترین تھی اور اس ڈیڑھ ہفتے میں بعد پہلی دفعہ منال نے ارسل کو خوش دیکھا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کی خوشی نظر آتی تھی۔ بات، بات پر مسکراتا۔ ہر ایک سے مسکرا کر سلام کرتا وہ وہاں کھڑے ہر ایک شخص سے منفرد تھا۔

منال نے دوبارہ اسے دیکھا اس نے سفید رنگ سے ہٹ کر سیاہ رنگ کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ ماتھے پر بکھرے بال جیل لگا کر ایک طرف کو سیٹ کیے گئے تھے۔ اب کی دفعہ ارسل نے بھی اسے دیکھا تھا اور شاید پہلی دفعہ دیکھا تھا کہ اس کی مسکراتی آنکھوں میں ستائش تھی۔ چند سیکنڈ صرف چند سیکنڈ کے لیے اوپر کی سنہری بتیوں کے نیچے سب کچھ رک گیا۔ چلتے پھرتے لوگ۔ ہوا، روشنی، زمین سب۔ بس وہ دو کھڑے تھے بہت فاصلے پر۔ الگ، الگ کہانیاں لیے دو لوگ۔

منال کو لگا اسے کسی نے آواز دی ہے اس نے ہڑبڑا کر ادھر، ادھر دیکھا ثروت اسے آواز دے رہی تھی، کسی چیز کی ضرورت تھی۔ اس نے دوسری طرف دیکھا اب وہ وہاں نہیں تھا، اب وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے بس ایک دفعہ اسے اسٹیج پر انعام لیتے دیکھا تھا۔ پروفیسر کھڑے اس کی تعریف کر رہے تھے اور وہ ایک بازو سینے پر رکھے تھوڑا جھک کر ان کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

ڈنر شروع ہوا تو وہ چاروں چار پلیٹس میں مختلف کھانے لے کر ایک ٹیبل پر چلی آئیں تاکہ بار بار اٹھنا نہ پڑے۔ سب ٹیبلز پر طلبا بیٹھ چکے تھے۔ منال نے نظریں گھما کر دیکھا، وہ وہاں کہیں نہیں تھا۔

منال نے اپنی پلیٹ اٹھائی اور کھانے لگی اسی وقت نیہا نے جوش سے ہاتھ ہلا کر کسی کو اپنی ٹیبل پر آنے کی دعوت تھی۔ ان کے پاس دو کرسیاں خالی تھیں۔ منال نے سر اٹھانے کی زحمت بھی نہیں کی

کیونکہ اسے معلوم تھا نیہا کی ساری خوش اخلاقی کس بندے پر ختم ہوتی ہے۔ وہ منامل کے ساتھ والی کرسی کو ذرا سا دور کر کے اس پر بیٹھ گیا تھا اور اس کا دوست اس کے ساتھ والی پر۔

"یار نومی کی بھی حد ہے آج ہی بھڑا کرنا تھا اس نے۔ پہلے ہم پاگلوں کی طرح بھاگتے رہے، اب اس کی قسطیں بھی کروائیں" اس کا دوست کھانا کھانے کے بجائے غصے میں بول رہا تھا۔

"چھوڑ دو اب۔ کھانا کھاؤ۔" ارسل نے گہرا سانس لے کر اپنے دوست سے کہا۔

"آپ سب کا ایونٹ کیسا رہا؟" اس نے پہلے منامل کو دیکھا پھر ان تینوں سے پوچھا۔

"بہترین۔" ثروت نے ٹیبل سے اٹھتے ہوئے کہا اسے کچھ اور چاہیے تھا۔ سب باتیں کرتے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ نیہا کی آواز سب سے نمایاں تھی۔ ثروت اور رمشا بھی بول رہی تھیں لیکن منامل خاموش تھی اور اس خاموشی کی عادت سب کو تھی اس لیے ہر کوئی اپنی باتوں اور کھانے میں مشغول تھا۔ درمیان میں رکھی پلیٹ میں آخری کباب کا پیس بچا ہوا تھا۔ ارسل نے پلیٹ تھوڑی آگے کی اور چمچہ سے اشارہ کر کے اسے کہا۔

"لے لو" منامل نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اس کی ٹائی ڈھیلی تھی اور وہ کھانا کھاتے ہوئے ابرو اٹھا کر اسے اشارہ کر رہا تھا کہ یہ لے لو۔ اس نے سامنے دیکھا ہر کوئی اپنی باتوں میں مگن تھا۔ منامل نے کباب اٹھا کر اپنی پلیٹ میں ڈال لیا۔ اب وہ ٹیک لگائے کرسی پر بیٹھا تھا۔ نیہا اور رمشا اٹھ گئی تھیں۔

منامل نے کھانے کے بعد اپنی کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ فون استعمال کر رہا تھا اس کے دیکھنے پر سر اٹھایا۔

"کیا ہوا؟"

"تمہیں لائنز اور مسکارے کا پتا ہے؟" اسے اس سوال کی بالکل توقع نہیں تھی وہ بھی تم کے ساتھ شاید وہ اپنی کل کی بات کا ازالہ کر رہی تھی۔ اس نے فون جیب میں ڈال کر اس کی طرف رخ کیا۔

"ہاں۔ ایک دفعہ میری بہن نے منگوایا تھا مجھ سے۔ میں سیکنڈ ایئر میں تھا۔ اور پتا ہے میں کیا لے کر گیا تھا؟" اس نے ہنسی روکتے ہوئے اس سے پوچھا۔ منامل نے دلچسپی سے انکار میں گردن ہلائی۔

"میں موز چاکلیٹ اور سلانٹی لے گیا تھا۔" وہ دونوں اکٹھے زور سے ہنسے تھے۔ فاصلے پر کھڑی ثروت اور رمشا نے حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ منامل کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔

"باجی نے مجھے اتنا ڈانٹا کہ میں ان کے پیسوں کا اتنا زیادہ موز لے آیا تھا۔ جو بعد میں اما اور میں نے ایسے ہی ہنستے ہوئے کھایا تھا۔ اس دن کے بعد سے میں ان دو چیزوں کو نہیں بھولا۔" وہ ہنسی روکتے ہوئے بولا۔

"یہ میری بہن کی فیورٹ چیزیں تھیں، اس لیے مجھے یہ بھی پتا ہے کہ مسکارا پلکوں پر اور لائنر لائن کی طرح آنکھوں پر لگاتے ہیں"۔ وہ اب آنکھوں میں آیا پانی صاف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"یہ سب کو نہیں پتا ہوتا؟" منامل نے اس کی تشریح پر بمشکل ہنسی روکی تھی۔

"بالکل نہیں۔ ارسلان آتا ہے تو اس سے پوچھنا۔ میں شرط لگانے کو تیار ہوں اسے نہیں پتا ہو گا" وہ ہنستے ہوئے بچوں کی طرح خوشی سے کہہ رہا تھا۔ منامل نے اس کی مسکراہٹ سے نظر ہٹا کر سامنے دیکھا، ہر کوئی خوش اپنے آپ میں مگن تھا۔

ارسل کو کسی نے بلا لیا تھا وہ ابھی آیا کہتے ہوئے اٹھا، اسے دیکھا جو ہنسنے کی وجہ سے سرخ ہو گئی تھی اور چلا گیا۔

ہاسٹل جا کر سب سے پہلے ثروت نے اس سے ہنسنے کا ماجرا ہی پوچھا تھا۔

وہ ساری رات جاگتی رہی تھی۔ سنہری بتیاں، مسکراتی آنکھیں، کالا رنگ، آس پاس مخصوص پرفیوم کی خوشبو۔ پہلی دفعہ منامل نور نے کھلی آنکھوں سے خواب دیکھے تھے اور کھلی آنکھوں سے دیکھے گئے

خوابوں کی قیمت بڑی مہنگی ہوتی ہے۔

☆☆☆

دن معمول کی طرح گزرنے لگے۔ وہی روز کی کلاسز، لیکچرز، پریزنٹیشنز، کیفے کے سموسے، ٹیچرز کی ڈانٹ۔ یہی عام یونیورسٹی کے دن ہیں جنہیں ہم پوری زندگی بیٹھ کر یاد کرتے ہیں۔ یہی معمول کے دن ہوتے ہیں جو کئی مرتبہ آگے زندگی میں آنے والی مشکلات میں جینے کا سبب بنتے ہیں۔ ان ہی دنوں کو یاد کر کے ہم مسکراتے ہیں، کھلکھلاتے ہیں اور مشکلات جھیلتے جاتے ہیں۔

ان دنوں میں آس پاس سلام کرتا مسکراتا لہجہ ایک نیا اضافہ تھا مناہل نور کی زندگی میں۔ وہ کہیں نہ کہیں نظر آ جاتا۔ روک کر وہ کبھی بات نہیں کرتا تھا۔ پھر بھی وہ اس کے لیے سارے ڈیپارٹمنٹ میں تھا۔

خدا خدا کر کے سمسٹر ختم ہوا تو یونیورسٹی کے ہر شعبہ نے ایک ہفتے کے لیے مختلف مقابلے رکھ لیے۔ ان مقابلوں کی لسٹ دیکھنے کی زحمت مناہل نے نہیں کی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں۔

مناہل پیپر دے کر آئی تو خوشی خوشی اپنا سامان پیک کرنے لگی، کوئی نہ کوئی بھائی کل لینے آ جاتا۔ دو ہفتوں کی سمسٹر بریک تھی۔ سامان بھی لے کر جانا تھا۔ ہارٹ اٹیک تو اسے تب آیا جب ثروت نے کانوں میں صور پھونکا۔

"مناہل! تم گھر نہیں جا سکتیں۔" ثروت بیڈ پر چوکڑی مار کر بیٹھی چپس کا پیکٹ کھول رہی تھی۔

"کیوں ایسی کون سی آفت آ پڑی ہے؟" مناہل نے اپنا کام جاری رکھا۔

"تم کیوں نہیں سامان پیک کر رہیں؟" اس نے ثروت کو دیکھا جو فون پر یقیناً کوئی نیا ڈرامہ دیکھنے کے لیے ڈھونڈ رہی تھی۔ چپس کا پیکٹ بیڈ پر کھلا پڑا تھا۔

"کیونکہ ہم دونوں ہی گھر نہیں جا رہیں۔" اب اس نے کوک کا کین کھولتے ہوئے مناہل کو پریشان کیا تھا۔

"تم یہ پہیلیاں بجھوانا بند کرو گی ثروت۔ تم جاؤ نہ جاؤ، میں جا رہی ہوں گھر۔" اس نے دوبارہ ہینگر سے کپڑے نکال کر بیگ میں ڈالنا شروع کیے۔

"ہم ایک ہفتے بعد گھر جائیں گے۔" اس کا لہجہ ٹھوس تھا۔ مناہل ماتھے پر ڈھیروں بل لیے بیڈ پر اس کے پاس آئی۔ ثروت ذرا دور کھسکی۔

"یار! گھر جا کر کیا کرنا ہے۔ تم نے ہادی کے ایک سو تیرہ کام اور میں نے اسی لوگوں کے۔ ہماری اماؤں کو ہمارا نام ایسے رٹ جائے گا جیسے ہمیں اے بی سی۔"

"کچھ بھی ہو، میں گھر جا رہی ہوں۔" وہ واپس اپنے سامان کے پاس آنے لگی۔

"ڈاکٹر آمنہ آج لسٹ پر نام لکھ رہی تھیں۔ ان لوگوں کا جو مختلف مقابلوں میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ فوڈ اینڈ سائنسز والوں نے ایک مقابلہ رکھا ہے کولیسٹرول فری میٹھے پر۔ میں نے اس میں تمہارا نام لکھوا دیا۔ ساتھ انہوں نے چالان دیا۔ میں نے وہ بھی بھر کر دے دیا۔ اور انہوں نے مجھے کہا میں خود ڈاکٹر آمنہ مناہل کو دیکھنے آؤں گی کیونکہ مجھے بہت خوشی ہے کہ مناہل نہ صرف۔"

ثروت کی تقریر ادھوری رہ گئی تھی کیونکہ مناہل نے اس کا چپس کا پیکٹ اس کے اوپر پھینک دیا تھا۔

"مناہل! میری بات سنو۔" لیکن وہ کچھ سننے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کی بوتل کا کین اب مناہل کے ہاتھ میں تھا۔

"نہ مناہل پلیز۔ چپس تو میں بیڈ سے چن، چن کے کھا لوں گی لیکن یہ ڈرنک۔ پہلے ہی دو سو روپے کا چالان بھرا ہے تمہارا۔" اس کی ساری التجا دھری کی دھری رہ گئی۔ مناہل نے کین پھینک دیا۔ پھر تکیے، کپڑے ایک، ایک کر کے ثروت کو جا کر لگتے رہے۔ اسے بہت کم غصہ آتا تھا اور جب آتا تھا تو سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔

دو گھنٹے بعد وہ دونوں ہاسٹل کے باہر بینچ پر بیٹھی چپس کا پیکٹ اور کوک کا کین کھول رہی تھیں۔

"کولیسٹرول فری؟ میں نے اپنی زندگی میں تمہیں کب ایسا میٹھا کھلایا ہے؟ چار، چار کپ چینی

ڈالتی ہوں میں۔ پھر بھی تم لوگوں کو چینی کم لگتی ہے اور میں مزید چینی ڈالتی ہوں۔ اُف اللہ۔ بس ڈاکٹر آمنہ کو بتانا ضروری تھا؟" وہ اب کھا جانے والی نظروں سے ثروت کو دیکھ رہی تھی جواب مزے سے چپس کھا رہی تھی۔ منابل کے دیکھنے پر سنجیدہ ہوئی۔

"پہلے نہیں کبھی بنایا تو۔ اب بنا لینا۔ مجھے یقین ہے تم ہی جیتو گی" کیا عزم تھا۔

"تم پر ہی نہ چینی چھڑک کر پیش کر دوں انہیں۔" ثروت کی ڈرنک منہ سے باہر گئی۔

"کولیسٹرول فری میٹھا بنانا ہے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ایسا اعلا مشورہ دینے پر گلا گھونٹ دوں تمہارا؟" منابل کا غصہ نیچے نہیں آرہا تھا۔ اسے میٹھا پسند تھا اور گھر میں میٹھا بنانے کے لیے وہ مشہور بھی تھی لیکن وہ عام وسی طرز کے حلوے، رس ملائی وغیرہ ہوتی تھی۔ اب کولیسٹرول فری میٹھا بھی کوئی چیز ہے اور اسے بناتے کیسے ہیں، یہ تو اس کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا۔ منابل نے دانت کچکچا کر کوک کے گھونٹ بھرتی ثروت کو گھورا۔

"یار! ایسے نہ دیکھو۔ ہضم نہیں ہوگا کچھ۔ اور یاد ہے۔ پچھلی دفعہ کتنا مزا آیا تھا۔ ہم انٹروورٹس ایویں پیچھے رہتے ہیں۔ ڈرتے رہتے ہیں۔ شرماتے رہتے ہیں۔ ہمیں کام کرنا پڑے تو ایسا زبردست کام کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ ایکسٹروورٹس ہمیں موقع ہی نہیں دیتے۔"

اب وہ کسی طرح اس کے غصے کو کم کرنا چاہتی تھی جو کڑی مارے بیٹھی وہ بالکل سیدھا دیکھ رہی تھی۔ منابل نور کا غصہ برداشت کرنا مشکل تھا۔

"مجھے گھر جانا تھا ثروت۔ دو مہینے ہو گئے ہیں۔ پچھلی چھٹیوں میں نیہا نے پھنسایا، اب اپنی ہی بہن نے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اس دفعہ گھر کو آگ لگ گئی، گھر کے چراغ سے" شعر پر اپنے آپ کو داد دیتے ہوئے اس نے منابل کے آنسوؤں کو دیکھا۔

"یار! ایک ہفتے کی بات ہے۔ آج جمعہ ہے۔ پیر سے ایونٹ شروع ہے۔ اگلے جمعے کو تم مقابلہ جیت جاؤ گی اور ہم گھر۔ اس دوران ڈرامے دیکھتے ہیں۔" اپنی بات کے آخر میں ہی اسے بہت کچھ غلط ہونے کا احساس ہو گیا تھا اس لیے چپ ہو کر بیٹھ گئی۔

"جیت جائیں گے۔" منابل نے اس کی نقل اتاری۔ "جیتیں گے کیسے۔"

"یار! تم کچھ بھی بنا لو۔ کسٹرڈ، رس ملائی۔ ٹھنڈا موسم ہے۔ ٹھنڈا گرم سب اچھا لگے گا۔" منابل کی ان مفت کے مشوروں کی پٹاری سے بس ہو گئی تھی وہ اٹھ گئی، یہاں بیٹھنے سے اچھا تھا وہ کمرے میں جا کے رو لے۔

"وہ نہیں کھائیں گے تو ہم کھا لیں گے بیٹھ کے۔ ہم اچھا سا ڈرامہ لگائیں گے اور بیٹھ۔" وہ جاتے جاتے رکی اور اس کے مڑنے سے پہلے ثروت بھاگ چکی تھی۔

☆☆☆

پیر کو منابل ہلکے لیمن رنگ کی لمبی قمیص پہنے ساتھ ہم رنگ ٹراؤزر دوپٹہ لیے زرد تصویر بنی ایکل ہال کے باہر کھڑی تھی۔ کیونکہ ثروت میڈم کی پورا ہفتہ الا بلا کھانے سے طبیعت خراب ہو گئی تھی۔ منابل نے گہرا سانس لیا اپنے ہاتھ میں پکڑی چیزوں کو دیکھا اور پورے ہوش و حواس میں اندر نہ جانے کا فیصلہ کیا۔

"نور؟" ایک حیران آواز پیچھے سے آئی۔ بس آج وہ اس بندے کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ساری رات ثروت کی خدمت کرنے اور مقابلے کی ٹینشن کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور ابھی تو آنسو بھی تیر رہے تھے ان میں۔

"نور۔ کیا حال ہے؟" اس نے اس کے ہاتھ میں پکڑے سامان کو دیکھ کر پوچھا۔

"السلام علیکم" مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق سلام تو کرنا تھا۔

"وعلیکم السلام۔ آپ ادھر وہ بھی اکیلی۔" وہ اب ہاتھ میں پکڑی لسٹ دیکھ رہا تھا۔
"میں بھی جا رہی تھی" وہ سائیڈ سے نکلنے لگی۔
"کدھر۔ یہ آپ کا ہی نام ہے نا۔" لسٹ آنکھوں کے آگے لہرائی۔ منائل نے انکار میں گردن ہلائی۔
"اوہ۔ ڈاکٹر آمنہ نے مجھے بھیجا تھا یہاں کہ ایک اسٹوڈنٹ نے حصہ لیا ہے۔ لسٹ میں نام دیکھنے کے باوجود مجھے یقین نہیں آیا، یہ تم ہو۔" اب وہ کھل کے ہنس رہا تھا۔
"تمہاری ساری کلاس میں سے صرف تم آئی ہو یار" اس نے اپنا قہقہہ بمشکل روکا تھا۔
"ثروت کدھر ہے؟" اس کی شکل دیکھتا وہ تھوڑا سنجیدہ ہوا۔
"آج ہی بیمار ہونا تھا اسے۔ مجھے پھنسا کر خود سو گئی ہے" منائل نے چہرہ جھکائے رکھا اسے یقین تھا ایک نہ ایک آنسو تو نکلے گا۔
"تو تم اکیلی ہو۔ اندر فوڈ اینڈ سائنس کا سارا ڈیپارٹمنٹ تیار بیٹھا ہے۔" اس نے اندر جھانکا۔
"اس لیے بہتر ہے کہ میں اندر نہ جاؤں" وہ سائیڈ سے جانے لگی تو ارسل نے اپنا ہاتھ آگے کر دیا اس طرح کہ جانے کا رستہ رک گیا۔
وہ دوسری طرف سے نکل گئی۔ ان سب نے اسے پاگل سمجھ لیا تھا۔
"نورا! رکو۔" وہ اس کے پیچھے آیا
"اچھا۔ یہاں آؤ۔ بیٹھو۔" وہ ہال کے باہر رکھے بینچ پر بیٹھنے کو کہہ رہا تھا۔
"پلیز، مجھے جانے دو" منائل نے منت کی۔ آس پاس سے گزرتے اسٹوڈنٹس نے اسے دیکھا۔
"کیوں میری ڈگری کینسل کروانی ہے تم نے۔ لوگوں کو لگے گا، تنگ کر رہا ہوں۔" وہ اس سے پہلے بینچ کے کونے پر بیٹھ گیا۔ اس نے آج پھر سفید رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کی سیدھی طرف کسی برانڈ کا لوگو بنا ہوا تھا۔ منائل بینچ کے دوسرے کونے پر بیٹھ گئی۔ سر جھکائے ہاتھ گود میں رکھے۔
"تم بنانے کیا لگی ہو۔ مقابلہ کس چیز کا ہے" کاغذ سیدھا کر کے پڑھنا شروع کیا۔ "کولیسٹرول فری۔" منائل نے اس کی بات کاٹی۔
"رس ملائی۔" اس نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔
"اچھا۔ واہ! چینی کے بغیر۔" اس نے پھر بات کاٹی۔
"نہیں۔ جیسی عام رس ملائی ہوتی ہے۔ چینی والی۔ جو سب کے گھروں میں بنتی ہے" وہ رک، رک کر بولی۔
"واٹ؟" حیرانگی سے جھک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر وہ ہنستا ہی چلا گیا۔ منائل کا دل رو رہا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر ہونٹ بھینچ کر اس ہنستے ہوئے بندے کو گھورا۔ اگر ثروت ہوتی تو اسے وہ کچا چبا جاتی۔
اس کے دیکھنے پر ارسل کی ہنسی کو بریک لگی۔
"بہت کلاس کا آئیڈیا ہے یہ تو۔ ٹریڈیشنل رس ملائی" یہ کہنے کے ساتھ اسے دوبارہ ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ منائل نے اٹھنا بہتر سمجھا۔
"نہیں یار!! اچھا آئیڈیا ہے۔ مطلب تم ان لوگوں کو چیلنج کر رہی ہو کہ رس ملائی چینی کے بغیر بن ہی نہیں سکتی۔ گڈ۔ ویری گڈ" وہ ٹیک لگائے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائے ہنس رہا تھا۔
"تم نے اور کتنا مذاق اڑانا ہے؟" منائل نے ماتھے پر ڈھیروں بل لا کر اسے گھورا۔
"اچھا سوری" وہ سیدھا ہوا۔ پھر بینچ سے اٹھا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
"تو مس نورا! اصل میں بات یہ ہے کہ اب آپ کہیں نہیں بھاگ سکتیں۔ کیونکہ میں نے آپ کی ٹیبل آدھے گھنٹے میں سیٹ کی ہے۔ میں صبح سات بجے کا اس رس ملائی کے یونٹ کے نیچے اٹھا ہوا

ہوں۔ڈاکٹر آمنہ نے تاکید کی تھی کہ ان کی اسٹوڈنٹ آرہی ہے۔وہ خود نہیں آسکتیں تو میں ضرور پہنچوں۔" منائل نے منہ بنا کر اسے دیکھا لیکن وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

" اس لیے آپ کہیں بھی نہیں جاسکتیں۔ آدھے گھنٹے میں ایونٹ شروع ہوگا۔آپ رس ملائی بنائیں گی پھر آپ جہاں مرضی جائیں۔" وہ ہاتھ باندھے، سیدھا کھڑا بول رہا تھا۔پھر بینچ پر آکر بیٹھ گیا۔

" یہ بتاؤ، اتنا برا پھنسایا کس نے ہے" واپس اپنی جون میں لوٹتے ہوئے اس کا پہلا سوال یہ تھا۔ منائل پہلے خاموش رہی پھر ساری کہانی سنادی۔وہ بھی سر ہلاتا ہوا سنتا رہا۔

"میرا نہیں خیال کہ میں یہاں کچھ بھی ہلا سکتی ہوں۔اس لیے مجھے جانے دو۔" اس نے دوبارہ اس کی منت کی۔ارسل نے اس کی طرف دیکھا وہ تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔آنکھیں سرخ تھیں۔منائل کے دیکھنے پر اس نے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھنے لگا۔

"تم یہ نہ سوچو کہ یہ کوئی مقابلہ ہے۔سارا خوف ہی اس ایک لفظ کا ہے۔"مقابلہ"" اس نے اس ایک حرف پر زور دیا۔دیکھ وہ سامنے رہا تھا اس لیے منائل اس کی طرف دیکھتی رہی۔

"ہم زندگی میں اس حرف کے خوف سے ہمیشہ پیچھے رہ جاتے ہیں۔ہم چیزوں کو انجوائے ہی نہیں کرتے۔ہم حصہ لے کر خوشی محسوس نہیں کرتے۔ کیوں؟ کیونکہ ہم اگر سکون سے بیٹھے، انجوائے کیا تو اس مقابلے کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔اور ہم پیچھے رہ جاتے ہیں۔" اس نے منائل کی طرف رخ کیا۔اس کے دیکھنے پر وہ سامنے دیکھنے لگی۔

"ہمارا دماغ بہت بڑا کھلاڑی ہے۔ہمیں بس اسے ٹرینڈ کرنا ہے۔تم اس ایونٹ کو ری انٹرپریٹ کرو۔مطلب تم سوچو کہ تم اپنے کچن میں کھڑی ہو اور آرام سے رس ملائی بنا رہی ہو۔آس پاس کوئی نہیں ہے۔اور تمہیں بہت مزا آرہا ہے۔"

"ہم" منائل نے ہنس کر سر جھکا لیا۔

"کیا ہوا؟"

"ایسے تھوڑی ہوتا ہے۔سب سامنے کھڑے ہیں۔سوال پوچھ رہے ہیں۔وہ کہہ رہے ہیں، چینی نہیں اور میں چمچ بھر، بھر چینی ڈال رہی ہوں"

"سائیکولوجی کہتی ہے کہ آپ کے آدھے سے زیادہ مسئلے آپ کے خیالات کی وجہ سے ہیں۔اب دیکھو۔تم نے پہلے ہی دماغ میں بٹھا لیا ہے کہ وہاں اتنے لوگ ہوں گے۔وہ سوال کریں گے۔مذاق اڑائیں گے۔تم فیل ہو جاؤ گی۔ایسا ہی ہے؟" ارسل کے سوال پر اس نے ہاں میں سر ہلایا۔

"اصل میں ایسا کچھ نہیں ہوگا۔وہاں کسی کو فرق نہیں پڑتا۔تم کیا بنا رہی ہو۔کیا ڈال رہی ہو۔انہیں پسند نہ آیا بھی تو وہ چپ چاپ چلے جائیں گے۔تم اپنے بے تحاشا خوف کی بدولت ایک بہت اچھا ایونٹ ضائع کر رہی ہو۔میں تمہیں چیلنج کرتا ہوں کہ تم اندر جاؤ۔لوگوں کو دیکھو۔ان سے ملو۔اپنی ڈش بناؤ۔اور اگر تمہیں مزا نہ آئے تو پیسے واپس۔" منائل ہنس دی۔

" چاہو تو میرے سر پر رس ملائی مار دینا۔" وہ بینچ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا تھا۔منائل نے آس پاس دیکھا۔لوگ خوش گپیاں کرتے اندر بڑھ رہے تھے۔ کچھ دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔

"ٹائم پورا ہو چکا ہے۔جلدی کرو۔" ارسل نے اٹھتے ہوئے کہا۔منائل نے اپنا سامان اٹھایا۔ ارسل نے مڑ کر اس کے ہاتھ سے سامان لیا اور دونوں اندر کی طرف بھاگے جہاں اسپیکر میں منائل نور کو بلایا جا رہا تھا کہ وہ اپنی ٹیبل پر آجائیں۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں ہال کے باہر اسی بینچ کے پاس نیچے گھاس پر بیٹھے تھے۔رس ملائی کا ڈبا اور سارا ساز و سامان ان کے پاس پڑا تھا۔منائل کے ہاتھ میں ایک لسٹ تھی جس کے اوپر جج نے حصہ لینے والوں کے مارکس، ریمارکس کے ساتھ لکھے ہوئے تھے۔ارسل کے بقول وہ بڑی مشکلوں سے اندر کے

کسی بندے سے لے کر آیا تھا۔ منال نے وہ صفحہ ہزارویں بار پڑھ لیا تھا۔

ارسل نے رس ملائی کا ڈبا کھولا۔ دو رکابیوں میں رس ملائی ڈالی اور اس کے ہاتھ سے کاغذ لے کر سائیڈ پر رکھ دیا۔

"جتنی مرضی دفعہ پڑھ لو۔ جو اور جتنا لکھا ہے، ویسا اور اتنا ہی رہے گا" وہ ہنس نہیں رہا تھا لیکن آواز میں ہلسی کی آمیزش تھی۔ اس نے ایک پلیٹ منال کو دی اور دوسری میں سے ایک چمچ کھانے کے بعد زمین پر رکھ دی۔

"صحیح نہیں بنی؟"

"میں نے کبھی میٹھا نہیں کھایا۔ یا کھایا ہوگا تو بہت بچپن میں۔ اس لیے مجھے یاد نہیں۔" وہ پلیٹ میں چمچ چلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟ سچ میں؟" منال نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "یا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ تم نے اتنا برا میٹھا کبھی نہیں کھایا۔" وہ اس کی بات پر ہنس دیا۔

"نہیں۔ میں نے واقعی کبھی میٹھا نہیں کھایا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا لوگوں کو اتنا میٹھا کیوں پسند ہوتا ہے۔ میرے کزنز چائے میں اتنی چینی ڈالتے ہیں کہ ان کی وجہ سے میں چائے ہی نہیں پیتا۔ کیونکہ اپنی پھیکی چائے میں سے بھی مجھے چینی کی خوشبو آتی ہے۔"

موسم ٹھنڈا تھا۔ منال کے کندھے تک آتے بال پیچھے کی طرف اڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے سے فاصلے پر بیٹھے شخص کی طرف نہیں دیکھا لیکن اس کا دل چاہا وہ اسے اس کے بولنے پر داد دے کیا کوئی عام باتیں بھی اتنے خوبصورت لہجے میں کرتا ہوگا۔ رک کر آہستہ آہستہ ہر لفظ مکمل۔

"میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ایسا انسان دیکھا ہے جس نے کبھی میٹھا نہیں کھایا۔ چلو چائے تو کافی لوگ نہیں پیتے لیکن میٹھا۔ ناممکن۔" وہ انکار میں گردن ہلا رہی تھی۔ ارسل نے اس کی طرح ہی مسکرا کر نفی میں گردن ہلائی۔

"میری امی کی میری پیدائش کے وقت وفات ہوگئی تھی۔ بابا نے دوسری شادی نہیں کی۔" وہ درخت کے آس پاس پھرتی چڑیا کو دیکھتا بول رہا تھا۔ دور سے دیکھو تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ خود سے باتیں کر رہا ہے۔ آواز دھیمی تھی منال نے اپنی حسیات اس کی طرف مبذول کیں۔

"باجی مجھ سے پانچ سال بڑی تھیں۔ صرف پانچ سال۔ انہوں نے مجھے ماں بن کر پالا۔ بھائی، بہن، ماں سب کی محبت ایک انسان نے دی ہے مجھے۔ وہ میٹھا نہیں کھاتی تھیں۔ کیوں؟ کیونکہ بابا کو شوگر تھی۔ وہ ایک خوبصورت انسان ہیں۔ پھر ان کی نقل کرتے ہوئے میں نے بھی میٹھا نہیں کھایا اب اتنی عادت پختہ ہوئی ہے کہ کوشش کے باوجود میٹھا نہیں کھایا جاتا۔" منال نے اس شخص کو دیکھا جو ہر وقت مسکراتا تھا۔ ہر مسکرانے والا شخص تنہا کیوں ہوتا ہے؟

اس نے کبھی اسے کسی سے بدتمیزی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ گارڈز، صفائی کرنے والوں کو بھی محبت سے جھک کر سلام کرتا تھا۔ اتنی دفعہ دیکھا تھا ڈیپارٹمنٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا جونیئرز کو کچھ نہ کچھ سمجھا رہا ہوتا تھا۔

"تمہاری باجی نے تمہاری بہترین تربیت کی ہے۔" منال نے دل سے اس کی تعریف کی تھی۔

"یہ میری آج تک کی زندگی میں ملنے والا بہترین کمپلیمنٹ [تعریف] ہے۔" اس نے جھکے سر سے کہا۔ آواز میں کیا کوئی ملال تھا؟

"تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے نا؟" ارسل نے اس کی طرف آنکھیں چھوٹی کر کے دیکھ کر کہا۔ منال نے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا۔

"تم سے کیسے میں سب کچھ آرام سے کہہ دیتا ہوں۔ مجھے سوچنا نہیں پڑتا کہ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ میں نے کبھی کسی سے اپنی بہن کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن تم سے بات کر کے اچھا محسوس ہوتا ہے۔" منال نے

آس پاس نظر دوڑائی، آسمان پر کچھ ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کی کہ شاید کوئی دیکھنے کے لیے چیز مل جائے،، شاید توجہ بھٹکنے سے وہ بلش نہ کرے۔

"باجی کدھر ہوتی ہیں؟" منال نے قریب آتی ثروت کو دیکھا۔ اس نے اسے ہال سے نکلنے کے بعد فون کر کے بلایا تھا۔

" میدان فتح کرنے کے بعد آپ دونوں ساری یونی چھوڑ کر ادھر بیٹھے ہیں۔" ارسل کے جواب سے پہلے ثروت ان کے پاس چوکڑی مار کر بیٹھ گئی تھی۔

" کیا بنا؟ پھر کھڑے ہو کر تالیاں بجیں؟" ارسل نے اس کے آگے لسٹ کر دی اور خود نے پلیٹ اٹھالی۔

"اس میں تو۔ تمہارا نام ہی نہیں ہے۔" ثروت نے بے یقینی سے منال کو دیکھا اور پھر اسے ہنسی کا دورہ پڑ گیا تھا، ارسل نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

" بالکل اس میں میرا نام ہی نہیں ہے۔ مجھے۔"

"مطلب ججز نے تمہاری ڈش ٹیسٹ کرنے کے بعد تمہیں تین میں رکھا نہ تیرہ میں" ثروت نے ہنسی روک کر مزید ایک عدد شگوفہ چھوڑا۔

" کھا آپ تشریف لے جائیں میم!" منال نے باری، باری ہنسنے والوں کو دیکھا جو سرخ ہو گئے تھے اور پھر پلیٹ اٹھالی۔ اس ثروت سے تو وہ بعد میں پوچھے گی۔

☆☆☆

چار سال۔ پڑھنے میں ایک لمبا عرصہ لگتا ہے۔ گزارنے والوں سے پوچھو تو کہتے ہیں کہ ابھی کل کی ہی تو بات ہے۔ پہلے سال سلام دعا سے شروع ہونے والی بات آہستہ، آہستہ بڑھنے لگی۔ کبھی ارسل کا کوئی مسئلہ ہوتا تو کبھی منال کا۔ کبھی اسائنمنٹ، کبھی ہاسٹل کی بات یا یونیورسٹی کی بات، چڑیاں، پھول، دنیا، بزنس، پڑھائی۔ چھوٹی، چھوٹی باتوں سے نکلنے والی لاتعداد باتیں تھیں۔ منال کو خود بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کبھی زندگی میں اتنی باتیں کر سکتی ہے۔ دراصل ہر انسان بول سکتا ہے جب اسے معلوم ہو کہ سامنے والا اسے دنیا کے معیار پر پرکھ نہیں رہا، اور جب وہ فریق کے شوق ملتے ہوں تو وہ گھنٹوں بول سکتے ہیں۔

کافی دفعہ ان کے ساتھ ثروت بھی بیٹھی ہوتی۔

منال نے بھی اس سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ چھپانے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔ ڈیپارٹمنٹ کو ان دونوں کی عادت ہو گئی تھی۔ ایک دفعہ نیہا نے ان کی باتیں سنیں تو دونوں کو ٹوک دیا۔

" سیریسلی آپ دونوں یہ باتیں کرتے ہیں۔" وہ اسٹاک ایکسچینج پر گفتگو کر رہے تھے۔ نیہا بہت بدمزہ ہوئی۔ ارسل کی یہ سب سے خوبصورت بات تھی وہ منال کو ٹوکتا نہیں تھا۔ سنجیدہ گفتگو میں بھی وہ کہیں نہ کہیں سے مزاح نکال لاتا۔

ارسل کا بی اے مکمل ہوا تو اس نے بابا کے بزنس کے ساتھ اپنا بزنس بھی شروع کر لیا۔ یونیورسٹی میں جب تک دونوں رہے، کبھی فون پر بات نہیں کی تھی۔ ارسل کے یونیورسٹی سے جانے کے بعد وہ ایک دوسرے کو ٹیکسٹ کر لیتے تھے۔ جس دن بات نہ ہوتی ارسل یونیورسٹی موجود ہوتا تھا۔ دونوں اپنی، اپنی مصروفیت کے باوجود ایک دوسرے کے لیے موجود ہوتے تھے۔ اس کا ہر ایک عمل بتاتا تھا کہ وہ منال کو پسند کرتا ہے۔ اس کا اسے دیکھنا، خیال رکھنا، ہر دفعہ، ہر جگہ، ہر غم، ہر خوشی میں منال نور کے لیے وہ سب سے پہلے موجود ہوتا تھا۔

☆☆☆

منال بی بی اے کے آخری سمسٹر میں پہنچی تو ہر پاکستانی گھر کی طرح اس کے لیے رشتے آنا شروع ہو گئے۔ اچھی بات یہ تھی کہ ابو کو جلدی نہیں تھی، انہوں نے سب سے کہہ دیا تھا کہ میری بیٹی کی تعلیم مکمل ہو جائے پھر سوچیں گے اور ویسے بھی پچھلے سال ہی ہادی بھائی کی شادی کی تھی۔ اس لیے گھر میں شادی کے حوالے سے سکون ہی سکون تھا۔ البتہ ثروت کے لیے آنے والے رشتوں میں سے چچا چچی

کو جو رشتہ پسند آیا اس کو ثروت سے پوچھ کر ہاں کر دی گئی تھی۔ لیکن جس دن اصل معاملہ کھلا ثروت نے سیکنڈ نہیں لگایا تھا انکار کرنے میں۔

اسفند کو جو لڑکی پسند تھی، ان کے ہاں وٹے سٹے کا رواج تھا۔ انہوں نے کہا آپ ہماری بیٹی لیں اور اپنی بیٹی دیں۔ اسفند اس بات پر اڑا ہوا تھا کہ شادی کرے گا تو وہیں۔ دیکھنے میں لڑکے میں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ ثروت کو جب یہ بات پتا چلی تو وہ اڑ گئی کہ وہ یہاں شادی نہیں کرے گی۔ قیامت بھی آجائے تب بھی نہیں۔ پھر کیا تھا۔ اس کا سارا گھر اس کے خلاف ہو چکا تھا سب سے زیادہ چچی اور اسفند۔

چچا نے اسے سمجھایا۔ اس نے دوبارہ انکار کر دیا تو انہوں نے صاف کہہ دیا وہ زبردستی نہیں کریں گے۔ لڑکے میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اپنا کماتا، خوش شکل لڑکا تھا لیکن وٹہ سٹہ۔ کون نہیں جانتا اس میں ہونے والے مسائل جبکہ وہ اپنے بھائی کو جانتی تھی کہ وہ کتنا جذباتی ہے۔ ہر چیز کو کھیل تماشا سمجھتا۔ اس کی آگے زندگی میں آنے والے مسائل کو وہ دور بین لگائے بغیر بتا سکتی تھی۔ لڑکی سے وہ ایک دفعہ ملی تھی۔ ایک دفعہ ملنے کے بعد بھی وہ اچھے سے بتا سکتی تھی کہ لڑکی غصے کی تیز ہے، جذباتی ہے۔ دو جذباتی انسان مل جائیں تو گھر میں کیا ہوتا ہے؟

ان سب مسئلوں سے بچنے کے لیے وہ ہاسٹل میں ہی رہتی تھی۔ سمسٹر بریک میں بھی وہ ہاسٹل میں ہی پائی جاتی۔ چار مہینے سے یہ صورت حال تھی۔ اب تو چچی کا فون آتا تو وہ نہیں اٹھاتی تھی پھر چچی منال کو فون کرتیں اس سے کہتیں کہ بہن کو سمجھائے "لڑکے میں کوئی کمی نہیں، صرف اسفند کی ضد میں وہ ایک اچھا رشتہ ٹھکرا رہی ہے۔ منال نے ایک دفعہ اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی لیکن ثروت کے پاس اس رشتے سے انکار کی سو وجوہات تھیں۔

"منالی! اسفند میں برداشت کا مادہ اتنا کم ہے کہ سالن خراب بنے تو وہ گھر میں قیامت مچا دیتا ہے، کپڑے استری شدہ نہ ملیں تو وہ اپنی ساری الماری باہر نکال دیتا ہے، کوئی اس سے تھوڑی اونچی آواز میں بات کرلے تو وہ نہیں دیکھتا، آگے کون ہے۔ میں ماننے کے لیے تیار ہوں کہ اسے بگاڑنے میں سب سے زیادہ ہاتھ اماں کا ہے۔ ابھی بھی وہ یہی کر رہی ہیں منال! ان کے بیٹے کو اس کا پسندیدہ کھلونا چاہیے۔ وہ ہر حربہ آزما رہی ہیں تا کہ اپنے بیٹے کو تحفہ دے سکیں۔ وہ یہ نہیں دیکھ رہیں کہ لڑکی بھی جذباتی ہے، غصے کی تیز ہے۔ جتنی جلدی ان دونوں کی محبت پروان چڑھی ہے، اتنی ہی جلدی زمین بوس ہو گی۔ اس سب میں میرا کیا بنے گا؟ وہ لڑ جھگڑ کر اپنے گھر آیا کرے گی۔ ضرور آئے گی۔ اس کا بھائی جتنا بھی اچھا ہو۔ ماں اور بہن کی باتوں میں آ گیا پھر؟ میرا کیا بنے گا؟ مجھے ایک سادہ زندگی گزارنی ہے۔ ایک پرسکون گھر چاہیے مجھے بس۔"

"شادی کے بعد سب ٹھیک نہیں ہو جاتا؟" منال نے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ امی اور چچی کا یہی ایک جملہ تھا۔

"شادی ہے یہ کوئی ری ہیب سنٹر؟ ایک سال سب ٹھیک رہے گا۔ دو سال۔ تین سال۔ عادتیں کبھی نہیں بدلتیں۔ کبھی بھی نہیں۔ اسفند ویسا ہی رہے گا جیسا ہے۔ پھر اس کی بیوی کہتی پھرے گی پہلے تو آپ ایسے نہیں تھے۔" آخر پر وہ ہنسی۔ ایسی ہنسی جو حقیقت کو پرکھ لینے والوں کی ہوتی ہے۔ منالی خاموش ہو گئی، اسے ویسے بھی بحث کرنی نہیں آتی تھی۔ اسے لگتا تھا بحث کا فائدہ نہیں کسی انسان نے ایک دفعہ کوئی فیصلہ کر لیا ہے تو کیا وہ صرف ایک بحث سے فیصلہ بدل لے گا؟

"تم اتنی بے خوف کیسے ہو ثروت؟" وہ دونوں ایک ہی بیڈ پر بیٹھی تھیں۔ درمیان میں ایک چپس کا پیکٹ کھلا پڑا تھا۔ منال نے اپنے ساتھ بیٹھی بہن کو محبت سے دیکھ کر پوچھا۔

"آپ بہادر بنتے ہو۔ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے سے۔ اور آپ بزدل بنتے ہو منال نور! تمہاری

طرح نیوٹرل رہنے سے۔ ادھر کا نہ ادھر کا۔" ثروت نے کہنے کے ساتھ پیکٹ ہاتھ میں دبوچ کر منال کو دیکھا وہ ہاں میں سر ہلا رہی تھی۔

"میں تم سے متفق ہوں۔" منال کہہ کر بیڈ سے اٹھ گئی۔

"ارسل رشتہ بھیجے گا نا۔" پہلی دفعہ ثروت نے منال سے یہ سوال پوچھا تھا۔ منال نے جواب نہیں دیا۔ وہ سامنے دیکھتی رہی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟" وہ کمرے کے درمیان میں کھڑی پوچھ رہی تھی۔

"مجھے ننانوے فیصد یقین ہے کہ وہ بھیجے گا۔ اس سے زیادہ اچھا بندہ میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ وہ کوئی فلرٹ نہیں ہے، وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔ اگر مجھے اس میں ایک بھی خرابی نظر آتی تو ایک دن بھی اس سے بات کرنے نہ دیتی۔ لیکن اب مجھے ایک فیصد سے خوف آتا ہے"

منال پیچھے مڑے بغیر چائے کا سامان لے کر چائے بنانے چلی گئی۔ واپس آئی تو ثروت اس کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ میں اسے پسند کرتی ہوں اور اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔" وہ ثروت کو کپ پکڑا کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس طرح کہ وہ اب ایک دوسرے کے چہرے دیکھ سکتی تھیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟ بتانا چاہیے تھا؟" منال نے اس سے سوال پوچھا۔ اس کے پاس ہر سوال کا جواب ہوتا تھا۔

"ہاں مجھے لگتا ہے، کم از کم ایک دفعہ آپ کو دوسرے بندے کو بتانا چاہیے کہ آپ اسے پسند کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے یہ محبت کے امر کو یقینی بناتا ہے۔" وہ منال کی آنکھوں میں دیکھ کر کہہ رہی تھی۔ منال نے گرم چائے کا گھونٹ بھرا۔ اسے گرم چائے پسند تھی اور ثروت چائے کو برف بنا کر پیتی تھی۔

منال اسے ہمیشہ کہتی کہ تم ٹھنڈے پانی میں پتی گھول کر کیوں نہیں پی لیتیں۔

"محبت کیا ہوتی ہے ثروت؟" وہ اتنا آہستہ بولی تھی کہ ثروت کو اس کا سوال سمجھنے میں چند سیکنڈ لگے۔

"محبت؟" وقفہ کے بعد اس نے کہنا شروع کیا تھا۔

"میرے لیے محبت۔ ایک دوسرے کے لیے موجود ہونا ہے۔ اچھے، برے، خوشی غمی۔ ہر قسم کے حالات میں ایک دوسرے کے لیے موجود ہونا۔" ثروت رکی، اس کے رکنے پر منال نے کہا تھا،

"خیال رکھنا، احساس کرنا، غیر موجود ہونے کے باوجود یہ احساس کہ وہ ہے۔ ایک پکار پر وہ آ جائے گا۔ ایک میسج سے کام ہو جائے گا۔ بلا جھجک ہر بات کہہ دینا، ہر دفعہ، ہر وقت اس کا سب سے پہلے موجود ہونا۔ کیا ان ساری باتوں سے ضروری صرف اظہار کرنا ہے؟ ان ساری چیزوں سے ضروری یہ کہنا کہ مجھے تم پسند ہو؟"

منال خاموش ہوئی تو ثروت نے اسے دیکھا اس کے آنسو نہیں بہہ رہے تھے لیکن پھر بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

"مجھے ابھی بھی لگتا ہے، اظہار ضروری ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود۔" ثروت نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔

"چار سال ایک لمبا عرصہ تھا منال! اب اسے چاہیے وہ رشتہ بھیجے۔ میں نے جنید سے سنا ہے کہ ہادی بھائی کو کوئی لڑکا پسند آیا ہے تمہارے لیے، تمہیں اپنے بھائی کی ضد کا پتا ہے۔ اگر وہ لڑکا اچھا ہوا تو وہ ہاں کروا کے رہے گا۔" ثروت نے مزید زور سے اس کے ہاتھ دبائے جو برف بن گئے تھے۔

"لیکن ابو نے تو کہا۔"

"تایا نے کہا تھا پڑھائی ختم ہونے تک۔ اور اگلے مہینے ہم گھر پر ہوں گے۔" منال نے خوف بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں منال! ارسل میں کسی چیز کی کمی نہیں وہ رشتہ بھیجے گا تو تایا بھی انکار نہیں کریں گے۔"

"لیکن مجھے کیوں خوف محسوس ہو رہا ہے؟" وہ پریشانی سے منال کو دیکھ رہی تھی۔

"تم نہیں کہہ سکتیں تو میں اس سے بات کر لیتی ہوں۔"

"نہیں، میں خود بات کروں گی۔ اس نے کسی کام سے یونیورسٹی آنا ہے، پرسوں میں اس سے بات کروں گی۔"

یہ کہنے کے ساتھ اس نے ارسل کو میسج کیا کہ اسے اس سے ضروری کام ہے۔ وہ آف لائن تھا۔ وہ رات منال نے جاگ کر گزاری تھی، صبح پانچ بجے ارسل کے اوکے کے میسج کو پڑھنے کے بعد وہ سوئی تھی۔

☆☆☆

آخری پیپر والے دن چچا ثروت کو لینے آ گئے تھے کیونکہ چچی کی طبیعت خراب تھی۔ امتحانات کی وجہ سے ارسل اور منال کی ملاقات نہیں ہو پائی تھی۔ وہ یونیورسٹی آ رہا تھا نہ ہی میسج کا جواب دے رہا تھا۔ آخری پیپر کے بعد بھی جب رابطہ نہ ہو پایا تو منال کو پریشانی نے گھیر لیا' وہ ٹھیک تھا۔ وہ چار دن سے آن لائن نہیں ہوا تھا۔

اگلے دن وہ اس کی ان کلاس فیلوز کے پاس گئی جو بی اے کے بعد ایم بی اے کر رہے تھے ان میں ایک اس کا بیسٹ فرینڈ تھا ارسلان۔ اسے دو گھنٹے اس کی کلاس کے باہر انتظار کرنا پڑا تھا۔ آخرکار وہ سب باہر نکلے۔

"ارسلان؟" اسے دیکھتے ہی منال نے آواز دی۔ اس کے ساتھ اس کے تین چار دوست بھی تھے۔

"آپ کا ارسل سے کانٹیکٹ ہے؟" وہ سیدھا مدعے پر آئی۔ ارسلان کے سارے دوست پرانے ہی تھے۔

"آپ کو نہیں پتا؟" ان میں سے ایک لڑکی حیرت سے بولی۔

"کیا؟"

"ارسل کے ابو کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے۔" ان سب نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ سامنے کھڑی لڑکی ارسل کی زندگی میں آنے والی پہلی لڑکی تھی۔ ان سب کو پتا تھا، ارسل اس کے بارے میں سنجیدہ ہے۔ انہوں نے کبھی مذاق میں بھی اس کے حوالے سے تنگ نہیں کیا تھا۔

"اوہ۔ وہ آف لائن ہے۔ مجھے" منال ہکلائی اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا کہے۔

"اٹس اوکے۔ پیپرز ہو رہے تھے ناں شاید اس لیے اس نے نہیں بتایا ہو گا" ارسلان نے بات بنائی منال نے سر ہلایا۔

"اس کے بابا آج ڈس چارج ہو گئے ہیں ہاسپٹل سے، ہم لوگ وہیں جا رہے ہیں۔ اگر آپ نے ساتھ جانا ہو؟" وہی گھنگھریالے بالوں والی لڑکی دوبارہ بولی۔ منال کبھی ارسل کے ساتھ باہر نہیں گئی تھی۔ گھر تو دور کی بات ہے۔ لیکن اس وقت اس نے بغیر سوچے سمجھے ہاں میں سر ہلا دیا تھا۔

"چلیں، گھنٹے تک لگتا ہے ہم نے پھر ملتے ہیں۔" ارسلان نے کہا۔

"میری ایک فرینڈ بھی ہو گی ساتھ۔" اسے نیہا کا خیال آیا۔

"اوکے نو پرابلم ہم بھی تین لوگ ہیں۔" منال نے واپس جا کر نیہا کو منایا۔

منانے کی ضرورت نہیں تھی، وہ ارسل کا نام سنتے ہی تیار ہو گئی تھی۔ گھنٹے بعد وہ ارسل کے گھر کے باہر کھڑے تھے۔ منال کو کبھی اس کے گھر کے بارے میں تجسس نہیں ہوا تھا اس نے کبھی اس سے گھر کے بارے میں نہیں پوچھا تھا۔ اپنی باجی کے بارے میں وہ بہت باتیں کرتا تھا، اتنی اس نے کبھی اپنے والد کے بارے میں گفتگو نہیں کی تھی۔ منال نے گھر کی طرف دیکھا وہ خوب صورت تھا لیکن اس کے اندر

رہنے والے شخص سے کم۔ چوکیدار نے ان سب کو اندر جانے دیا وہ ارسلان کو جانتا تھا۔ ارسل سامنے دروازے سے باہر نکلا۔ اس نے ان سب میں سب سے پہلے مناہل کو دیکھا تھا۔ اس کی حیرت میں بھی خوشی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا وہ بھی ساتھ آرہی ہے۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہ اسے وہاں دیکھ کر خوش ہے' ان لوگوں کے ساتھ آئی گھنگھریالے بالوں والی لڑکی نے مڑ کر مناہل کو سر سے پیر تک دیکھا تھا۔ بھلا اس میں ایسا کیا تھا کہ سامنے کھڑا شخص اتنے دنوں بعد مسکرایا تھا۔

"مجھے نہیں پتا تھا تم بھی آرہی ہو۔" وہ ان سب کو سلام کر کے مناہل کے پاس آیا پھر اس کے ساتھ اندر بڑھ گیا۔

"تم اتنے دنوں سے آف لائن تھے۔ بتایا بھی نہیں کہ انکل کی طبیعت خراب ہے" وہ اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ اس کی شرٹ سلوٹوں سے پر تھی۔ بال الجھے ہوئے۔ آنکھیں لال۔

"بس۔" وہ خاموشی سے چلنے لگا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" مناہل کے سوال کا اس نے جواب نہیں دیا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہوئے وہ رکا۔ مناہل اس کے ساتھ رکی' وہ چند سیکنڈ دروازے کے پاس ساکت کھڑا رہا۔ ایسے جیسے کوئی بت۔' اس کے آواز دینے پر بھی وہ سامنے دیکھتا رہا' مناہل نے آگے دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا' سارے لوگ شاید انکل کے کمرے میں چلے گئے تھے۔ آگے کمرہ تھا جہاں صوفے رکھے تھے اور وہ خالی تھا۔

"ارسل؟" اس نے اسے پکارتے ہوئے کہنی سے ہلایا۔

"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" وہ آہستگی سے بولتا آگے بڑھ گیا۔ اب کی بار مناہل برف کا مجسمہ بنی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا وہ کیا کرے۔ وہ اکیلی دروازے میں کھڑی رہی جب آگے سے ایک بوڑھی خاتون ایک کمرے سے نکلیں۔

"بیٹے آپ کیوں ایسے کھڑی ہو۔ آجاؤ اندر۔"

وہ اسے بلا رہی تھیں مناہل بامشکل چلتے لگی چل ہوئی۔ اگر وہ اسے اکیلا چھوڑ کے نہ جاتا تو وہ کہہ سکتی تھی کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ لیکن۔

وہ خاتون اسے کمرے میں لے گئی تھیں۔ بیڈ کی سائیڈ پر ایک نحیف وجود لیٹا تھا۔ وہ سب وہاں کھڑے ان سے حال احوال پوچھ رہے تھے وہ خاتون بتانے لگیں کہ یہ بچی باہر کھڑی تھی۔ مناہل نے ارسل کو دیکھا۔ وہ ارسلان سے بات کر رہا تھا۔ اس کے والد اس سے محبت سے ملے سر پر ہاتھ پھیرا۔ جب وہ سیدھی ہوئی تو ارسل سے اس کی نظریں ملی تھیں۔ اس کے چہرے پر صرف اذیت تھی۔ مناہل نے پریشانی سے اسے دیکھا۔ وہ یقیناً ٹھیک نہیں تھا۔

اس کے بعد وہ خاتون ان لڑکیوں کو باہر لے گئیں۔

"انکل اب کافی بہتر لگ رہے ہیں۔" وہ گھنگھریالے بالوں والی لڑکی کہہ رہی تھی۔

"جب دو دن پہلے ملی تھی تو کافی ویک لگ رہے تھے۔ اب اللہ کا شکر ہے۔" مناہل اور نیہا نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"تمہیں نہیں پتا تھا کہ انکل کی طبیعت خراب ہے اور یہ میڈم سو دفعہ مل بھی چکی ہیں" نیہا نے اس کے کان میں کہا۔ مناہل نے پیچھے بند دروازے کو مڑ کے دیکھا تھا جہاں ارسل تھا۔

"یہ اس کی پرانی کلاس فیلو ہے۔" مناہل کو اس سے اچھی نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

"پر مناہل نور نہیں ہے۔" نیہا کے کہنے پر اس نے دوبارہ پیچھے دیکھا وہ باہر نہیں آیا تھا۔

"یہ تو یہاں ایسے چل رہی ہے جیسے اس کا گھر ہو۔" نیہا نے جل کر مناہل کے کان میں کہا۔ وہ گھنگھریالے بالوں والی لڑکی پتا نہیں اس کا نام کیا تھا وہ پورے اعتماد سے چلتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔

"آنٹی ہمیشہ یہیں بٹھاتی ہیں۔" ٹی وی لاؤنج سے نکل کر اوپن کچن تھا جس کے سامنے ٹیبل اور

کرسیاں پڑی تھیں۔
"ہاں یہ ہماری بٹیا کی فیورٹ جگہ تھی۔اس لیے جب بھی اس گھر میں بیٹھی دیکھتی ہوں تو میرا دل کرتا ہے وہ یہی بیٹھے۔اس لیے آپ لوگوں کو بھی یہاں لے آئی ہوں۔" وہ خاتون ان کی بہت پرانی ملازمہ تھیں جواب گھر کے فرد کی حیثیت رکھتی تھیں۔
"اب دیکھو۔میں یہاں سے آپ لوگوں کو باتیں کرتے دیکھ کر خوش ہوتی رہوں گی اس کے ساتھ، ساتھ کام بھی ہو جائے گا۔" انہوں نے کہنے کے ساتھ فریج سے چیزیں نکالنا شروع کیں۔
" لگتا ہے، آپ یہاں کافی دفعہ آئی ہیں۔" نیہا نے اس لڑکی کو کہا۔
"ہاں۔مہینے سے انکل کی طبیعت خراب تھی تو ہم سب کا کافی آنا جانا ہوا ہے۔" وہ گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔مناہل نے اس کی طرف دیکھا۔ایک مہینہ۔
"حیرت ہے،مناہل کو نہیں پتا تھا۔" اس نے پاس بیٹھی مناہل کو طنزیہ دیکھ کر کہا۔وہ اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔وہاں بیٹھ کے دل جلانے سے اچھا تھا وہ کام کرتی آنٹی کی مدد کروا دیتی۔آنٹی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ان کے ساتھ ایک دو باتیں کر کے وہ خاموشی سے کباب فرائی کرنے لگی۔نیہا اور وہ لڑکی اسے کچن میں کام کرتے دیکھ کر باہر چلی گئیں۔کچن کی کھڑکی میں سے وہ دونوں گارڈن میں کرسی پر بیٹھی نظر آرہی تھیں۔
"ہماری بٹیا رانیہ بھی آپ کے جیسی تھیں۔مجال ہے کبھی مجھے اکیلے کام کرنے دیا ہو۔ڈاکٹری کی مشکل پڑھائی ہونے کے باوجود اس نے ہمیشہ میرا ہاتھ بٹایا۔" مناہل سر ہلاتے ہوئے بے دھیانی میں ان کی باتیں سننے لگی۔
"بڑی بی بی کی وفات کے بعد ماں بن کے پالا انہوں نے ارسل بیٹے کو بھائی صاحب نے تو بڑی بی بی کے مرنے کا ایسا غم لیا کہ دوسری شادی کی نہ بچوں کی پرواہ۔بس دونوں بہن بھائی تھے ایک دوسرے

کے لیے سب کچھ۔ہاہ!" انہوں نے سرد آہ بھری۔
"وہ اب کدھر ہوتی ہیں؟" مناہل کے سوال پر آنٹی خاموش ہوگئی تھیں۔مناہل نے انہیں دیکھا وہ دوپٹے سے آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔
"فوت ہوگئی۔ہاہ۔جوانی میں......اتنی جوانی میں کون اس دنیا سے جاتا ہے......کون؟ کیسی بے انصاف ہے یہ دنیا۔" انہوں نے سسکی لی۔کچن میں خاموشی چھاگئی۔
"بیٹی! یہ جل جائیں گے۔" انہوں نے اس کی توجہ کبابوں کی طرف دلوائی،مناہل نے سن ہوتے دماغ سے کباب پلیٹ میں نکالے۔اس نے بند دروازے کی طرف دیکھا۔اس نے کتنی دفعہ ارسل سے پوچھا تھا کہ باجی کدھر ہوتی ہیں،وہ ہمیشہ اس ذکر کو ٹال جاتا۔
" کیسے ڈیتھ ہوئی ان کی؟" مناہل نے آنٹی کے ہاتھ سے کپ لیے اور چولہے کی طرف بڑھی۔
"نروس بریک ڈاؤن۔" مناہل کے ہاتھ سے کپ گرتے،گرتے بچا۔وہ آنکھوں پر دوپٹہ رکھے بتا رہی تھیں۔
"آج تک اس گھر میں بھی اس صبح کا ذکر نہیں ہوا۔" وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ رہی تھیں۔
" کیسی خوفناک صبح تھی وہ۔اللہ کسی کے گھر میں وہ سورج طلوع نہ کرے۔اللہ کسی کے والدین کو اس عذاب سے نہ گزارے۔اللہ غارت کرے اس انسان کو جس نے ہماری بٹیا کی زندگی تباہ کردی۔" مناہل نے مجسمہ بنے ان کی طرف دیکھا۔وہ ہاتھ دعا میں اٹھائے بول رہی تھیں۔
" کیا ہوا تھا۔؟" اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ ہوئی۔
"ڈاکٹری کے آخری سال کے پرچے دے کر فارغ ہوئی تھی تو اس کے لیے اچھا رشتہ آیا۔ملک صاحب نے ہاں کر دی۔نکاح سے پہلے رات کو پتا نہیں کیا ہوا لوگ کہتے ہیں خودکشی کرلی۔ارسل بیٹے نے کتنی دفعہ ملک صاحب کو کہا تھا کہ باجی ٹھیک نہیں

لگتیں۔ وہ پورا دن بٹیا کے ارد گرد پھرتا۔ پوچھتا رہا اس سے۔ بات کرنے کے لیے مجبور کرتا رہا مگر وہ خاموش رہی۔ ٹالتی رہی اسے۔" ان کی آواز کانپی۔

"نکاح والے دن فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ میں بھی سو رہی تھی۔ جب ارسل بیٹے کے چیخنے کی آوازیں آئیں۔ ایسی آوازیں۔ اللہ کسی گھر کو نصیب نہ کرے۔ ہم سب بھاگے باہر آئے تو وہ۔"

منال نے چولہا بند کیا اور ان کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ کانپ رہی تھیں۔ منال نے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے۔ اس کے اپنے آنسو بہہ رہے تھے۔

ارسل روتا، چیختا۔ اپنی بہن کو اٹھا رہا تھا۔" کافی دیر خاموشی میں بس رونے کی آواز آتی رہی۔

ملک صاحب کو تو ہسپتال لے کے جانا پڑا۔ پہلا دل کا دورہ پڑا تھا انہیں۔ وہ دن اور آج کا دن۔ ملک صاحب ٹھیک نہیں ہوئے...... ارسل نے بڑا برا وقت دیکھا ہے۔ لوگوں کی باتیں، طعنے۔ اپنی بہن کی موت۔ اللہ کسی پر ایسا وقت نہ لائے۔ کسی کو اتنا نہ آزمائے۔"

وہ آنسو صاف کر رہی تھیں۔ منال نے تکلیف سے اس دروازے کو دیکھا جس کے پار وہ ہنستا، مسکراتا شخص تھا۔

"بعد میں پتا چلا تھا کہ کسی لڑکے نے دھوکا دیا تھا۔" پہلے شادی کے وعدے کرتا رہا پھر چھوڑ دیا منال کے ہاتھ لرزے۔

"اس کے ساتھ ہی پڑھتا تھا' ہماری بچی نے کبھی محبت نہیں وصول کی تھی۔ ماں پانچ سال کی عمر میں اس دنیا سے چلی گئی۔ باپ دنیا سے کٹ کے بیٹھ گیا۔ پیسے کی مشین بن گیا۔ بس رانیہ محبت دیتی رہی۔ بھائی کو، باپ کو، ارد گرد لوگوں کو۔ دو لفظ محبت کے بولے ہوں گے اس لڑکے نے۔ ہماری رانیہ کو مار دیا ان لفظوں نے۔ ارسل نے بڑا کہا، اپنے باوا سے کہ اس لڑکے کو ڈھونڈتے ہیں مگر مزید بدنامی کے ڈر سے ملک صاحب نے انکار کر دیا۔"

وہ اب آنسو صاف کرتی ہوئی اٹھ رہی تھیں۔

منال سن بیٹھی رہی۔ ڈاکٹری کا آخری سال، رانیہ اس کے کانوں میں آوازیں گونج رہی تھیں۔

"اللہ غارت کرے اس انسان کو۔" وہ بددعا دے رہی تھیں۔ منال کا دل لرزا۔

"آجاؤ بیٹے۔ یہ چائے نکال دو۔ ارسل کبھی کسی لڑکی کی بات نہیں کرتا لیکن آپ کا نام ایک دو دفعہ بیٹے سے سنا ہے میں نے۔ شاید اس لیے دل کا حال سنا دیا آپ کو۔" وہ مزید کچھ بتا رہی تھیں مگر اس کی ساری دلچسپی ختم ہو گئی تھی۔

کچھ غلط تھا یا شاید سب کچھ ہی غلط تھا۔ ہر جگہ آوازیں ہی آوازیں تھیں۔

"میں مر جاؤں گی۔ یہ نہ کرو......"

رانیہ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔

اس نے سر جھٹکا۔ چائے ڈال کر کپ ٹرے میں رکھنے لگی لیکن آوازوں کا، بددعاؤں کا شور اتنا تھا کہ چائے سے بھرا کپ اس کے ہاتھ سے زمین پر گر گیا۔ خاموشی میں کپ ٹوٹنے کی آواز بہت تیز سنائی دی تھی۔ نیہا اور وہ لڑکی کچن میں آئیں۔

"کیا ہوا۔ اوہ ہو۔" وہ دونوں پریشانی سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

"بیٹا! ہاتھ جلا لیا۔ کپڑے بھی خراب ہو گئے۔ ادھر آؤ۔" وہ اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کچن کے ساتھ والے کمرے میں لے گئیں۔

"رانیہ بٹیا کا کمرہ ہے یہ۔" کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے انہوں نے کہا۔ منال نے کمرے میں نگاہ دوڑائی پھر اس کی نگاہ پلٹنا بھول گئی تھی۔ اسی وقت باہر سے ارسل اور ارسلان کی آواز آئی تھی وہ پوچھ رہے تھے کیا ہوا ہے، یہ دونوں ایسے کیوں کھڑی ہیں۔ نیہا اسے بتا رہی تھی کہ منال اس روم میں ہے چائے گر گئی ہے۔ اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ارسل کمرے میں تھا۔ منال کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس کمرے میں

آنے کی۔ ہاں۔" وہ تیز کی تیزی سے اس کے پاس آیا اور اس کا بازو دبوچ کر بولا تھا۔
منال نے خوف سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اس کے آنے سے اس کی بہن کا کمرہ گندا ہو گیا ہو۔
"میں لے کر آئی ہوں۔ بیٹی کے کپڑے۔" آنٹی نے بتانے کی کوشش کی لیکن وہ ان کی بات کاٹ کر دھاڑا تھا۔
"میری بہن کے کمرے میں اسے کیوں لے کر آئی ہیں آپ......" وہ اتنا اونچا، اور بدتمیزی سے بولا تھا کہ باہر کھڑے سب لوگ کمرے کے دروازے کے باہر جمع ہو گئے۔ وہاں کھڑے ہر ایک شخص کو سکتہ ہو گیا تھا۔
"ارسل۔" منال نے اپنا بازو چھڑانا چاہا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔
"چلو یہاں سے۔" وہ اسے بازو سے پکڑے کمرے سے باہر لایا تھا۔ منال نے بے یقینی سے اس شخص کو دیکھا وہ سرخ چہرے کے ساتھ بازو سے پکڑے باہر لے کر جا رہا تھا۔ ارسلان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔
"کیا ہو گیا ہے یار!" وہ اسے کندھے سے ہلا رہا تھا۔
منال نے اپنا بازو چھڑایا۔ سب کی نظریں ان دونوں پر جمی تھیں۔ شرمندگی، افسوس، تمسخر، اذیت کیا نہیں تھا جو اسے محسوس ہوا۔ اس نے ارسل کی طرف دیکھا، وہ صوفے کی طرف رخ کیے کھڑے بیٹھا رہا تھا۔ ٹیبل سے اپنا فون اور بیگ اٹھا کر کسی کی طرف دیکھے بغیر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے صرف خاموشی تھی اور آگے اندھیرا۔ اسے نہیں پتا وہ اس گھر سے کیسے باہر نکلی تھی۔ گیٹ سے باہر نکلنے کے بعد اس نے صرف ایک دفعہ مڑ کر دیکھا تھا۔ ایک یقین تھا کہ وہ آئے گا۔ کہے گا۔ سوری۔ اسے واپس لے کر جائے گا۔ لیکن نہیں وہ کہیں نہیں تھا۔ کب سے رکے آنسو اب رواں تھے۔ اسے یہ بھی نہیں پتا تھا، وہ کدھر جا رہی ہے بس وہ چل رہی تھی۔
"منال!" پیچھے سے نیہا کے پکارے اور قدموں کی آواز آئی۔ وہ آنسو صاف کرتی چلتی رہی۔
"یار! ٹھیک ہو۔ یقین نہیں آ رہا یہ ارسل تھا۔ اف خدایا۔" وہ رکشا روکتی مسلسل غصے سے بول رہی تھی۔ منال نے اپنے آپ کو ٹٹولا۔ اندر کچھ نہیں تھا۔ بس ایک خاموشی تھی ویران خاموشی۔
نیہا سارے رستے بولتی آئی تھی وہ خاموش رہی بولنے کے لیے کیا تھا؟ یونیورسٹی آ کر وہ ہاسٹل جانے کے بجائے باہر بیٹھی رہی۔ وہ چلنے کی کوشش کرتی تو لازمی گر جاتی۔ فون بجنا شروع ہوا۔ اور بج کے خاموش ہو گیا یقیناً نیہا نے ثروت کو بتا دیا تھا اور وہ فون کر رہی تھی۔
منال بیٹھی رہی، ذہن کو سوچنے کے لیے وقت درکار تھا۔
وہ کمرے میں آئی تو ثروت اپنے بیڈ پر بیٹھی تھی۔
"تم کب آئیں؟" منال نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ ٹیبل پر سامان رکھا اور بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگی۔
"صبح کے وقت۔" ثروت نے اسے دیکھتے ہوئے کہا جو سر جھکائے جوتے اتار رہی تھی۔
"نیہا نے مجھے کچھ۔" منال نے اس کی بات کاٹی۔
"ابھی میرے اندر ہمت نہیں ہے۔ رات کو بات کرتے ہیں۔" وہ اپنے بستر پر لیٹ گئی۔
"کپڑے بدل لو۔" وہ یونیورسٹی کے کپڑے کبھی ہاسٹل میں نہیں پہنتی تھی اور آج تو باہر سے ہو کر آئی تھی۔
"ہمت نہیں ہے" یہ کہنے کے ساتھ اس نے کروٹ بدل لی تھی۔ ثروت کتنی دیر اسے دیکھتی رہی تھی۔

☆☆☆

"کچھ باتیں کتنی عجیب ہوتی ہیں نا۔ یقین نہیں

آ تا ان پر یا یقین تو ہوتا ہے ہمیں بس دل نہیں مانتا۔" رات کا جانے کون سا پہر تھا جب ثروت نے منائل کی آواز سنی۔ کمرے میں اندھیرا تھا صرف ثروت کا ٹیبل لیمپ جل رہا تھا۔ ثروت نے لیپ ٹاپ بند کر کے ایک طرف رکھ دیا۔

"تم نے ارسل کا منہ کیوں نہیں توڑا؟" منائل اس کی بات پر ہلکے سے ہنسی۔

"وہ تم پر چیخا۔ تم پر۔ ہاہ۔ تم نے اس کے سر پر کوئی چیز کیوں نہیں دے ماری؟" اس نے بیڈ سے پیر لٹکا کر منائل کی طرف رخ کیا۔ وہ چت لیٹی چھت کو دیکھ رہی تھی۔

"ہم کتنی دفعہ اچھی باتیں سوچتے ہیں نا ثروت! وہ کبھی رونما نہیں ہوتیں۔ سارے برے خیالات کا ہونا پورا لازم کیوں ہے؟" ثروت نے چت لیٹی منائل کی طرف دیکھا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟ اس واقعے سے زیادہ کوئی اور چیز پریشان کر رہی ہے۔" وہ رک رک کر بولی۔

"ارسل کی بہن نے پانچ سال پہلے خودکشی کی تھی۔"

"ہاہ" ثروت نے بے یقینی سے منہ پر ہاتھ رکھا۔

"اس کا نام رانیہ تھا۔ وہ ایم بی بی ایس کے آخری سال میں تھی۔ اور۔"

"اور؟" ثروت نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"اور وہ ہادی بھائی کے میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی۔" منائل نے آنکھیں بند کر کے اس کمرے میں لگی تصویر کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ کمرے کی دیوار پر ایک بڑی تصویر آویزاں تھی جس میں ایک لڑکی میڈیکل کالج کی بلڈنگ کے پاس سفید کوٹ پہنے کھڑی تھی۔

"اس میں کیا ہے منائل! ہزاروں لوگ بھائی کے کالج میں پڑھتے ہیں۔"

"اس کا نام رانیہ تھا۔" اس نے دہرایا۔

"ہزاروں لوگوں کا نام رانیہ ہوتا ہے۔"

"تمہیں لگتا ہے یہ سب اتفاق ہے؟ پھر مجھے ایسا کیوں محسوس نہیں ہو رہا۔" منائل نے اس کی طرف رخ کر کے کہا۔

"مجھے کیوں خوف محسوس ہو رہا ہے؟" کب سے رکے آنسو اس کے گالوں پر بہہ گئے۔

"بھائی کو فون کر کے پوچھ لیتے ہیں۔" ثروت اس کے بیڈ کے پاس زمین پر بیٹھ گئی۔

"نہیں۔"

اگر یہ باتیں سچ نکلیں تو سانس لینا بہت مشکل ہو جائے گا۔" ثروت نے اس کا ہاتھ دبایا۔

"جب میں اس کے گھر گئی تو وہ خوش تھا۔ پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا۔ میرے لیے اسے پہچاننا مشکل ہو گیا۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"میں اس سے بات کروں گی۔ ہو سکتا ہے، وہ بہت پریشان ہو، اس لیے ایسا۔"

"پریشان ہو تب بھی۔ تب بھی اس کا ردعمل کسی صورت قابل قبول نہیں ہے منائل! اس نے تمہیں ایک سوری کا میسج بھی نہیں کیا۔" ثروت نے اس کی بات کاٹی۔

"اس نے ایسا پہلے کبھی نہیں کیا۔ کبھی وہ اونچی آواز میں بھی نہیں بولا۔ ایک دفعہ معاف کرنے میں کیا جاتا ہے۔" ثروت نے سر اٹھا کر منائل کو دیکھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھتی غائب دماغی سے بول رہی تھی۔ دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔

"ہاں۔ لاسٹ پیپر والے دن تم ارسل سے ملی تھیں؟ بات کی تھی اس سے؟" ثروت نے زمین سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ اس دن سے وہ آف لائن تھا۔"

"کیا مطلب؟ میں اس سے ملی تھی گھر جانے سے پہلے۔ وہ یونیورسٹی گیٹ پر ملا تھا مجھے۔" ثروت نے ناسمجھی سے اس کی طرف دیکھا۔

ثروت گیٹ پر چچا کا انتظار کر رہی تھی جب اس نے ارسل کو آتے دیکھا۔

"السلام علیکم۔ کیا حال ہے آپ کا؟" اس کے پاس آ کر اس نے سلام کیا پھر اس کے سامان کو دیکھا پھر کہا۔

"گھر؟ نور بھی جا رہی ہے؟"

"نہیں وہ ہاسٹل ہی میں ہے" ثروت نے گھڑی دیکھی۔ چچا کے آنے میں وقت تھا ابھی۔

"او شکر ہے۔ اس نے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی تھی۔ تو میں نے سوچا، مل لوں۔ اور آپ خیریت سے گھر جا رہی ہیں؟"

اس کے پوچھنے پر ثروت نے اپنی امی کے بارے میں بتایا۔ وہ پریشانی سے سر ہلاتا سنتا گیا۔ پھر جب وہ جانے کے لیے مڑنے لگا۔ ثروت نے کچھ سوچ کر اسے آواز دی۔

"آپ کے پاس تھوڑا وقت ہے تو مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔" ارسل نے کیوں نہیں کہتے ہوئے اسے ہاتھ سے آگے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں سامنے بینچ پر بیٹھ گئے۔

مجھے نہیں پتا، منال آپ سے یہ بات کرے گی یا نہیں۔ ایک تو اسے اپنے اندر باتیں رکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔" وہ ہلکے سے مسکرایا۔

"آپ بتا دیں۔"

"دراصل گھر میں منال کے رشتے کی بات چل رہی ہے۔ اس کے بھائی کو ایک لڑکا پسند آیا ہے اور ہادی بھائی کو اگر لڑکا پسند آ گیا ہے تو وہ رشتہ کروا کے چھوڑیں گے۔ اس لیے آپ گھر رشتہ بھیج دیں۔ یہ کہنا تو فضول ہے کہ اگر آپ دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ یہ بات یہاں اڑتے پرندوں کو بھی پتا ہے کہ آپ اسے پسند کرتے ہیں۔"

چچا کا فون آنا شروع ہو گیا تھا اس نے جلدی جلدی بات پوری کی۔ ارسل چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا ایک جا رہا تھا۔

"آپ کب تک بھیجیں گے؟" ثروت نے خاموش بیٹھے انسان کو دیکھ کر کہا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔

"بہت جلد۔" آخر وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔ ثروت کو حوصلہ ہوا۔

"اس نے مجھ سے کہا وہ جلد بھیجے گا۔ اس کی بات میں کوئی جھوٹ کی آمیزش نہیں تھی۔ پھر اب یہ جو ہو رہا ہے یہ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔" ثروت نے ٹھنڈی آہ بھری۔

"وہ مجھ سے اس دن نہیں ملا تھا نہ ہی آج اس بارے میں کوئی بات کی۔ اگر یہ رانیہ وہی رانیہ ہے ثروت۔" منال نے خوف سے اس کی طرف دیکھا۔

"یار! تم فضول میں پریشان ہو رہی ہو۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" ثروت کہہ رہی تھی لیکن اس کی آواز میں بھی پریشانی تھی۔

"ہاں، ایسا نہیں ہو سکتا۔" اس نے دہرایا۔

"میں اس سے ملوں گی۔ ہاں میں اس سے بات کروں گی۔ اس سے اس کے رویے کی وجہ پوچھوں گی۔" اس نے عزم سے کہا' ثروت نے ہاں میں سر ہلایا۔

"چچی کیسی ہیں؟" کچھ دیر بعد منال نے اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہیں۔ امی ٹھیک ہیں۔ اسفند بیمار تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"اسفند بیمار تھا۔ امی اس کی وجہ سے بستر پر تھیں۔ ڈرگز استعمال کیے تھے، اس نے زیادہ مقدار میں۔" ثروت بستر پر انگلی سے پھول بناتی آہستگی سے بتا رہی تھی۔

"مجھے اس کی محبت، محبت نہیں لگتی۔ جنون لگتا ہے بس اسے وہ لڑکی چاہیے۔ چاہیے تو چاہیے۔ جیسے کھلونا ہو۔ اگر اس کی محبت میں سب جائز ہے تو یہ محبت نہیں ہے صرف جنون ہے۔" اس نے گہرا سانس لیا۔ پھر تھکی تھکی آواز میں بولی۔

"میں نے رشتے کے لیے ہاں کر دی۔"

مناہل نے بے یقینی سے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔
"کیا۔ کیوں ثروت؟"
"میں عمر سے ملی ہوں، میں نے اسے خود فون کیا کہ مجھے اس سے ملنا ہے اور میں اس سے ملی۔ وہ اپنی بہن کی طرح نہیں تھا، میچور تھا سمجھ دار، تمیز سے بات کرنے والا اگر شادی جوا ہے تو چلو اس کے ساتھ ہی آزما کے دیکھ لیتے ہیں۔" وہ زخمی سا مسکرائی۔
"گھر والوں کی اس گردان سے میں تنگ ہوں کہ بتاؤ تمہیں کون پسند ہے۔ ان کا شک سے دیکھنا کہ لازمی اس کا چکر ہے کسی کے ساتھ۔ مجھے کوئی پسند نہیں ہے لیکن ان کی یہ بات، ان کا شک میری برداشت سے باہر ہے۔ شک آپ کو اندر سے ختم کر دیتا ہے مناہل اور والدین کا شک کی نگاہ سے دیکھنا سب سے زیادہ اذیت ناک ہوتا ہے۔" اس کی آواز رندھی تھی۔
"عمر سے ملنے کے بعد میں نے ہاں کر دی۔ دل کی رضامندی سے۔ میں اس رشتے پر گھر والوں کو الزام نہیں دوں گی جب تک آپ دوسرے کو قصوروار سمجھتے ہو، اپنی آج کی حالت کا۔ آپ آگے بڑھ سکتے ہو نہ خوش رہ سکتے ہو۔" وہ بستر سے اٹھ گئی۔
"تم خوش نہیں ہو۔" مناہل نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔ ابھی نہیں ہوں۔ آگے ہو جاؤں گی۔" وہ ہولے سے مسکرائی۔ باقی ساری رات وہ دونوں اپنے بستر پر لیٹی جاگتی رہی تھیں۔

☆☆☆

اگلا سارا ہفتہ ان دونوں کو سر کھجانے کا وقت بھی نہیں ملا۔ تمیس کو تھیسس کی ڈیڈ لائن تھی۔ اسی دوران ارسل کا اتنے دنوں بعد میسج آیا کہ وہ ملنا چاہتا ہے۔ مناہل کتنی دیر فون پکڑے بیٹھی رہی تھی۔ ہفتے بعد اس شخص نے میسج کیا تھا آخرکار۔
"تو تمہیں احساس ہو گیا؟ ہفتے بعد۔" مناہل نے اسے لکھا تھا۔
"ہاں۔ اچھی طرح۔" اس کے جواب پر وہ فون کو دیکھتی رہی۔
"اگلے ہفتے لنچ پر ہمارے بیچ کے بھی کچھ لوگ مدعو ہیں، میں ارسلان سے کہوں گا وہ لے آئے گا تم دونوں کو۔" اس کا دوبارہ میسج آیا۔ فیرویل سے پہلے طلبا نے ایک چھوٹا سا لنچ رکھا تھا۔
"تمہارے تھیسس کی تمیں ڈیڈ لائن ہے ابھی اس پر کام کرو۔ پھر ملتے ہیں" وہ اس کے ہر کام سے باخبر تھا۔ مناہل نے اسے جواب نہیں دیا بس بیٹھی رہی۔ وہ سمجھتی تھی اس کی تیز چھٹی حس نعمت ہے اور ڈر ہمیشہ تب لگتا ہے جب نعمت زحمت بن جائے۔

☆☆☆

سارے خیالات کو جھٹکتے ہوئے وہ دل لگا کر تیار ہوئی تھی، اپنے آپ کو یہ بات سو دفعہ کہتے ہوئے کہ ضروری تو نہیں اس کی چھٹی حس سے بجتے خطرے کے بگل ہمیشہ ٹھیک ہی ہوں۔
اس نے آف وائٹ رنگ کی ٹخنوں سے اوپر آتی فراک پہنی تھی۔ جس کے بارڈر اور بازوؤں پر ہرے اور لال رنگ کی کڑھائی تھی۔ نیچے چوڑی دار پاجامہ تھا۔ اس کے ساتھ لال رنگ کا دوپٹہ۔ کندھوں تک آتے بال درمیان سے مانگ نکال کر کھلے چھوڑ دیے تھے۔ ہلکا سا میک اپ کرنے کے بعد شیشہ اسے بتا تا تھا کہ وہ جاذب نظر لگ رہی ہے۔
وہ دونوں ہوٹل پہنچیں تو ارسل سامنے کھڑا تھا۔ اسکن رنگ کی ڈریس شرٹ پہنے، بال ماتھے پر گرائے۔ وہ دور سے بھی ہر ایک میں نمایاں تھا۔ اس نے انہیں دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور شاید مسکرایا بھی تھا۔ ان کے قریب آنے تک وہ اسے دیکھتا رہا تھا پھر ثروت سے اس کی امی کی طبیعت کا پوچھا۔ اس کے بعد وہ مناہل کی طرف مڑا۔
"کیسی ہو؟" مناہل نے سر ہلایا۔
"تم کیسے ہو؟"
"ٹھیک۔" ان کے درمیان اس طرح سے گفتگو کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے سے اجتناب کر رہے تھے۔ کیوں؟ یہ مناہل کو

نہیں پتا تھا۔

"چلو اندر چلتے ہیں۔" ثروت اندر چلی گئی تھی اب باہر صرف وہ دونوں کھڑے تھے۔ اس نے قدم بڑھائے پر منائل وہیں کھڑی رہی۔

"تمہیں اس دن کے بارے میں کچھ نہیں کہنا؟" ارسل گہرا سانس لے کے مڑا۔

"رات گئی، بات گئی والا سین نہیں چل سکتا یہاں؟" وہ ہوٹل کی بلڈنگ کو دیکھتا کہہ رہا تھا۔

"نہیں۔" منائل یہ کہتی آگے بڑھ گئی۔

اندر سب لوگ آ چکے تھے۔ ٹیبلز ملا کر لگائی گئی تھیں۔ وہ ثروت کے ساتھ بیٹھ گئی۔

"تم نے اس سے بات کی ہے؟" ثروت کا سب سے پہلا سوال یہی تھا۔

"نہیں۔" ثروت نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔" اتنی دیر میں ارسل اندر آیا تھا۔ سب لوگ اپنی کرسیوں پر بیٹھ رہے تھے۔ ارسل منائل کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔" اس نے اپنی ساری انا بالائے طاق رکھتے ہوئے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ارسل جواب دینے کے بجائے اسے دیکھتا رہا۔ پلک جھپکے بنا۔ اس کی آنکھیں لال تھیں۔ منائل نے پریشانی میں کہنی سے اس کی شرٹ ہلائی۔

"ارسل! مجھے تم سے بات کرنی ہے۔ کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہے نا؟ تم ٹھیک ہو نا؟" اس کا دیکھنا منائل کو پریشان کر رہا تھا۔

"مجھے تم سے بات۔" ارسل نے اس کی بات کاٹی۔

"مجھے بھی تم سے بات کرنی ہے۔" وہ یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا تھا۔ منائل کے ساتھ ثروت نے بھی حیرانی سے اسے دیکھا۔

"بلکہ مجھے آپ سب سے بات کرنی ہے۔"

ارسل نے آہستہ آواز میں کہا سب لوگ اپنی کرسیوں پر بیٹھے تھے اس کے اٹھنے پر خاموشی چھا گئی۔

"آپ سب کے لیے میرے پاس ایک خوشی کی خبر ہے۔" اس نے ایک نظر منائل کو دیکھا اور دوسری نظر لوگوں پر ڈالی۔ پھر اپنے ساتھ بیٹھی گھنگھریالے بالوں والی لڑکی کا ہاتھ پکڑ کے کھڑا کیا تھا۔ سارا کمرہ خاموش ہو گیا۔

"وہ اس کا ہاتھ اوپر اٹھائے کہہ رہا تھا۔ لڑکی نے اپنے ہاتھ کی انگوٹھی "وی آر انگیجڈ" سب کو گھوم کر دکھائی لیکن وہاں بیٹھے ہر شخص کی نظر منائل کی طرف تھی۔

وہ سپاٹ چہرہ اوپر اٹھائے ارسل کو دیکھ رہی تھی۔ لڑکی نے جملہ دوبارہ دہرایا۔ اس بار کسی نے ایک تالی بجائی تھی پھر آہستہ آہستہ تالیاں بجنے لگیں، مبارک باد کا شور، تالیاں مل کر بھی اس کمرے کی ویرانی کو ختم نہیں کر پائی تھیں۔ ان سب مبارک بادوں کے درمیان منائل اور ارسل کا گروپ گم صم بیٹھا تھا۔ مبارک باد وصول کرنے کے بعد ارسل باہر نکل گیا تو منائل کا سکتہ ٹوٹا۔

"میں بات۔" ثروت کی بات مکمل ہونے سے پہلے منائل کرسی سے اٹھی تھی۔ ہر کسی نے اپنی بات چھوڑ کر کمرے سے جاتی سر اٹھا کر چلتی لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سامنے لفٹ کا انتظار کر رہا تھا یا پھر اس کا جو اس کے ساتھ آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ دونوں سامنے دیکھتے رہے۔ لفٹ کے کھلنے پر وہ اس سے پہلے اندر گئی تھی۔

"یہ مذاق تھا نا؟" تھوک نگلتے اس نے آخری امید سے اس شخص کو دیکھا۔

"مذاق؟" اس نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔ لفٹ رک گئی تھی۔ وہ باہر نکل کر ایک طرف جا رہا تھا منائل اس کے پیچھے چلنے لگی۔

"پھر یہ کیا تھا؟" وہ رک گیا۔

"کیا تھا۔ میری منگنی ہو گئی ہے۔ اگلے ماہ شادی ہے۔ مبارک باد نہیں دو گی؟"

وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اس کی طرف جھکا کہہ رہا تھا۔ آس پاس کی ہر ایک چیز سفید ہوئی۔ سامنے کھڑی لڑکی کے چہرے کی طرح۔ دور سے دیکھو تو اس کے چہرے اور کپڑوں کے رنگ میں فرق کرنا مشکل تھا۔ وہ سرخ آنکھوں سے بت بنی لڑکی کو دیکھتا رہا۔

"اب تم کہو گی، میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟" وہ اس سے دو قدم دور ہو کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر بولا۔

اب تم کہو گی۔ میں نے تمہیں دھوکا دیا۔" اس کی طرف استہزاء سے دیکھتا وہ ہنسا۔

"یا تم کہو گی۔ میں نے جو تم سے کبھی وعدے نہیں کیے، وہ کدھر گئے؟ بھلا وہ اظہار محبت کہاں گیا؟" وہ اپنے بالوں میں ہاتھ چلاتا کھوکھلا قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ وہ چپ چاپ اسے بولتے دیکھتی رہی۔ اس انسان کے پیچھے شیشوں سے بنی اونچی عمارت تھی اسے محسوس ہوا۔ وہ اس پر گر رہی ہے۔ آہستہ، آہستہ، آہستہ۔

"بھلا کوئی وعدہ کیا تھا تم سے میں نے۔ جس کا حساب لینے آئی ہو۔" وہ کھلی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"بولو بھی۔ کبھی کیا تھا کوئی اظہار محبت؟ پھر کون سا حساب اور کون سی سزا؟" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ بھلا کون سی سزا تھی جو اس پر عائد ہوئی تھی؟

"تمہیں کیا لگا تھا میں تم سے۔" شہادت کی انگلی اس کی طرف اٹھائے وہ اسے دیکھ کر بولا۔

"میں مطلب۔ میں محمد ارسل تم سے شادی کروں گا؟" گہرا سانس لے کر وہ زبردستی ہنسا تھا۔

"وہ تو یار! صرف ٹائم پاس تھا؟ تم کچھ اور تو نہیں سمجھ بیٹھیں؟" پاس کھڑی منال اور دور کھڑی ثروت دونوں بتا سکتی تھیں کہ سامنے کھڑا زہر اگلتا شخص جھوٹ بول رہا ہے۔

منال نے آنکھیں بند کر کے، سر جھکا کر اس رات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ کوشش بے کار تھی۔ وہ رات اسے کھلی آنکھوں سے بھی ازبر تھی۔ یہ الفاظ۔ یہ اس کے بھائی کے منہ سے نکلے الفاظ کتنی دفعہ اسے ہولاتے رہے تھے۔ وہ جھکے سر کے ساتھ اذیت سے ہنسی۔

"کورٹ میرج کا آپشن بھی دے سکتی ہو مجھے۔" وہ عمارت کی طرف رخ کیے بول رہا تھا۔

"رود، منتیں کرو۔ دو اللہ کے واسطے۔ یا کہیں سے کود جاؤ۔ لیکن میں محمد ارسل تم سے شادی کبھی نہیں کروں گا۔ تم۔ تم میں ہے ہی کیا منال نور؟" وہ پانچ سالوں میں پہلی دفعہ اس کے نام سے پکار رہا تھا۔

"تم سمجھتے ہو۔ تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا؟" چند سیکنڈ بعد منال کے کہنے پر وہ اس کی طرف مڑا تھا۔ ماتھے پر بل ڈال کر اسے دیکھا۔

"تم سمجھتے ہو۔ تم نے مجھ سے وعدے نہیں کیے۔ جھوٹے اظہار محبت نہیں کیے تو تم نے مجھے دھوکا نہیں دیا؟" وہ قدم آگے آیا۔

"تم اپنے آپ کو ہادی ابصار سے بہتر سمجھتے ہو۔ تم میں اور ان میں کوئی فرق ہے؟"

اس کے بڑھتے قدم رکے، وہ ساکت ہوا۔ دونوں آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے۔ سکتہ ٹوٹنے کے بعد اس نے اسے کندھوں سے پکڑا تھا۔

"دھوکا اسے کہتے ہیں جو تمہارے بھائی نے میری بہن کو دیا تھا۔" وہ اس کے کندھے ہلاتا سرخ آنکھوں کے ساتھ چبا، چبا کر بولا تھا۔

"ظلم اسے کہتے ہیں جو تمہارے بے غیرت بھائی نے میری بہن کے ساتھ کیا تھا" منال ایک قدم پیچھے ہٹی۔ وہ اس اونچی عمارت سے نیچے آ گری تھی۔

"میری بہن نے تمہارے ذلیل بھائی کی وجہ سے خودکشی کی تھی" وہ پورا زور لگا کر چیخا تھا۔ غصے میں پاس آتی ثروت کے قدم اس انکشاف پر زنجیر ہوئے۔

"تمہارے بھائی نے میری بہن کی جان لے

لی۔ تمہارے ذلیل بھائی نے میری بہن کو مار دیا میری بہن کو قتل کر دیا۔ ایسا قتل۔ ایسا قتل جس کی میں کہیں ایف آئی آر بھی درج نہیں کروا سکتا" اس کی طرف اشارہ کیے دھاڑا تھا۔ منائل تھوک نگلتے سید ھی کھڑی رہی۔ یہ طے تھا کہ وہ روئے گی نہ ہی سامنے کھڑے شخص کی منت کرے گی۔

"اور تم نے ہادی ابصار کی بہن کی جان لے لی۔ کیا حساب برابر ہوا؟" وہ گیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔

"میں نے۔" وہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں نے اپنے ان ہاتھوں سے اپنی بہن کی لاش اتاری تھی۔ دیکھ رہی ہو۔ ان۔ ان وہ اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ کیے کہہ رہا تھا۔

"اپنے ان کندھوں پر اپنی بہن کی میت کو اٹھایا ہے۔" وہ اپنے کندھوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔

"ان کانوں سے اپنی بہن کے بارے میں لوگوں سے برے القابات سنے ہیں۔" وہ اپنے کانوں کو ہاتھ لگا رہا تھا۔

"میری بہن۔ میرا اکلوتا رشتہ تھی۔ وہ میری سب کچھ تھی۔ تمہارے بھائی نے اسے مار دیا" وہ پنجوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا۔

"مجھے نفرت ہے اپنے آپ سے کہ میں نے ہادی ابصار کی بہن سے بات بھی کی۔ مجھے گھن آتی ہے اپنے آپ سے کہ میں نے ہادی ابصار کی بہن سے محبت کی۔ مجھے نفرت ہے اپنے آپ سے کہ اپنی بہن کے قاتل۔" وہ جھکے سر کے ساتھ گیلی آواز میں بول رہا تھا۔ پھر وہ کھڑا ہوا۔

"میری دل سے دعا ہے۔ تم مر جاؤ...... تمہارا بھائی بھی تمہارا جنازہ اٹھائے۔ اس کے کندھوں پر بھی وہ بوجھ آئے جو میں نے سہا۔ تمہارا خاندان بھی برباد ہو۔ جس طرح تمہارے بھائی نے میرا خاندان برباد کیا۔ میں چاہتا ہوں تم مر جاؤ۔"

منائل زرد چہرہ لیے پیچھے ہٹی۔ اتنا سننا کافی تھا۔ اتنا سننا باقی زندگی گزارنے کے لیے کافی تھا۔ اتنی اذیت کافی تھی۔ اس کی باتوں میں نور کہیں نہیں تھی۔ محبت کہیں نہیں تھی۔ وہ آنکھیں کہیں نہیں تھیں۔

"تم۔ تمہارا سارا گھر میری بہن کا قاتل ہے۔" وہ چلایا تھا۔ اس کے قدم رکے، یہ الزام نہیں تھا۔ ثروت اس کا ہاتھ پکڑے چلنے لگی۔

"میں چاہتا ہوں۔ تم مر جاؤ۔ مر جاؤ۔ مر جاؤ" وہ دوبارہ چلایا تھا۔ منائل سر اٹھائے چلتی رہی۔ کب سے رکے آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے...... اسے نہیں معلوم تھا، وہ کدھر جا رہی ہے۔ وہ ہاسٹل کیسے پہنچی۔ دماغ چلنا بند ہو گیا تھا۔ بس ایک آنسو تھے جو پوری رفتار سے بہہ رہے تھے۔

کمرے میں آ کر وہ بیڈ کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو ثروت۔" یہ آخری بات تھی جو اس نے سسکیوں کے درمیان ثروت سے کہی تھی۔

☆☆☆

ساری دوپہر اور شام وہ ایسے ہی زمین پر بیٹھی رہی سر جھکائے، اب وہ رو نہیں رہی تھی۔ ثروت نے اس کا کندھا ہلایا۔

"ہادی بھائی کا فون ہے۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ تم سو رہی ہو۔ لیکن وہ ضد کر رہے ہیں۔" ثروت نے اسے فون پکڑایا۔

"تمہارا فون کیوں بند ہے؟" بغیر سلام دعا کے وہ غصے سے بولا تھا۔

"پتا نہیں۔"

"کیا مطلب! پتا نہیں؟" ثروت نے اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کا سر دہاتھ دبایا۔

"گھر کب آنا ہے۔" اس کی خاموشی پر آگے سے سوال آیا۔

"جلد۔" منائل نے ثروت کو دیکھتے گہرا سانس لیا، اس کے بعد بھی آنسو آنکھوں سے رواں تھے۔

"میں کل لینے آ رہا ہوں۔ مصطفیٰ کے گھر والوں کو شادی کی جلدی ہے اس لیے۔" منائل نے اس کی بات کاٹی۔

"مجھے شادی نہیں کرنی۔" ثروت نے اس کے ہاتھ سے فون لینے کی کوشش کی۔

"کیوں؟" کمرے میں اتنی خاموشی تھی کہ ساتھ بیٹھی ثروت کو ہادی کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے منائل کی منت کی کہ نہیں کچھ نہ بولنا۔

"اس کمینے لڑکے کی وجہ سے۔" وہ دیوار کو دیکھتی رہی۔ ثروت نے بے چینی سے اس کی طرف دیکھا انہیں کیسے معلوم ہوا۔

"ہاں۔" اس کی ہاں پر ثروت نے اپنا سر پیٹ ڈالا۔ اس کی بہن اپنے ہوش میں نہیں تھی۔

"کہا تھا ابا سے میں نے۔ نا بھیجیں اسے اس یونیورسٹی میں۔ کہا تھا کون ہے وہ بے غیرت۔" آواز اتنی اونچی تھی کہ ثروت نے خوف سے اس کی طرف دیکھا جو سنگ کا مجسمہ بن گئی تھی۔

"دوسروں کی بہنوں کو خاک سمجھنے والوں کی اپنی بہنوں پر بات آتی ہے تو اتنی غیرت کیوں جاگتی ہے؟ اتنی آگ کیوں لگتی ہے؟" اس کی بات پر آگے سناٹا چھا گیا تھا۔

"کیا کہا؟"

"صرف آپ کی بہن کی عزت ہے؟" ثروت نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"کس نے دماغ خراب کیا ہے تمہارا؟" ہادی کی غصے سے کانپتی آواز آئی تھی۔

"اس نے جس کی بہن کا قتل کیا تھا آپ نے۔"

"کیا؟ کیا بکواس۔"

"رانیہ کو بھول گئے آپ...... اس کے بھائی کی منت کر کے آئی ہے آپ کی بہن۔ پر اس نے کہا وہ اپنی بہن کے قاتل کی بہن سے شادی نہیں کرے گا۔ اس نے کہا، میں تو تمہارے بھائی کی طرح ٹائم پاس کر رہا تھا۔ میں نے اس سے کہا تمہیں اللہ کا واسطہ۔" اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ ثروت نے اس کے ہاتھ سے فون چھین کر بند کیا۔

"میں نے اس سے کہا میرے ساتھ ایسے نہ کرو۔" وہ غیر مرئی نقطے پر دیکھتی بول رہی تھی۔

"وہ ٹھیک کہتا ہے۔ میں، اماں، ابا بھی اس کی بہن کے قاتل ہیں۔ وہ ٹھیک کہتا ہے۔ خاموشی بھی تو ظالم کا ساتھ دینا ہے نا۔" چہرے پر آنسو گر رہے تھے۔ اس نے لمبی سانس اندر کھینچی۔

"اس کا گھر ہم نے برباد کر دیا۔ ٹھیک کہتا ہے کتنا اذیت ناک ہوگا اپنی بہن کے قاتل کے ساتھ چار سال گزارنا۔ اس نے ٹھیک کیا۔"

اس کی سسکیاں کمرے میں گونج رہی تھیں ثروت نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑے۔

"منائل نور۔ ہم عورتیں ہیں۔ ہم بیٹیاں ہیں۔ ہم مائیں ہیں۔ ہم اپنی خود کی عزت ہیں۔ ہم اشرف المخلوق ہیں۔ وٹے سٹے میں بکنے والی چیزیں نہیں کہ ہمیں ماں، باپ، بہن، بھائی یا دنیا میں کسی بھی فرد کے بدلے کے طور پر استعمال کر لیا جائے۔ مار دیا جائے۔ دھوکے دیے جائیں۔ سن رہی ہو تم منائل! اس سب میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا۔ ہادی اپنے ہر کام کا جواب دہ خود ہے۔ تم نہیں ہو۔ ارسل کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا تمہارے ساتھ یہ کرنے کا۔" وہ اس کے ہاتھوں کو دباتے کہہ رہی تھی۔ منائل نے سانس اندر کھینچی۔

"میں نے صرف اس سے محبت کی تھی ثروت اور وہ۔ وہ مجھ سے کہتا ہے کہ وہ۔ چاہتا ہے میں مر جاؤں۔ میں۔" ثروت نے اس روتی لڑکی کو گلے سے لگایا۔ اس نے اس غلطی کا بدلہ بھگتا تھا جو اس نے کبھی کی ہی نہیں۔

☆☆☆

"تم مریں نہیں ابھی تک؟" یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے پر سب کچھ تھا۔ ناکامی، اذیت۔ سوائے مسکراہٹ کے۔ منائل کچھ نہیں

بولی۔اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

"آٹھ سال ایک لمبا عرصہ ہے۔" منال نے کافی کا گھونٹ لیتے کہا۔

"ہوسکتا ہے۔" ارسل نے گہرا سانس لیا۔

"کیا کررہی ہو آج کل" اسے دیکھتے دوسرا سوال پوچھا۔ اتنے سالوں بعد بھی سامنے بیٹھی لڑکی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ آج بھی سر اٹھا کر بیٹھی تھی۔

"اپنے بیٹے کی تربیت تاکہ وہ ہادی ابصار بنے نہ محمد ارسل۔" ارسل اس کی بات پر ہنسا تھا۔

"تم؟" وہ اب اس سے پوچھ رہی تھی۔

"اپنے بیٹے کی تربیت تاکہ وہ کسی رانیہ یا نور کو دھوکا نہ دے۔" منال نے مسکراتے ہوئے سر ہلایا۔

کافی دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی۔

"اگر تمہیں اس بات کو سن کر سکون ملے گا تو سن لو۔ ہادی ابصار کی تین سال پہلے ڈائیورس ہوگئی تھی۔ اور اب وہ اپنے بیٹے کے لیے کورٹ میں دھکے کھا رہے ہیں۔" وہ اپنے کپ میں چمچہ ہلاتا رہا۔ کیا اسے کوئی سکون ملا تھا؟

"جس دن تم میرے گھر آئی تھیں۔ اس دن تمہیں دیکھ کر میں خوش تھا۔ میں نے تمہیں اس گھر میں اتنی دفعہ سوچا تھا۔ اتنی دفعہ چلتے پھرتے دیکھا تھا۔ لیکن جب تم گھر میں داخل ہوئیں تو مجھے لگا کہ میری بہن مجھے ملامت کررہی ہے ہادی ابصار کی بہن کو اس کے گھر لانے پر۔

"وہ کرسی سے ٹیک لگائے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں سے سامنے بیٹھی لڑکی کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ ذرہ برابر نہیں۔

"ان سب باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں۔" منال نے کپ ٹیبل پر رکھا۔

"میں نے تم سے محبت کی تھی نور۔ مجھے نہیں لگتا میں نے تمہارے بعد کبھی کسی سے محبت کی ہو۔" وہ نفی میں گردن ہلاتی اٹھ گئی۔ وہ اظہار محبت اس وقت کررہا تھا جب اس کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

"اس محبت سے زیادہ تم نے میرے بھائی سے نفرت کی تھی۔" اس کی بات پر وہ ہونٹ بھینچ کر ہنسا۔

"انتقام نہ ہی محبت۔ میرے حصے میں تو کچھ بھی نہیں آیا۔ سوائے ایک درد کے۔"

وہ آہستہ سے بولا تھا۔ منال اس نے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھا اور کرسی پر آگے ہو کر بیٹھی۔ اس شخص نے اس سے معافی نہیں مانگی تھی۔ اسے اس مفلس شخص سے معافی چاہیے بھی نہیں تھی۔

"ضروری تو نہیں۔ ماضی سے ہمارے حصے میں کچھ نہ کچھ آئے۔ ضروری یہ ہے کہ ہم اپنی زندگیوں میں آگے بڑھ جائیں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر تم اس ادھورے انتقام اور ناکام محبت کو بھول جاؤ۔"

وہ اپنا بیگ پکڑتی اٹھی۔ اس شخص نے اسے بہت کچھ سکھایا تھا۔ ان چیزوں کے بدلے یہ دو جملے وہ اپنے اوپر ادھار رکھتی تھی۔

"اور زیادہ خوشی ہوگی۔ اگر ہم زندگی میں اب کبھی نہ ملیں۔" اس کے سامنے سے جانے لگی۔

"مجھے بھی خوشی ہوگی۔ ہوسکتا ہے جینے کا بہانا ملے اگر تم خوش رہو۔" اس کی دھیمی آواز بھی منال کو صاف سنائی دی تھی۔ وہ اسے جانتا تھا۔ کیفے سے نکلنے کے بعد اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا ویٹر اس سے کچھ کہہ رہا تھا شاید اندر اسموکنگ سے منع کررہا تھا۔

پھر گہرا سانس لیتے وہ سڑک کو دیکھنے لگی۔ سامنے چلتے پھرتے لوگوں میں پتا نہیں کون خوش تھا۔ کون نہیں اور کون اسے دیکھ کر سوچ رہا ہوگا کہ یہ خوش ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں کہ کوئی خوش ہے بھی یا نہیں۔

اس نے پھیپھڑوں کو ہوا سے بھرا۔ پھر سانس روکا اور پانچ تک گننے کے بعد گہرا سانس لیا ایک درد جو سینے میں تھا وہ پھر بھی نہیں گیا۔ سڑک پار کرنے لگی۔ اس نے ابھی بہت سے کام نپٹانے تھے پیچھے رہے شخص کے بارے میں سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

☆☆

پچھلی قسط کا خلاصہ

فارس کو موبائل پر عدینہ اور حماد کی تصویریں موصول ہوتی ہیں۔ ان تصویروں میں وہ حماد کے ساتھ مختلف ریستوران اور شاپنگ مالز میں ہنستی مسکراتی نظر آتی ہے فارس یہ سب دیکھ کر شیرازی انٹرپرائزز جاتا ہے۔ وہاں اس کا سامنا اعظم شیرازی سے ہوتا ہے وہ انہیں بتاتا ہے، حماد نے اس کا گھر خراب کیا ہے۔

جمیلہ شیرازی فارس سے بڑی مشکل سے رابطہ کرتی ہیں وہ انہیں ابارشن کے بارے میں بتاتا ہے۔ سب سے رابطہ ختم کر کے شہر میں نکل جاتا ہے وہاں شام کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے وہ اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔

ہارون شیرازی، فارس سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ فارس ساری گفتگو کے دوران خاموش رہتا ہے آخر میں گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔

فارس لاشاری گروپ کو جوائن کرتا ہے اس پر انکشاف ہوتا ہے۔ اسے اغوا کرنے والے جنید لاشاری تھے۔ ادھر عدینہ اور حماد میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اعظم شیرازی، حماد کے سارے میں اکاؤنٹ فریز کر دیتے ہیں۔ فارس کو پتا چلتا ہے کہ جنید لاشاری جو جمیلہ بیگم کے بھائی ہیں۔ اعظیم شیرازی کے کاروبار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے وہ ہارون شیرازی اور حماد کو ختم کرنا چاہتے۔ فارس کو جنید لاشاری کے منصوبے کی خبر ہوتی ہے وہ حماد اور

ہارون کو شیرازی کو بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن دیر ہو جاتی ہے۔
جنازے میں وہ اعظم شیرازی کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ یہ چیز جنید لاشاری کو الجھن میں ڈال دیتی ہے۔
جنت کو لینے فارس پہنچتا ہے تو اس کا سامنا ریان سے ہوتا ہے۔ وہ ڈرے سہمے ریان کو گود میں اٹھا لیتا ہے۔
جنید لاشاری فارس کی اعظم شیرازی کے ساتھ قربت دیکھ کر مشکوک ہے۔
جنید لاشاری اس قتل کا الزام فارس پر لگا دیتا ہے کہ اس نے جائیداد حاصل کرنے کے لیے یہ قتل کیے ہیں۔
فارس، ہارون اور آرزو جہانگیر کی ناجائز اولاد ہے۔
اعظم شیرازی ہارون کا نکاح نامہ، ڈائیورس پیپرز اور فارس کا برتھ سرٹیفکیٹ سب پبلک کروا دیتے ہیں۔
بیٹے اور پوتے کا دکھ اعظم شیرازی کو اندر سے توڑ دیتا ہے۔ وہ اپنی تمام جائیداد اور بزنس فارس کے نام کر دیتے ہیں۔ فارس دن رات ان کی خدمت کرتا ہے۔ ایک رات وہ ان کے پہلو میں سوتا ہے اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہے کہ انہوں نے اسے اعلا تعلیم دلوائی۔ وہ اعظم شیرازی سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔
یہ آخری رات ہوتی ہے اعظم شیرازی کی۔ اگلی صبح وہ دم توڑ دیتے ہیں۔

تئیسویں اور آخری قسط

اپنی سفید ہوڈی کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ بے حد سنجیدگی سے عدینہ زبیر کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ سرد نگاہیں اس کے غصے سے سرخ پڑتے چہرے پر جم گئی تھیں۔ فارس کی اجازت سے ہی وہ اندر آ سکی تھی۔ اور اتنی جرات بھی دکھا سکی تھی۔

"مجھے میرا بیٹا چاہیے۔" فارس کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر اس نے اپنا مطالبہ واضح کر دیا۔ آج وہ ہر صورت ریان کو ساتھ لے جانے کے لیے آئی تھی۔

"مجھے بھی میری بیٹی چاہیے۔ دے سکتی ہو؟"

عدینہ زبیر کے اندر ایک دم سے سناٹا پھیلا تھا۔ آنکھوں میں اضطراب لیے جنت کمال نے فارس وجدان کو دیکھا۔

"تو بدلہ لے رہے ہو تم مجھ سے!" عدینہ کا لہجہ پتھریلا ہوا۔

"تمہارے ساتھ تمہاری طرح پیش آ رہا ہوں!" اس کے لہجے کی برودت۔ عدینہ زبیر کو اندر تک سلگا گئی تھی۔

"میں یہاں۔ صرف اپنے بیٹے کے لیے آئی ہوں۔" اس کی آواز بلند ہوئی۔

"اور میں ریان کو۔ تمہارے گھر سے نہیں لایا!" فارس کی کرخت آواز سناٹے میں گونج کر رہ گئی تھی۔

عدینہ زبیر ایک دم سے لاجواب ہوئی۔ بیٹے کو ماں کے حوالے کر کے اس نے ایک بار بھی پلٹ کر خبر نہیں لی تھی۔ اپنے منتشر خیالات کو یکجا کر کے اس نے سر اٹھایا۔

"میں اپنے بیٹے کو اب اپنے ساتھ رکھنا چاہتی ہوں!" سنبھل کر تیزی سے بولی۔

"پچھلے پندرہ ماہ سے ریان تمہارے بھائیوں کے ساتھ رہ رہا تھا۔ یہ مدت کافی نہیں تھی اسے اپنے ساتھ رکھنے کے لیے؟"

وہ جانتی تھی بات، کس طرف جا رہی تھی۔ وہ پہلے کبھی ریان کے لیے نہ آئی۔ اب کیسے آ سکتی تھی۔ اور وہ بھی تب جب وہ اپنی دادی کے پاس آ گیا تھا؟

"میں کبھی نہیں چاہوں گی، میرا بیٹا اپنے باپ کے قاتل کے پاس رہے۔"

فارس کی استہزائیہ مسکراہٹ داہنے گال کی جانب اٹھ گئی۔

"قاتل خرچا اٹھا سکتا ہے۔ اپنے ساتھ نہیں

رکھ سکتا؟" اس کا لہجہ طنزیہ ہوا
عدینہ کی نگاہیں سنگ اٹھیں۔
" میں تمہارے ساتھ کوئی بحث کرنے نہیں آئی۔ مجھے میرا بیٹا چاہیے۔ ابھی اور اسی وقت۔"
" اور میرا جواب بھی واضح ہے۔ تم ریان شیرازی کو اس گھر سے کہیں نہیں لے جاسکتیں!"
عدینہ زبیر کو لگا سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ وہ ریان شیرازی کے لیے ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ ایسا اسٹینڈ نہیں لے سکتا۔
"میں ماں ہوں اس کی۔ جب چاہوں۔ جس وقت چاہوں، اسے اپنے ساتھ لے جاسکتی ہوں۔ تم کون ہوتے ہو میرے راستے میں آنے والے؟" وہ مشتعل ہو کر چیخ پڑی۔
وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے دیکھتا رہا۔
"چچا ہوں اس کا۔ حق رکھتا ہوں۔"
ڈائننگ ہال میں مسز شیرازی تھیں۔ وہ اس کی آواز بآسانی سن سکتی تھیں۔ ریان ان کی گود میں تھا۔ ان کا دل لرز رہا تھا۔
عدینہ کی مٹھیاں سختی سے بھنچ گئیں۔ " تو تم ایسے نہیں مانو گے۔ میں اپنے بیٹے کے لیے عدالت میں جاؤں گی۔ میں تم پر کیس کروں گی۔ تمہیں میڈیا پر بدنام کردوں گی۔ تمہیں کیا لگتا ہے، صرف تم ہی سب کچھ ہو۔ میں تمہارا وہ حشر کروں گی تم کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہو گے!!" اس کا لہجہ زہریلا ہو رہا تھا۔
" تمہیں نہیں لگتا، اب چال چلنے کی باری میری ہے؟"
اپنی جیبوں سے ہاتھ نکالتے ہوئے وہ سیدھا ہوا۔ عدینہ زبیر کی گرفت بیگ اسٹریپس پر سخت ہو گئی۔
" تمہارا کیا خیال ہے، پچھلے دو سالوں سے جو تم کر رہی ہو۔ میرے پاس اس کا ریکارڈ نہیں ہو گا؟"
اس نے ناسمجھی کے عالم میں فارس کو دیکھا۔
اگلے ہی پل اس کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔
"اور وہ کون ہے جس کے ساتھ تمہاری خفیہ شادی چل رہی ہے؟ سینیٹر کامران جاوید کا بیٹا!"
اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ آس پاس دھماکوں کا گمان ہونے لگا تھا۔
" تمہارے دبئی کے کافی چکر لگتے رہے ہیں۔ کیا اس کی ڈیٹیلز سے بھی آگاہ کردوں؟"
آنکھوں میں ہراس لیے وہ سناٹوں میں گھری رہ گئی تھی۔
" اگر میڈیا کو بیچ میں لا ہی رہی ہو تو آئی سی۔ تمہاری خبروں کو ریٹنگ زیادہ ملے گی۔ ہائپ بھی زیادہ کریئیٹ ہو گی۔ اور سینیٹر کامران کم از کم یہ نہیں چاہیں گے کہ ان کا سیاسی کیریئر اس طرح سے تباہ ہو جائے۔"
وہ صدمے سے گنگ کھڑی تھی۔ توڑ پھوڑ کا شکار ہوتی ایک دم سے فنا۔
جو شخص اس کا نام نہیں سننا چاہتا تھا۔ شکل نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس پر یوں نظر رکھے ہوئے تھا اس کے تو ذہن میں بھی خیال ہی نہیں آیا تھا۔
"ریان کی کسٹڈی کے لیے عدالت جانا چاہتی ہو؟ شوق سے جاؤ۔ تمہیں چیلنج کرتا ہوں۔ میرے جیتے جی اسے مجھ سے لے کر دکھاؤ تم!"
وہ بھاری سانسوں کے ساتھ متوحش سی کھڑی رہ گئی تھی۔ اس نے سوچا تھا، وہ اسے عدالتوں میں گھسیٹے گی، اسے میڈیا پر بدنام کرے گی۔ اس پر پریشر بڑھ جائے گی۔ اس کی زندگی تباہ کر دے گی۔ اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا تھا۔ اعصاب پر ایسی ضرب پڑی تھی کہ وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔
" تو اب بتاؤ۔ بیٹا چاہیے یا اپنی زندگی؟" اس نے ایک لمحے کا توقف کیے بغیر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
" فیصلہ ابھی ہو گا۔ میں نہیں چاہتا۔ روز روز کوئی تماشا کھڑا ہو۔"
پھر وجود پر دراڑیں سی پڑیں۔ آنکھوں میں قہر اترا

اور باہر اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے عدینہ زبیر نے شدید غصے کے عالم میں اپنی مٹھیاں بھینچ لی تھیں۔

☆☆☆

شام میں وہ ان کے کمرے میں آیا تو وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے جاگ رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہوئے مسکرائیں مگر آنکھوں میں غم ٹھہرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں موبائل تھا اور موبائل پر حماد کی تصویر تھی۔ ریان کی وجہ سے آج انہیں وہ بہت شدت سے یاد آیا تھا۔ فارس ان کے پاس بیٹھ گیا۔

"بچے سو گئے؟" انہوں نے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

انہوں نے موبائل رکھ دیا۔

"آپ پریشان لگ رہی ہیں؟"

انہوں نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔ چند لمحوں تک چپ رہیں۔ جیسے اپنے خوف کے اظہار کے لیے مناسب لفظ نہ مل رہے ہوں۔

"ریان تمہارا بھتیجا ہے۔ تم اس کے باپ کی جگہ پر ہو۔ ہو سکتا ہے، اس کی ماں کی وجہ سے کبھی تمہارے دل میں کوئی نفرت آ جائے۔ یا کبھی تمہارے لیے یہ سب مشکل ہو جائے۔"

"ممی!" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر نفی میں سر ہلاتے انہیں روکنا چاہا۔

"میں صرف اتنا کہہ رہی ہوں، عدینہ کی وجہ سے ریان کو کبھی اکیلا مت کر دینا فارس! اس کا پوری دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی نہیں ہے۔" ان کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ چہرہ تر تھا۔ وہ بہت حساس ہو رہی تھیں۔

اس نے ان کی کیفیت سمجھ کر ان کی آنکھوں میں نرمی سے دیکھا۔ شاید انہیں ڈر تھا۔ عدینہ ان دونوں کے درمیان کوئی دوری نہ پیدا کر دے۔ کہیں وہ بار بار کی مداخلت سے فارس کو ریان شیرازی سے متنفر نہ کر دے۔

"اس عورت کا مقابلہ مجھ سے ہے ممی! آپ بے فکر رہیں۔ میں ریان کو اس جنگ میں کبھی استعمال نہیں ہونے دوں گا۔" اس کا موقف واضح تھا۔ ارادہ واضح تھا۔ نیت واضح تھی۔ ریان شیرازی اس گھر کا ایک فرد تھا۔ اس کی فیملی کا ایک حصہ۔ اس کا بھتیجا۔ وہ صحیح معنوں میں اب اس کا گارجین ہی تھا۔ انہیں احساس ہوا وہ بلا وجہ کی فکر پال رہی ہیں۔ کچھ دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہنے کے بعد وہ جا چکا تو انہوں نے گہری سانس لے کر نم آنکھوں کو صاف کیا۔ پھر دعائیں پڑھتے ہوئے سونے کے لیے لیٹ گئیں۔

☆☆☆

گھر پہنچتے ہی عدینہ زبیر نے بیڈ روم کا دروازہ زور سے بند کیا تھا۔ بیگ نیچے پھینک کر غصے میں ٹہلتے ہوئے اپنے بال نوچ لیے تھے۔

"بیٹا چاہیے یا اپنی زندگی؟ فیصلہ ابھی ہوگا!! میں نہیں چاہتا! روز روز کوئی تماشا ہو۔" فارس وجدان کی آواز بازگشت بن کر ایک بار پھر گونجی تھی۔

اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ وہ ہر طرح کی قانونی جنگ کے لیے تیار تھا۔ اس کے پاس بہت سے راز اور کمزوریاں تھیں۔ وہ اسے برباد کر سکتا تھا۔

وہ جلد بازی میں کوئی اسٹیپ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ سینٹر کامران جاوید کے ساتھ اپنے اس رشتے کو ابھی بچا کر رکھنا تھا۔ وہ اس طرح نظروں میں آ سکتی تھی۔

اس کا ذہن مفلوج ہو رہا تھا۔ نہ اندر کی آگ کم ہو رہی تھی۔ اور نہ ہی غصہ ختم ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا وہ ہر ایک شے توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔

آخر وہ ریان کو اپنے ساتھ کیسے لے جائے؟

کچھ بے بسی سے اس تمام معاملے کو سوچتے ہوئے وہ کسی خیال کے تحت ایک جھٹکے سے رک گئی تھی۔ اس کے تاثرات لمحے بھر میں بدل گئے تھے۔ اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں چمک اتر آئی تھی۔ اترے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ بچھ گئی تھی۔

"یہ میرے ذہن میں کیوں نہ آیا۔" ہنستے

آیا۔ اس کا وجود خودساختہ آگ میں جلنے لگا تھا۔

اس کے لیے زندگی اہم تھی۔ اپنا گھر اہم تھا۔ جس شخص کے ساتھ وہ رشتے میں منسلک تھی۔ وہ شخص بھی اہم تھا۔

"میں تمہیں دیکھ لوں گی۔" مٹھیاں بھینچ کر ہاتھوں کی کپکپاہٹ پر قابو پاتے ہوئے سخت لہجے میں دھمکا کر وہ اسی وقت گھر سے نکل گئی تھی۔

دروازہ بند ہوا تو گہری سانس لیتے ہوئے جنت کمال نے فارس کو دیکھا۔

"عدالتی نوٹس آ بھی سکتا ہے!" حیدر مؤدب سا فارس کے برابر میں کھڑا کہہ رہا تھا۔

"دیکھتے ہیں۔ کیا کرتی ہے۔" وہ عام سے لہجے میں بولا۔ گویا اس کے لیے یہ مسئلہ سرے سے مسئلہ تھا ہی نہیں۔ وہ ریان کے معاملے میں عدینہ زبیر جیسی عورت سے نمٹنے کے لیے مکمل تیار تھا۔

گہری سانس لے کر مڑا تو جنت پر نظر پڑتے ہی رک گیا۔ اس نے قریب آ کر فارس کا ہاتھ بہت مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"آئم سو پراؤڈ آف یو!"

فارس وجدان نے سانس بھر کر بیوی کو دیکھا۔ جس کی کچھ دیر پہلے تک اچھی خاصی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔

"میں کے ٹو سر کر کے نہیں آیا!"

"لیکن میرے لیے یہ مسئلہ کے ٹو جیسا ہی تھا۔ قسم سے بہت ڈری ہوئی تھی کہ پتا نہیں کیا ہوگا!" بازو سے پکڑ لیا۔ "تھینک یو فارس!! تھینک یو سو مچ!!"

"کس لیے؟" وہ ذرا سا حیران ہوا۔

"تم نے ریان کے لیے جو اسٹینڈ لیا۔ اس کے لیے۔"

"وہ تو مجھے لینا ہی تھا۔"

"ہاں لیکن۔ جو تم نے کیا۔"

"کیا کیا؟"

کہنا چاہتی تھی جو عدینہ زبیر کے ساتھ کیا اس کے لیے بھی شکریہ۔ مگر مسکراہٹ لبوں پر سجائے چپ رہی۔ یوں لگا جیسے عدینہ زبیر کی تمام حرکتوں کا بدلہ لے لیا گیا ہو۔

ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی مسز شیرازی کے برابر میں بیٹھتے ہوئے فارس نے پانی کا گلاس اٹھا لیا۔ مسز شیرازی آنکھوں میں نمی لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ریان گود میں تھا۔ میز پر ہاتھ رکھے پلیٹ کو چھیڑنے کی کوشش کرتا ہوا۔

"آپ کھانا نہیں کھا رہیں۔" سر اٹھا کر پوچھا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ فوراً ہی صاف کیے۔ جنت فارس کے برابر میں بیٹھ گئی تھی۔

"ممی۔" وہ ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"اگر وہ ریان کو لینے پھر آ گئی تو؟" جو خدشہ تھا وہ لبوں پر آ گیا۔ آج وہ خالی ہاتھ چلی گئی تھی۔ کون جانے کب وہ واپس آ جائے۔

"اللہ پر بھروسا رکھیں۔ میرے ہوتے ہوئے وہ ریان کو آپ سے نہیں چھین سکتی!" ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے یقین دہانی کرائی۔

"ماں ہے، کچھ بھی کر سکتی ہے!" ان کی آواز کانپی۔

"ممی! اگر اسے ریان کی فکر ہوتی تو وہ اسے اپنے پاس رکھتی۔ یہاں وہ صرف ہمارا ری ایکشن دیکھنے آئی تھی۔" اس نے مختصر جواب دے کر انہیں اندر تک پرسکون کر دیا۔ وہ فارس کو دیکھ کر رہ گئی تھیں۔ وہ پرسکون اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ اس عورت کو بہت اندر تک سمجھ کر۔ پرکھ کر بات کر رہا تھا۔

ان کا دل بھر آیا۔

"آپ کھانا شروع کریں!" وہ ان سے کہہ رہا تھا۔

جمیلہ داؤد کے دل پر جو خوف کے بادل تھے۔ چھٹ گئے۔ آنکھوں میں نمی لیے اپنے پوتے کا گال چوما۔ جنت نے ریان کو ان سے لے کر کرسی پر بٹھا لیا۔ کھانا ایک بار پھر شروع کر دیا گیا تھا۔

ہوئے بے اختیار اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ اور بیڈ پر بیٹھ گئی۔

شیطان نے ایک چال چل دی تھی۔ اسے ایک راستہ دکھا دیا تھا۔

"حل تو یہی ہے کہ ریان اس کے پاس ہی رہے۔" اس کے اندر کا شور تھم گیا تھا۔ آگ بجھ گئی تھی۔

وہ اب فارس وجدان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی لیکن بعد میں تو کر سکتی تھی۔ اور پورے حق سے اپنا بیٹا بھی لے سکتی تھی۔

اس کے لیے وقت اور پلاننگ درکار تھی۔ فارس وجدان کو شکست سے دوچار کرنے کے لیے اس کی مضبوطی کو کمزوری میں بدلنا ضروری تھا۔ اس کی آنکھوں سے شیطانیت جھلکنے لگی تھی

فارس وجدان کا محفوظ دیواروں کا وہ قلعہ اندر سے ہی آگ پکڑ سکتا تھا۔ تباہی کسی قریبی سے ہی شروع ہو سکتی تھی۔ وہ قریبی کوئی اور نہیں اس کا بیٹا ریان شیرازی ہی ہو سکتا تھا۔

خاندان کا نام۔ جائیداد میں حصہ۔ کاروبار میں شیئرز۔ اگر وہ پیچھے ہٹ جائے تو ریان کو یہ سب مل سکتا تھا۔ اور پھر وہ کھیل سکتی تھی۔ سودا خسارے کا نہیں تھا۔ ریان کو فارس کے پاس ہی رہنا چاہیے۔ اس نے تہیہ کر لیا۔

اس کی آنکھیں اپنی ممکنہ کامیابی کو سوچ کر چمکنے لگیں۔ تصور میں ایک ہی نام۔ اور آنکھوں میں ایک ہی چہرہ تھا۔ ریان شیرازی کا چہرہ جو اس کا بیٹا تھا اور جس کے بڑے ہونے کا اب اسے انتظار کرنا تھا۔

منصوبہ بن گیا۔ ارادے بندھ گئے۔ پہلا قدم اس نے اٹھا لیا۔ مطمئن ہو کر اس نے اپنی ٹکٹ بک کروائی اور اگلے دن کی فلائٹ سے لندن روانہ ہو گئی۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ اور لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ۔

وہ عدینہ زبیر تھی۔ نفرت اور انتقام کی آڑ میں اپنے ہی بیٹے کی بربادی کا سوچ کر مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

لان چیئر پر مسز شیرازی کے ہمراہ بیٹھے اس نے دھوپ میں دور پھولوں کے پاس ریان، زین اور فارس کو دیکھا۔ وہ ریان کی بات توجہ سے سنتا سر ہلا رہا تھا۔ اور زین کو اس کی واکر میں بٹھا رہا تھا۔ ریان ہنستے ہوئے اپنی کھلونا کار، زرافہ، اور پلاسٹک کا بھالو سب ترتیب سے زین کے آس پاس رکھتا جا رہا تھا۔

وہ بلاکس جوڑنے کی کوشش میں اپنے پاپا کی بات بہت توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ گھٹنے پر بیٹھ کر، فارس کی گردن میں بازو ڈالے اپنے چھوٹے بھائی کو غبارے سے بہلا رہا تھا۔

زین نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا رکھے تھے، اس کے بھرے بھرے گال اور ہونٹ گلابی ہو رہے تھے، پھول سے لبوں سے نیچے کے دو دانت جھلک رہے تھے۔ وہ بہت ایکٹو اور شرارتی سا بچہ واکر کو حرکت دے رہا تھا۔ اس کی قلقاریاں سنائی دے رہی تھیں۔

جمیلہ داؤد کے ہمراہ بیٹھ کر چائے پیتے وہ مسلسل انہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ منظر بہت مکمل سا لگ رہا تھا۔ بچوں کی ذمہ داری صرف اس کے کندھوں پر نہیں تھی۔ فارس روزانہ کی بنیاد پر بچوں کو ٹائم دیتا تھا۔ اور چھٹی کا دن تو تھا ہی صرف ان کے لیے۔

پھر وہ خود بھی اٹھ کر ان کے پاس چلی گئی۔ جمیلہ داؤد نے مسکراتے ہوئے انہیں دیکھا۔ ان کے گھر کی رونقیں اللہ نے لوٹا دی تھیں۔ اس پر وہ اپنے رب کا جتنا شکر یہ ادا کرتیں کم تھا۔

☆☆☆

وہ عید کی شاپنگ پر گئے تو جمیلہ داؤد کو اپنے ساتھ ہی مال لے کر گئے تھے۔ زین کی وہ پہلی عید تھی۔ وجدان ہاؤس میں ریان کی بھی۔

دونوں کی خواہش تھی، بچوں کے کپڑے جمیلہ داؤد ہی خریدیں۔ وہ آنکھوں میں محبت کی نرمی لیے انہیں دیکھ کر رہ گئی تھیں۔

"پہلے دن آپ کی پسند کے ہو جائیں۔ دوسرے دن میری پسند کے۔ اور تیسرے دن فارس

کی پسند۔"

"مجھے تیسرا دن ملے گا۔" ذرا سا شکوہ کیا۔

"بالکل تم تیسرے نمبر پر رہو!"

جمیلہ داؤد مسکرا کر رہ گئیں۔ ریان اور زین کے کپڑے بہت چاہت سے خود پسند کیے۔ ان کی ہمیشہ سے خواہش رہتی تھی، وہ فارس اور حماد کو بھی ایسے ہی ایک جیسے کپڑوں میں دیکھیں۔ تو اب کافی عرصے بعد یہ خواہش بھی پوری ہو رہی تھی۔ عید کے روز ان کے ہی پسند کیے گئے شارٹس اور شرٹس میں ملبوس زین اور ریان انہیں فارس اور حماد ہی لگے۔ وہ چند لمحوں تک بالکل ساکت ہو کر نم آنکھوں سے انہیں دیکھتی رہی تھیں۔ پھر انہوں نے پہلے ریان کا بوسہ لیا تھا، پھر زین کا۔ وہ زین کو گود میں لیے آنسو پونچھتی رہیں۔

بچوں کے ساتھ گزاری جانے والی وہ عید ان کے لیے بہت خاص ہو گئی تھی۔ دوپہر میں زویا اپنے بھائی کے ساتھ آ گئی۔ پھر ان کے چشما تو کزن بھی آ گئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے گھر بچوں سے بھر گیا۔

وہ لان میں بیٹھی ہنستے ہوئے بچوں کے ساتھ ریان کو کھیلتا دیکھتی رہیں۔

عید کے تیسرے دن لاہور کا پروگرام بن گیا۔ جنت کی بہنوں کی طرف سے دعوت تھی۔ وہ جمیلہ داؤد کو اپنے ساتھ ہی لے جانا چاہتے تھے مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ ان کی چند دوستیں پاکستان آنے والی تھیں۔

لاہور کا سفر شروع ہوا تو جنت نے کچھ یاد آ جانے پر ایک دم سے اس کی طرف دیکھا۔

"تمہیں وہ جگہ یاد تو ہو گی جہاں ہم رکے تھے!"

"کون سی جگہ؟" اسٹیرنگ وہیل پر گرفت جمائے وہ سیاہ گاگلز کی زد میں سڑک پر نظریں جمائے ہوا تھا

"جہاں ایکسیڈنٹ ہوا تھا!!"

"کب ہوا تھا؟"

"فارس!" ذرا جھنجلا کر اس کی طرف رخ موڑا۔

"اوہ ہاں! یاد آیا!"

"ہم وہاں رکیں گے۔ میں اس لڑکے سے ملنا چاہوں گی۔" اس نے کہہ دیا۔

عقبی نشست پر بے بی چیئر پر ریان بیٹھا تھا اور برابر میں زین تھا۔ وہ چھ ماہ کا چوزہ گہری پر سکون نیند سو رہا تھا۔

"مما۔!" ریان کے ہاتھ میں ایک جہاز تھا۔ نیلے رنگ کا۔

"جی مما کی جان!" گردن موڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ ریان کو پانی چاہیے تھا۔ اس کی مخصوص بوتل نکال کر اسے دی جس میں اسٹرا لگا ہوا تھا۔ چند گھونٹ لے کر اس کی "بس" ہو گئی۔

دو گھنٹوں کا سفر طے ہوا۔ اور اب کے فارس نے جس اسٹیشن پر گاڑی روکی تو جنت نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اندازہ لگانا چاہا وہ کہاں پر تھے۔

پیٹرول پمپ اور سامنے کچھ اسٹور۔ اور دکانیں۔ اور پھر اس کی نظر سامنے ہی پکوڑوں کے اسٹال پر پڑ گئی۔ وہاں پندرہ سولہ برس کا لڑکا کھڑا تھا۔ ہاتھوں پر دستانے تھے، سر پر کیپ تھا۔ وہ وہی لڑکا تھا۔ جنت فوراً پہچان گئی۔

بچے سو رہے تھے، وہ گاڑی سے نکل کر باہر کے اسٹال کی طرف گئی۔

"السلام علیکم خان!!"

پٹھان لڑکے نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آنکھیں چھوٹی کر کے۔ عقب میں دروازہ کھول کر اس کا شوہر باہر آیا تو خان کا پہلے منہ کھلا۔ پھر آنکھیں پھیلیں۔

"ارے بارش والا باجی!" اس کا تخاطب جنت کمال کے سارے جوش پر پانی پھیر گیا۔ فارس نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی۔ خوش باش سا گل خان فوراً اس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ "باجی! تم وہی ہوتا۔ وہاں رکا تھا تم۔ جب بارش ہو رہا تھا!"

وہ پہچان کر تصدیق چاہ رہا تھا کہ آیا وہ وہی تھی یا نہیں۔ "اور تم وہاں چھپ کر کھڑا تھا۔ ہمیں تم یاد ہے۔" وہ خوش تھا۔ فارس کی ہنسی بے ساختہ تھی۔ جنت نے گردن موڑ کر قہر بار نظروں سے اسے دیکھا تو ضبط پکڑ کر اس نے معذرت خواہانہ انداز میں اپنے ہاتھ کھڑے کیے۔

"ہاں میں وہی ہوں جو۔ اس رات اسٹور میں رکی تھی!" (یعنی جو گری تھی، وہ کوئی اور ہوگی)

اس نے فوراً سے کرسی کھینچ کر سامنے رکھی۔ "باجی! بہت خوشی ہوا ام کو۔ تم پکوڑے کھائے گا امارے؟"

جنت کا موڈ ذرا سا خوش گوار ہوا! "ہاں بالکل، میں اسی لیے تو آئی ہوں!" فارس کا بازو پکڑ کر اسے بھی اپنے ساتھ گھسیٹ لائی۔

"جنت! میں یہ نہیں کھاتا۔"

"تم دیکھ نہیں رہے، گل خان کتنا صفائی پسند ہے؟"

"میں صفائی کی بات نہیں کر رہا۔ میں نے کبھی اس طرح کچھ کھایا نہیں۔"

"تو آج کھا لو!" اسے اپنے ساتھ ہی کرسی پر بٹھا لیا۔ توجہ گاڑی کی طرف بھی رہی کہ بچے سو رہے تھے۔

گل خان نے پلیٹ میں پکوڑے تل کر گرم گرم پیش کیے تو اس نے فوراً ایک اٹھا لیا اور دوسرا فارس کو دیا۔

"یہ تو بہت ٹیسٹی ہیں خان!" اسے سچ میں بہت مزے کا ذائقہ لگا۔ تھوڑا سا ٹکڑا توڑ کر کھاتے ہوئے فارس نے بھی ذائقہ چکھا۔ پسند آیا تو اس نے دوسرا بھی اٹھا لیا۔ پھر تیسرا بھی۔

"ہمارے ہاتھ میں اللہ نے ذائقہ رکھا ہے۔ اور اماں بولتا ہے، تم اچھی نیت سے پکوڑے بنائے گا تو اس میں اللہ اور ذائقہ ڈال دے گا۔ اس لیے سب کو امارا پکوڑا بہت پسند آتا ہے۔"

خان سے باتیں کرتے اس کے گھر کا حال احوال پوچھا۔ وہ عید پر ہی اپنے گاؤں جا پاتا تھا۔ پکوڑوں کی قیمت ادا کر کے، اس کی اور اس کے اسٹال کی تصویریں کھینچ کر اس نے جمیلہ داؤد، آئمہ اور اپنے پڑوس کی خواتین کے گروپ میں ارسال کر دیں۔

"تم ہماری مشوری (مشہوری) کر رہا اے؟" گل خان بڑا خوش ہوا۔

"ہاں بالکل! دیکھنا یہاں سے جتنے لوگ گزریں گے، تمہارے پکوڑے ضرور کھائیں گے!" جنت بہت ایکسائیٹڈ تھی۔

"تم ہمیں پکوڑے والا بنائے گا۔"

جنت کو ہنسی آ گئی "نہیں بھائی! ہم بس یہ کوشش کر رہا ہے کہ تمہارے بہت سارے کسٹمرز ہوں!!" وہ اس کا لہجہ اور انداز اپنا کر بولی۔

"اچھا ایک منٹ!" گل خان اب کے بڑی سنجیدگی سے اپنے اسٹال کے آگے حلیہ بہتر کر کے کھڑا ہو گیا۔ سینے پر بازو باندھے، گردن اونچی کی۔

"تم اب امارا تصویر کھینچو!" اور جنت کمال پروفیشنل فوٹو گرافر بن گئی۔ ایک تاسف بھری نگاہ اپنی بیوی پر ڈالتے ہوئے وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر زین پر جھکا جو ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا۔ بلٹ کھول کر اسے اٹھا لیا۔ سیدھا ہوا تو گل خان پکوڑے کی پلیٹ ہاتھ میں لیے مسکراہٹ دکھا رہا تھا۔ "باجی تم ہمارا ایک ویڈیو بناؤ۔ ہم اپنے بارے میں بتائے گا!"

"ہاں ٹھیک ہے۔ آئمہ کو سینڈ کر دوں گی۔ وہ اپنی کسی دوست کے ذریعے کسی چینل پر چلوا دے گی۔"

اب ویڈیو شوٹنگ شروع ہو گئی۔

"سلام علیکم! ہمارا نام گل خان اے۔ اور ام پکوڑے بناتا اے۔ ہم بوت محنت کرتا اے۔ ہمارا پکوڑا جو کھاتا اے، بولتا ہے بہت ذائقے دار اے۔ تم امارا پکوڑا کھانے یہاں ضرور آؤ!!" ساتھ ہی جگہ کا پتہ، پیٹرول اسٹیشن کا نام اور جس جگہ کا رہائشی تھا اس

علاقے کا بھی تفصیل سے بتادیا۔

"اپنی مما کو دیکھ رہے ہو۔" زین کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے اس نے اپنے بیٹے کو مخاطب کیا۔ وہ دھوپ میں منڈی منڈی آنکھوں سے یہاں وہاں دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر اسے چھینک آگئی۔

"جنت!"

"بس فارس ابھی آئی!"

پھر جب زین رونے لگا تو گل خان کو بہت سی شاباشی اور محنت کی تلقین کرکے وہ واپس آئی، زین فارس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کرتے ہوئے اس کی طرف ہمکنے لگا۔

"باقی سب کا بھی انٹرویو کرلو!!" فارس نے طنز کیا۔

"وہ بعد میں پھر کبھی کرلوں گی!!" موڈ اچھا تھا سو مائنڈ نہ کیا۔ ہنستے ہوئے بڑے پیار سے زین کو لے لیا۔

"اس تاریخی جگہ کی بھی تصویر لیتی تھی جہاں تمہاری ہنگامی لینڈنگ ہوئی تھی!"

زین کو فیڈ ر دیتے ہوئے لب بھینچ کر اس نے فارس کو دیکھا۔

"بات تو ایسے کررہے ہو جیسے تم خود تو کبھی پھسل کر گرے ہی نہیں!"

"اتنی بری طرح سے کبھی نہیں گرا۔ بالکل!" اس کا پرسکون لہجہ جنت کمال کو تپا گیا۔

"وہ سب تمہاری وجہ سے ہوا تھا۔ تم نے مجھے نظر لگائی تھی!"

فارس کا صدمہ سے منہ کھلا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ "میری نظر لگ گئی تھی تمہیں؟"

"اتنے آرام سے اور اطمینان سے چل رہی تھی میں۔ اور تم سے برداشت نہیں ہوا۔ اور تم نے ماشاء اللہ نہیں کہا۔"

"کس بات پر ماشاء اللہ کہنا چاہیے تھا مجھے؟ کہ تیز بارش میں چھتری پکڑ کر ڈولتی ہوئی جا رہی ہو؟"

اور بغیر [illegible] پڑا تھا۔

"مجھے پتا تھا! تم میرا موڈ ضرور خراب کرو گے۔ تم ہو ہی ایسے۔ تم مجھے کبھی خوش دیکھ ہی نہیں سکتے۔" اس کا چہرہ غصے سے لال ہورہا تھا

لبوں پر مسکراہٹ لیے اس نے بیک ویو مرر کی پوزیشن درست کی۔

اچھا ہے گھنٹہ آدھا گھنٹہ اس طرح لڑتے ہوئے اچھا گزر جائے گا۔ وہ محظوظ ہوا۔

"مجھے تمہارے ساتھ آنا ہی نہیں چاہیے تھا! میں ہی بے وقوف ہوں جو ہر بار یہ سوچ لیتی ہوں کہ نہیں۔ میرا تمہارے ساتھ بہت اچھا وقت گزرے گا۔ تم مجھے خوشی دو گے۔ لیکن تم نے مجھے صرف غصہ دلانا ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ بیوی کی تھوڑی سی تعریف کردو۔"

"یہ گرنے والی بات میں تعریف کہاں سے آگئی؟" متحیر ہو کر پوچھا۔

"میں تو تمہاری فوراً تعریف کرتی ہوں۔ میں تو کہہ دیتی ہوں، اب تم اچھے لگ رہے ہو۔ لیکن تم کیا کہتے ہو؟ کپڑے اچھے لگ رہے ہیں۔ بال اچھے لگ رہے ہیں۔"

"تو یہ کپڑے اور بال ہوتے کس کے ہیں!" اب کے وہ جھنجھلا اٹھا۔

"تو تمہیں کہنا چاہیے نا کہ تم پر یہ کپڑے اچھے لگ رہے ہیں۔ تمہارے بال پیارے لگ رہے ہیں!!"

"دونوں میں فرق کیا ہے؟"

"زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ!"

"اور تمہیں کیا لگتا ہے۔"

"اوکے فائن۔ ٹھیک ہے، سوری۔ معاف کردو۔ غلطی ہوگئی مجھ سے۔ آئندہ تم بارش میں چھتری لے کر نکلو گی تو ماشاء اللہ ضرور بولوں گا۔"

اور وہ زین کو سینے سے لگائے بگڑے تیوروں

کے ساتھ کھڑکی کی طرف رخ موڑ گئی۔ بات یہاں تک رہتی تو ٹھیک تھا۔ لیکن لاہور پہنچ کر نفیسہ کے گھر میں اپنے بھتیجے، بھانجیوں کے ساتھ بارش انجوائے کرتے ہوئے وہ فارس کے عین سامنے پھسل کر گری تو دن میں تارے نظر آ گئے۔ اوپر سے فارس کی ہنسی نے خفت بڑھا دی۔ اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیے۔

"خالہ گر گئیں۔"

"خالہ! آپ کو چوٹ لگ گئی۔"

"خالہ! آپ رو رہی ہیں؟"

وہ شیڈ تلے کھڑا تھا۔ کافی کا مگ رکھ کر اس کے پاس آ گیا

"کیا تم ٹھیک ہو؟" پنجوں کے بل جھکتے ہوئے مسکراہٹ ضبط کر کے پوچھا۔

"بات مت کرو مجھ سے۔" ہاتھ ہٹا کے غصے سے چیخ پڑی۔ آنکھیں نم اور لال ہو رہی تھیں۔ (اسے ہنستے ہوئے جو دیکھ لیا تھا۔)

"یقین کرو، میں نے نظر نہیں لگائی۔"

لیکن جنت نے سر نہیں اٹھایا۔ چہرے سے ہاتھ نہیں ہٹائے۔

"اب خود اٹھ جاؤ گی۔ یا اٹھا لوں؟" جھک کر سرگوشی کی

اس کے عزائم سے باخبر ہوتے ہی جھٹکے سے سر اٹھایا۔ گھبرا کر یہاں وہاں دیکھا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر فوراً سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

برآمدے کی کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھتے ہوئے حفصہ کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ ان کی نرم نگاہیں فارس وجدان پر جمی رہ گئی تھیں۔ وہ اسے واپس شیڈ کے نیچے لے گیا تھا۔ وہ اس کی پیشانی پر جھکے ہوئے بالوں کو دائیں ہاتھ سے ہٹا رہا تھا۔ وہ کچھ غصے اور خفگی سے گردن موڑے ہوئے تھی۔ اور پھر اس کی کسی بات پر نہ چاہتے ہوئے بھی مسکرانے لگی تھی۔

ہانیہ زین کو اٹھائے بیٹھی تھی۔ ریان ان کے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ وہ مگ ہاتھ میں لیے اس کے پاس آئی تھیں۔ جھک کر زین کو دیکھا۔

"ماشاء اللہ کتنا پیارا ہے یہ!!" ہانیہ نے زین کے کئی بار چومے جانے والے گال کو ایک بار پھر چوما۔

"کیا آپ دونوں میں سے کوئی باہر نہیں آنا چاہے گا۔" کھڑکی میں ہی جنت کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ مسکرائیں۔ ان کے بچے جنت کا ہاتھ کھینچ رہے تھے۔

"بس کر دو اب۔ بیمار ہو جاؤ گی!!" ان کے لہجے میں شفقت بھری تھی۔

"بس ابھی آئی آپی! وہ فارس کا موبائل دے دیں۔ وہ باہر جا رہا ہے!!" انہوں نے اٹھا کر دے دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ چلا گیا تو جنت کپڑے بدل کر ان کے پاس آ بیٹھی۔ بارش رک چکی تھی۔ موسم کافی خوش گوار سا ہو گیا تھا۔ زین کو ہانیہ کمرے میں سلا آئی تھی۔ ریان کو کھانا کھلا کر فارغ ہوئی تو بیرونی گیٹ پر دستک ہونے لگی۔ گیٹ پر حفصہ آپی گئی تھیں۔ وہ اس کے کمرے میں پھر کافی دیر بعد آئیں۔ غالباً بیٹھک میں کسی کے ساتھ موجود رہی تھیں۔

"تائی امی آئی تھیں۔" اس نے نہیں پوچھا تھا مگر انہوں نے خود سے بتا دیا۔

وہ زین کے کپڑے بیگ میں رکھ رہی تھی۔ سنی ان سنی کیے خاموشی سے رکھتی گئی۔

"تم سے ملنے کا کہہ رہی تھیں۔"

جنت کا سر جھکا رہا۔

حفصہ نے جنت کی طرف دیکھا۔ وہ خاندان کے کسی فرد کے بارے میں سوال کرتی تھی، نہ کسی سے ملنا چاہتی تھی۔ دروازہ اس نے صرف بہنوں کے لیے کھولا تھا۔ معافی بھی صرف انہیں دی تھی۔

"آپی!! میں یہاں صرف آپ کے کہنے پر صرف آپ سے ملنے آئی ہوں!!" سر اٹھا کر بولی تو لہجے میں ایک غم پوشیدہ تھا۔

"جانتی ہوں۔ اس لیے منع کر دیا!!"

"ممّا!" ریان دروازہ دھکیل کر اندر آیا تھا۔

حفصہ آپی کے چھوٹے بیٹے سے اس کی کافی دوستی ہو چکی تھی۔ وہ اس کے ساتھ کھیلتا رہا تھا۔ اب بھوک لگی تھی۔ نیند بھی آ رہی تھی۔ جنت نے بے اختیار اسے اٹھالیا۔ انہوں نے محبت پاش نظروں سے اس بچے کو دیکھا۔ پھر جنت کو۔

"فارس کو سچ میں کوئی فرق نہیں پڑتا؟" اس کے لیے سیریلیک بنا کر آئی تو حفصہ نے پوچھا۔

"کس بات سے؟؟"

"ریان اس کی پہلی بیوی کا بیٹا ہے۔"

جنت نے بے اختیار سر اٹھایا۔ مسکرائی پھر نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔" ہم دونوں اس طرح اسے نہیں دیکھتے۔"

جنت کی آنکھوں میں نرمی تھی۔ وہ ریان کو بہت پیار سے کھلا رہی تھی۔ حفصہ آپی کبھی سمجھ نہیں سکتی تھیں۔ ریان تو جیسے ایک آئینہ تھا۔ جس میں فارس کو اپنا عکس نظر آتا تھا۔ اور جنت کمال کو اپنا۔

"بچے تو محبت اور صرف محبت کے حق دار ہوتے ہیں آپی۔ ان کے حصے میں نفرتیں کیوں آئیں؟"

حفصہ کمال نے تائید میں سر ہلاتے نرمی سے ریان کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ اس یتیم بچے کی مسکراہٹ بہت پیاری تھی۔ وہ ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں جنت سے باتیں کیے جا رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے پاپا کا پوچھ رہا تھا۔ جنت اسے سلانے لگی تو وہ اٹھ کر باہر آ گئیں۔ سکون بھری سانس لیتے ہوئے انہوں نفیسہ کے روشنیوں میں نہائے ہوئے اس گھر کو دیکھا جس میں ہر طرف زندگی کے آثار نظر آ رہے تھے۔ بانیہ کچن میں کھانے کا انتظام دیکھ رہی تھی۔ سہیل بچوں کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھے تھے، ایمان ابھی پہنچی تھی۔ اس کے شوہر نے دس بجے تک آ جانا تھا۔

وہ دوپٹہ ٹھیک کرتی عشاء کی نماز پڑھنے چلی گئیں۔ جنت نے گہری سانس لے کر کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔

رات کی تاریکی میں رم جھم بارش برس رہی تھی۔

☆☆☆

اس کا بزنس ٹرپ پر لندن جانے کا ارادہ ہوا تو اپنے ساتھ جنت اور بچوں کو بھی لے کر گیا۔ پروگرام اچانک بنا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا، جمیلہ دادو بھی ساتھ ہی چلیں مگر انہوں نے منع کر دیا۔ دو ماہ بعد ویسے بھی انہیں اپنے علاج کے لیے امریکا جانا تھا سو طے پایا گیا وہ بچوں کے ساتھ گھوم پھر آئے۔

فون پر حیدر کو احکامات جاری کرتے فارس نے بگونیا ہاؤس کی صفائی اور اس کے انتظامات کی دیکھ بھال کا حکم جاری کیا۔ وہ اس گھر کو بیچنے کا مصمم ارادہ کر کے بھی ابھی تک بیچ نہیں سکا تھا۔ لندن پہنچے تو برف باری نے استقبال کیا۔ کچھ یاد کر کے وہ مسکرا دی۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ آدھے گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد ایک رہائشی کالونی میں روک دی گئی تھی۔

"یہ گھر تو بہت خوبصورت ہے!" بگونیا ہاؤس کو باہر سے دیکھتے ہی جنت کے منہ سے بے اختیار نکلا تھا۔

"ہاں! خوبصورت تو ہے!!" فارس نے ریان کو اٹھا رکھا تھا۔ زین جنت کی بانہوں میں تھا۔

"اتنا تو پیارا گھر ہے۔ اسے بیچ کیوں رہے تھے!!" پورے گھر کا جائزہ لینے کے بعد اس نے فارس سے پوچھا تھا۔ وہ کھڑکیوں کے پاس کھڑا برابر والے گھر کو دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں پسند آیا؟"

"بہت!"

بازو کے گھیرے میں لیے اسے قریب کر لیا۔ سامنے والے گھر کی اس طرف کی کھڑکیاں روشن تھیں۔ "یہ مسز گرانٹ کا گھر ہے!"

"جن کے پاس فلورا نام کی طوطی ہے۔"

"بالکل وہی۔"

"ان کی نواسیوں کو دیکھ کر تمہیں میں یاد آیا کرتی تھی!"

"ہاں!"
جنت مسکرائی۔
اگلے دن وہ ریان اور زین کے ساتھ ہی برابر والے گھر میں فارس کے ہمراہ مسز گرانٹ سے ملنے گئی تھی۔ گو کہ وہ کافی بیمار تھیں۔ اور ان کی یادداشت بھی ٹھیک سے کام نہیں کرتی تھی مگر فارس کو دیکھتے ہی وہ اسے پہچان گئی تھیں۔ انہوں نے زین اور ریان کو بہت پیار کیا۔ بہت خوش تھیں۔
بات کرتے کرتے ان کا ذہن بھٹک جاتا تھا۔ وہ باتیں بھول جاتی تھیں۔ ہر تھوڑی دیر بعد متفکر سی اسے دیکھتیں۔ کسی وقت کے دائرے میں قید ہو جاتیں۔ ایسے سوال کرتیں جن کا جواب دیتے فارس کے تاثرات میں کہیں کہیں کرب اتر آتا۔ پھر وہ بھول جاتیں، وہ کس سے بات کر رہی ہیں۔ وہ گھر واپس آئے تو فارس بہت خاموش سا تھا۔
اگلے دن فارس آفس کے لیے روانہ ہوا تو وہ خود ان سے ملنے آ گئی تھی۔ فوراً پہچان گئیں فارس کی بیوی ہے۔ ہنستی باتیں کرتی رہیں۔ ایک بلی پالی تھی مر گئی۔ کتا پالا تھا۔ وہ بھی مر گیا۔ بس فلورا زندہ تھی۔ اور ہیری نہیں رہا تھا۔ وہ بس اچانک ایک رات مر گیا تھا۔ اپنے مالک کے بغیر۔ وہ بس چند ہفتے ہی گزار سکا۔
فارس کی بہت سی باتیں تھیں جو وہ بتاتی رہیں۔ رک رک کر لفظ ادا کرتے ہوئے۔ برٹش ایکسنٹ کی سمجھ اسے بس اس لیے آنے لگی تھی کہ فارس کی بیوی تھی۔ (اس سے جو سنتی تھی)۔ ان سے مل کر باہر آئی تو ہال میں کئی تصاویر نے متوجہ کر لیا۔ وہ دیکھتے ہی رک گئی۔ چند ایک میں فارس بھی تھا۔ کینے کے سامنے۔ اور کلائمبنگ سنٹر میں اپنے کسی کے ساتھی کے ہمراہ۔ اس کے برابر میں کھڑا دراز قد، سرخی مائل شیڈ دیتے سیاہ بالوں والا نوجوان جنت کی نگاہوں کا مرکز بن گیا۔ سیاہ فریم والے چوکور گلاسز تھے۔ بال ہلکا سا کرلی اور خم لیے تھے۔ آنکھیں گہری اور تاریک نظر آتی تھیں۔ اس کی مسکراہٹ ہر تصویر میں ہی داہنے گال کی جانب اٹھی ہوئی تھی۔ گڈ لکنگ تھا۔ فارس سے غالباً وہ دو چار سال ہی بڑا ہوگا۔ اس نے خود سے اندازہ لگایا۔ لیکن دیکھنے میں ہم عمر ہی لگتے تھے۔ پھر تصویر اٹھالی۔ جس میں وہ ہیری کے ساتھ تھا۔
"یہ جادوگر ہے!" عقب میں آواز گونجی تو چونک کر مڑی۔ صوفی کی بیٹی ایما کھڑی تھی۔
"جادوگر؟"
"ہاں، بہت خطرناک والا جادوگر!" سنسنی خیز لہجہ اپناتے ہوئے وہ آٹھ سال کی لڑکی قریب آ گئی۔
"اس نے ہمارے سارے سکے غائب کر دیے تھے۔ اور جیمز کی ٹوپی سے اتنا بڑا پھول نکالا۔" وہ اس کی فین تھی۔ بڑے متاثر کن انداز میں کارنامے بتا رہی تھی۔ "وہ گرینی سے ملنے آتا ہے تو گھر میں کسی کو بھی پتا نہیں چلتا، وہ کیسے آیا۔ مام کہتی ہیں، وہ کھڑکی سے اندر آتا ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ کھڑکی سے بھی نہیں آتا۔ کیونکہ میں اور جیمن ویک اینڈ پر ساری کھڑکیاں اندر سے لاک کر دیتی ہیں اور وہ پھر بھی مل کر چلا جاتا ہے۔"
"وہ اب کہاں ہے؟"
"پتا نہیں!" ایما نے کندھے اچکائے۔ "وہ بتا کر آتا ہے۔ نہ بتا کر جاتا ہے۔"
"لیکن وہ ہماری ساری چاکلیٹس اٹھا کر لے جاتا ہے!" جیمن نے شکوہ کیا تھا۔
وہ بغور اس کی تصاویر کو دیکھ رہی تھی۔
ایک میں اس کے بال قدرے چھوٹے تھے۔ دوسرے میں گردن تک لمبے تھے۔ اور آگے سے خم کھاتے پیشانی پر گرے ہوئے تھے۔ تیسرے میں زیادہ گھنگھریالے لگ رہے تھے۔ وہ ہیئر ڈائی کرتا تھا۔ کچھ اس طرح سے کہ سیاہی مائل بالوں میں سرخ شیڈ نظر آتا تھا۔ ہر تصویر میں ایک سی مسکراہٹ، آنکھوں کا ایک ہی تاثر۔ کھڑے ہونے کا ایک ہی انداز۔ یوں جیسے جان بوجھ کر ہی وہ مخصوص سا پوز دیتا ہو۔ اور چند ایک میں وہ فارس کے پہلو میں کھڑا تھا۔ ان میں بس ایک ہی تصویر تھی جس میں سترہ سالہ

فارس کے لبوں پر مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ اسے وہ تصویر بہت اچھی لگی۔ وہ کچھ دیر تک ایما کے ساتھ باتیں کر کے بگونیا ہاؤس واپس آ گئی۔

"غالباً وہ تمہارا بہت اچھا دوست ہے۔"

"کون؟"

"راحم۔"

اس نے سر اٹھا کر جنت کو دیکھا۔

"تم اسے جانتی ہو؟"

"تھوڑا بہت جان ہی گئی ہوں!" ذرا سا مسکرائی۔

(جنت کیا جانے کون تھا راحم)

"تم اسے نہیں جان سکتیں۔"

"تم ہی بتا دو۔"

"وہ ایک مصیبت ہے۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے اپنی بیوی کو آگاہ کیا۔ جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔

اور بالکل یہی بات اگلے دن لیے چوڑے جیمز اینڈرسن نے ان کے لاؤنج میں بیٹھ کر دہرائی۔ وہ ان کے گھر دعوت پر آئے تھے۔ اس کے چھوٹے بھائی ولیم کو اس کی بات پر فوراً اعتراض ہوا تھا۔

"اس کے بارے میں ایسا کچھ مت کہو جیمز" آواز بھاری سی تھی۔ جنت نے دونوں کی بچپن کی تصویریں دیکھ رکھی تھیں۔ اب تو اتنے بڑے ہو گئے تھے کہ وہ پہچان ہی نہ سکی۔ سیاہ رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس وہ فارس کے دوست کم مشکوک سے گارڈ زیادہ لگ رہے تھے۔ ہیئر اسٹائل سے لے کر کپڑے جوتوں تک ان کی ہر ایک شے نفیس اور اسٹائلش تھی۔

ایک بزنس اور دوسرا انجینئرنگ اسٹوڈنٹ تھا۔ جو بزنس اسٹوڈنٹ تھا وہ ایک عدد رائٹر بھی تھا۔ اور جو انجینئرنگ کر رہا تھا اسے ہانٹڈ ہاؤس ڈاکومنٹریز کا بہت شوق تھا۔ جنت ان کے اسٹڈیز کیریئر کو لے کر بہت کنفیوژ ہوئی۔ (ایسے مشغلوں کے لیے وقت مل جاتا ہوگا انہیں؟)

"پڑھائی میں صفر ہیں یہ۔ دماغ ان کا ان ہی چیزوں میں چلتا ہے جو یہ بتا رہے ہیں۔" فارس نے اردو میں سرگوشی کی۔

"یہ جھوٹ بول رہا ہے!!" جیمز نے اردو میں ایک ایک لفظ دہرا کر جنت پر اپنی دھاک بٹھا دی۔

"ہم پڑھائی میں بوہٹ اچھے ہیں!!"

"انہیں اردو بھی آتی ہے۔" اس کی آنکھیں پھیلیں۔

"ہم نے راحم سے سیکھی ہے!"

وہ مرعوب ہو گئی۔

"اب جبکہ راحم یہاں نہیں ہے تو میں اس کی کوئی بھی برائی برداشت نہیں کروں گا!" ولیم نے آگاہ کر دیا۔ وہ اسے اپنا استاد مانتا تھا

"ہم تینوں میں یہ اس کا واحد جاسوس ہے جو ہماری باتیں اس تک پہنچا دیتا ہے۔" جیمز نے دوسری معلومات پہنچائی۔

"میں یہ بھی اسے ضرور بتاؤں گا۔" ولیم نے آگاہ کر دیا۔

"کیا تمہیں اس نے بتایا ہے راحم کے بارے میں؟" جیمز نے کریدا۔ جنت نے نفی میں سر ہلایا۔

"وہ دو کشتیوں پر پاؤں رکھ کر، عجیب سی پچویشن میں پھنس کر ہمیں یہ بتاتا ہے، اب یہ ہو رہا ہے اور میں یہ کرنے لگا ہوں! اور ہمیں لگتا ہے اب اس کی کہانی ختم۔ اور وہ پھر اگلے دن رابطہ کر کے بتاتا ہے میں تو زندہ ہوں۔" وہ جنت سے مخاطب تھا۔

"تم کتنے احسان فراموش ہو جیمز! تمہیں اس نے تمہارے ناول کے لیے کتنے اچھوتے آئیڈیاز دیے ہیں!"

اب کے جیمز انتہائی سنجیدگی سے جنت کی طرف متوجہ ہوا۔ "میری وہی تحریر اس وقت آٹھ پبلیشرز ریجیکٹ کر چکے ہیں!!"

جنت نے تاسف سے سر ہلایا۔

"ری جیکشن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ناکام ہو چکے ہو!" ولیم نے سمجھانا چاہا۔

جیمز نے گہری سانس لے کر کافی کا مگ پکڑا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ چہرے پر فکر مندی کے آثار تھے۔

"اصل میں اس کی راحم سے لڑائی چل رہی ہے۔ اس لیے برائیاں کر رہا ہے۔ کل تک گن گا رہا ہوگا۔"

جنت نے سمجھ کر سر ہلایا۔ اس دوران خاموشی سے ان کی بات سنتا فارس اپنے بیٹے کی طرف متوجہ رہا۔ جنت کو کھانے کا انتظام دیکھنا تھا۔ معذرت چاہتے ہوئے اٹھ گئی۔

"تمہاری یہ والی بیوی زیادہ اچھی ہے!"

"کمپیریزن کا کون کہہ رہا ہے؟" فارس نے سلگ کر پوچھا تو ولیم اس کے غصے سے خائف ہوتا پیچھے ہو گیا۔

"ویسے ہی کہہ رہا تھا!"

"سنو گائیز!" جیمز اپنے مراقبے سے نکل کر واپس آ گیا" بہت ہو گئی آنکھ مچولی!! اب وقت آ گیا ہے ہم راحم کو بلاک کر دیں۔"

ولیم نے زین کو فارس سے لے لیا۔ بچہ رویا نہیں تھا تو اسے اپنی بہت بڑی کامیابی محسوس ہوئی۔

"ہیے لٹل بڈی۔ میں ہوں انکل ولیم۔"

"کچھ کہہ رہا ہوں میں یہاں۔" جیمز کو غصہ چڑھا۔

"سن رہے ہیں۔" فارس کی بے زاری آواز آئی۔

"پہلے طے ہوا تھا ہر تین ماہ بعد۔ پھر طے ہوا چھ ماہ۔ اور اب پورا ایک سال ہونے والا ہے اور اس نے ہمیں اپنی شکل نہیں دکھائی۔ ویڈیو کالز کرتا تھ۔ وہ بھی بند کر دیا ہے اس نے۔ کیا صرف آئم فائن تھینک یو لکھ دینے سے دوستی کا حق ادا ہو جاتا ہے؟ جب وہ مسز گرانٹ سے مل سکتا ہے تو ہم سے کیوں نہیں؟؟"

"کیا سچ میں وہ یہاں آتا ہے؟" ولیم نے بھونچکا ہو کر اسے دیکھا۔ فارس کا ننھا بیٹا اس کے منہ پر ہاتھ رکھنا چاہ رہا تھا۔

"ایما سے پوچھو! ہر ویک اینڈ میں اس کی چاکلیٹس چوری ہو جاتی ہیں۔ کل بے چاری نے مجھے بتایا یہ راحم کا کام ہے۔"

"میرا نہیں خیال وہ یہاں آتا ہے!!" سینے پر بازو باندھے فارس سنجیدگی سے گویا ہوا۔

"لیکن ایما نے جو بات کہی۔ اسے بھی تو نہیں جھٹلا سکتے۔ اس نے تو اپنے کانوں سے راحم اور مسز گرانٹ کی باتیں سنی ہیں۔"

"آٹھ سال کی بچی کی کہانی زیادہ کریڈیبل ہے تم دونوں کے لیے؟" فارس نے گھورا۔

"تم شاید ایما کو جانتے نہیں ہو۔ ہمارے پڑوس میں سب سے ہوشیار اور ذہین بچی ہے وہ!!"

"اس بچی کو صرف یہ غم ہے کہ اس کے کمرے سے چاکلیٹس غائب ہو جاتی ہیں۔" فارس نے جواب دیا۔

ولیم نے سمجھ کر تائید کی۔ ساتھ ہی زین کو اوپر اٹھایا تو اس کی کھلکھلاہٹ راہداری تک گئی۔ وہاں جہاں ریان کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

"بہت فرینڈلی ہے تمہارا بیٹا! اس کا مطلب ہے تم پر تو بالکل نہیں گیا!!"

جیمز کی نظر ریان پر پڑ گئی۔

"اوہ ہیلو!!" اس نے دور سے ہاتھ ہلایا تو ریان کچھ فکر مندی سے کھڑا رہا۔ فارس نے گردن موڑ کر اسے دیکھا پھر اسے بلایا تو وہ اس کے پاس آ گیا۔ اب وہ اجنبی نگاہوں سے دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ اپنے بھائی کو بھی۔ جو ان کے پاس تھا۔ اس کی فکر ایک دم سے بڑھ گئی۔ (کہیں اس کے بھائی کو لے نہ جائیں۔)

"اس کو بتاؤ ہم زین کو ساتھ لے جانے والے ہیں!"

فارس نے آہستگی سے بتایا تو اس کے لب بھنچ گئے۔ "جانے دیں انہیں؟" اب وہ پوچھ رہا تھا۔

"نہیں!" نفی میں سر ہلایا۔ آنکھیں بھرنے لگی تھیں۔

ولیم کو شرارت سوجھی تو اٹھ کھڑا ہوا۔ "بائے بائے!!" وہ اس کے بھائی کو لے کر جا رہا تھا۔

اور اس نے ایک دم سے رونا شروع کر دیا۔ کچھ بے قراری اور خوف سے۔

"بس کرو ولیم! کافی ہے اتنا۔"

مگر ولیم نے دروازہ کھول دیا۔

"ولیم!" فارس اب کے اپنی جگہ سے اٹھ گیا تھا۔ اور اس لمحے جیمز اینڈرسن پر انکشاف ہوا فارس وجدان کو اس بچے کا رونا برداشت نہیں ہوا تھا۔

"کہیں لے کر نہیں جا رہا۔ یہ دیکھو۔ یہ واپس آ گیا ہے!" اس نے جب تک زین کو ولیم سے لے نہیں لیا تب تک ریان کا رونا بند نہیں ہوا تھا۔ سسکیاں بھرتے، ہچکیاں لیتے وہ فارس کے پاس سہم کر بیٹھا تھا۔ اس کا بھائی اب پاپا کے پاس ہے۔ بس اتنی سی تسلی تھی۔

ولیم نے معذرت خواہانہ انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ پھر اس کے سامنے جھک کر ہاتھ بڑھایا۔ دوستی کے لیے۔ ریان نے فارس کے سینے میں منہ چھپا لیا۔ دوستی نہیں کرنی تھی اسے۔

اوپن کچن سے یہ منظر دیکھتی جنت کمال مسکرا کر رہ گئی تھی۔

موبائل پر نوٹیفکیشن موصول ہوا تو فارس نے جیب سے نکال کر دیکھا۔ آرا کا میسج تھا۔

"جلد ملتے ہیں برو!"

اس نے پڑھ کر موبائل جیب میں ڈال لیا۔ وہ اب ولیم کی طرف متوجہ تھا جو اپنی یونیورسٹی کا کوئی قصہ سنا رہا تھا۔

☆☆☆

شان دار اسٹوڈیو میں کامیاب اور پرسکون زندگی کے متعلق انٹرویو دیتی پراعتماد آرزو جہانگیر مسکرا کر ہاتھ ہلاتی۔ آڈینس کے ساتھ تصویریں کھنچواتی، سائن کرتی اپنی سیکرٹری اور منیجر کے ہمراہ قدم اٹھاتی جا رہی تھی۔ سنہری رنگ کے میکسی نما لباس میں اس کا متناسب سراپا نمایاں ہو رہا تھا۔ لمبی پنسل ہیلز نے جیسے شان بڑھا دی تھی۔ اس کے براؤن بال ہلکا سا کرل لیے ہوئے اس کے دائیں کندھے پر گرے ہوئے تھے، گھنیری پلکیں اوپر کو اٹھی ہوئیں۔ خوب صورت کٹاؤ لیے لبوں پر دل فریب سی مسکراہٹ ٹھہری ہوئی تھی۔ اس کی ایک ایک چیز نفیس، قیمتی اور مہنگی تھی۔ ہاتھ ہلا کر مدھم سا مسکراتے وہ کئی دھڑکنوں کو تھما رہی تھی۔ وہ ایک کامیاب عورت تھی۔ کامیاب ماڈل۔ جس کی چال میں ایک خاص وقار سا جھلکتا نظر آ رہا تھا۔ وہ کیمرہ فلیشز کی زد میں ہاتھ ہلاتی اپنی سیاہ عالی شان گاڑی میں سوار ہو چکی تھی۔ وہ کچھ ہی دیر میں مین ٹاؤن کی ایک طویل عمارت میں اپنے ایک لگژری فلیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ اور تنہا داخل ہو رہی تھی۔ اس کی چال کا وہ وقار جو گاڑی سے لفٹ اور لفٹ سے راہداری تک تھا۔ وہ اب ختم ہو رہا تھا۔ اس کی سیدھی کمر، اوپر کو اٹھی ہوئی گردن اب جھک رہی تھی۔ اس نے اپنا مہنگا قیمتی بیگ چھوڑ دیا۔ اس کے برانڈڈ نفیس جوتے جس کی پوری دنیا میں بس تین ہی جوڑے تھے۔ انہیں کھینچ کر اتارتے کچھ بے دردی سے پھینکا، جیسے وہ اس کے تلوؤں کو جلاتے رہے ہوں۔ اب وہ کریم ٹائلز پر قدم اٹھاتی اپنے عالی شان بیڈ روم کا دروازہ کھول رہی تھی۔ وہ کمرہ ایسا تھا جیسا کسی ملکہ کا حجرہ۔

وارڈ روب نے پوری دیوار کو گھیر رکھا تھا۔ اس کے مہنگے ترین کپڑوں کا، جوتوں کا، بیگز کا کلیکشن نظر آ رہا تھا۔ اس کے جیتے گئے ایوارڈ شیشے کے اس پار سجے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنے جہازی سائز بیڈ پر ڈھے گئی تھی۔

اتنی روشنیاں تھیں اس کے اپارٹمنٹ میں۔ اور ایسی سہولیات اور آسائش کہ تنگی کا تو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

مگر اسے ہو رہا تھا۔

وہ کامیاب عورت۔

وہ آرزو جہانگیر۔

وہ لیڈی اسپرانزا۔ اس کا دم گھٹ رہا تھا۔

وہ ایک کامیاب عورت جو کامیابی، خوشی اور سکون کا ہر گر جانتی تھی۔ جسے دیکھ کر لوگ رشک کرتے تھے، جسے خوش قسمت اور خوش نصیب گردانتے تھے۔ وہ عورت اب سائڈ ٹیبل کی دراز کھینچ رہی تھی۔ ان گنت ادویات کا ڈھیر تھا جو رکھا ہوا تھا۔ وہ ہر ایک پیک سے اپنی گولیاں نکالتی جا رہی تھی۔ اس کی ہیزل آنکھوں میں سرخی تیر رہی تھی۔ پانی کے ساتھ اس نے کئی گولیاں ایک ساتھ نگل لی تھیں۔

اب وہ قیمتی نرم ریشوں والے سفید قالین پر بیٹھی تھی۔ اس نے حال میں جو انسٹا گرام پر پوسٹ ڈالی تھی وہ لائکس کا پچھلا ریکارڈ بھی توڑ رہی تھی۔ محبت بھرے کامنٹس اور میسیجز سے ڈی ایم بھر چکا تھا۔ اس کے فین اسے کتنا چاہتے تھے، اس کی محبت میں وہ کتنے پاگل تھے، نظر آ رہا تھا۔ ان کی تعداد کروڑوں میں تھی۔ وہ اسے آئیڈیالائز کرتے تھے، اس کی مثالیں دیتے تھے۔

مگر اس کے لاکھوں مداحوں پر اب ایک انسان کی نفرت بھاری تھی۔ وہ ایک انسان اس کی دولت، کامیابی اور شہرت کی ہر ایک چمک کو ماند کر رہا تھا۔

اس نے جس چیز کی بھی خواہش کی۔ ہمیشہ اسے حاصل کر کے ہی رہی تھی۔ اب جو خواہش تھی، وہ لاحاصل ہو رہی تھی۔ جو نہ دولت سے پوری ہو رہی تھی۔ نہ پیسوں سے خریدی جا رہی تھی۔

دنیا کی مہنگی ترین برانڈز کی اونر۔ جس کا شمار اب دنیا کے کامیاب ترین لوگوں میں ہونے لگا تھا۔ وہ عورت اپنے بالوں میں انگلیاں پھنسائے متوحش ہو رہی تھی۔ اس کے بیڈ روم کا منظر ایک بار پھر بدل رہا تھا۔

"وہ میرا بیٹا ہے۔ اس کی ماں صرف میں ہوں۔ اسے میں نے جنم دیا۔ نو مہینے میں نے اپنے پیٹ میں رکھا۔ وہ اس طرح۔ وہ اس طرح مجھے کیسے فراموش کر سکتا ہے؟"

وہ چیختے ہو[illegible] فارس وجدان سے ملنے شیرازی ہاؤس گئی تھی اور اس نے ملنے سے انکار کر دیا تھا۔ ملاقات جمیلہ داؤد سے ہوئی تو اس نے اپنا سارا غصہ ان پر نکالا تھا۔

"تم نے اسے بھڑکایا ہے۔ تم نے فارس کو میرے خلاف کیا ہے۔ بھلا کوئی ایسے بھی کرتا ہے اپنی ماں کے ساتھ۔؟ میری مجبوری وہ کسی طور سمجھ نہیں پا رہا! اس کے باپ نے مجھ سے اسے چھین لیا تھا۔"

وہ شدید غصے اور اضطراری کیفیت میں جمیلہ داؤد کے سامنے کھڑی زہر اگل رہی تھی۔ وہ اپنی باتوں سے۔ انداز۔ رویے اور لہجے سے کسی طور نارمل نہیں لگ رہی تھی۔ جو بات اس نے اس وقت کہی تھی۔ وہی بات وہ اس لمحے پھر سے دہرا رہی تھی۔

"میں تم سے ملنے آئی تھی۔" جمیلہ داؤد کی آواز سماعت سے ٹکرانے لگی۔ پلٹ پلٹ کر اور بار بار۔

"میں نے تم سے کہا تھا، اپنے بیٹے کو ساتھ لے جاؤ!"

بے تحاشا سرخ آنکھوں میں نمی لیے وہ اپنی جگہ تھم گئی۔

"تم نے کچھ کہا تھا مجھ سے۔ بھول گئی ہو تو یاد دلا دوں؟"

اب وہ اپنے کمرے کے وسط میں کھڑی تھی۔ یوں جیسے فضا میں معلق ہو۔

"تو یوں کہو نا کہ تم نے میرے بیٹے کو میرے خلاف کیا ہے۔ تم نے اس کے دل میں میرے لیے نفرت بھری ہے۔ تم نے اسے ورغلایا ہے۔" چیخ پڑی۔

"آرزو جہانگیر۔" جمیلہ داؤد نے اسے ٹوک دیا تھا "صرف بچہ پیدا کر دینے سے کوئی ماں نہیں ہو جاتی۔"

اس کے آس پاس عجیب سا شور اور آوازیں ابھرنے لگیں۔ کیمرے کے فلیشز۔ مائیک۔ سوالات کی بوچھاڑ۔ تالیوں کی گونج۔ ریمپ پر اس کے جلوے۔ میگزین کور پر اس کی تصاویر۔ اس کی برانڈز کی پروموشن۔ کسی شاہی خاندان سے ملاقات۔ دنیا

کے کامیاب ترین کاروباری شخصیات کی لسٹ میں شامل ہوتا اس کا نام۔

"بائیس سالوں کے بعد تمہیں یاد آیا کہ ایک بیٹا بھی ہے؟" جمیلہ داؤد اسے دیکھ رہی تھیں۔ جس استحقاق سے وہ عورت اس کے بیٹے کی بات کر رہی تھی۔ اس کا پورا وجود آگ ہونے لگا تھا۔

"وہ میرا بیٹا ہے میرا۔ میں اسے حاصل کر کے رہوں گی!"

جمیلہ داؤد سے ملاقات کے بعد اسے ایک ضد سی ہو گئی تھی اب اسے اپنا بیٹا چاہیے۔ اس کی زندگی میں اپنا وجود چاہیے۔ اس کی محبت میں اپنا حصہ چاہیے۔

"وہ کوئی چیز یا ایوارڈ نہیں ہے جسے تم جیت سکو" آواز کمرے میں گونج کر رہ گئی۔ اس کا وجود ساکت ہوا۔

"کامیابی کی سیڑھی بھی نہیں جس پر قدم رکھ سکو۔"

اس کی پلکیں لرز اٹھیں۔

"کھوئی ہوئی ایسی شے بھی نہیں جسے سالوں بعد اون کر سکو!"

وہ بے جان ٹانگوں کے ساتھ نیچے بیٹھ گئی تھی۔ آوازیں سماعتوں پر ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔

وہ ضد۔ ایک ضد۔ اور خواہش۔ محض خواہش ہی رہ گئی تھی۔ کہ جس کی پیچھے ایک دنیا مرتی تھی۔ اس کے وجود سے اس کی اولاد کو نفرت تھی۔ اور یہ نفرت اسے پاگل کر رہی تھی۔

اس وقت اسے بیٹے کو خود سے جوڑنے کا بس ایک ہی راستہ نظر آیا تھا اور اس نے وہ راستہ اپنا لیا تھا۔ وہ انٹرویوز میں اپنے بیٹے کا نام لینے لگی تھی۔ اس کی تصاویر دکھانے لگی تھی۔ اسے اپنی ذات سے جوڑنے لگی تھی۔

جانے کون سی کمی تھی جو وہ پوری کرنا چاہتی تھی۔ دنیا کی ساری محبتیں ایک طرف۔ اور سگی اولاد کی نفرت دوسری طرف تھی۔ اس کی ترجیحات میں ایک دم سے بیٹا آ گیا تھا۔ ایک کامیاب۔ خوبصورت اور ہونہار بیٹا۔ جس کی وجاہت کی لوگ تعریف کرتے تو اسے کمال اپنا لگتا۔ وہ اس کی اولاد ہے۔ وہ بتانا چاہتی۔ وہ اس کا خون ہے۔ وہ اترانا چاہتی۔

اس کی تمام کی تمام دنیا اسی دائرے کے گرد گھومنے لگی تھی۔

جو وہ چاہتی تھی۔ وہ ہو گیا تھا۔ گوگل سرچ اس کی کی اولاد کے طور پر فارس شیرازی کا نام دکھانے لگا تھا۔ وہ صرف ایک نام تھا۔ جو نظر آتا تھا۔ بیٹا کہیں نہ تھا۔ رشتے ایسے نہیں جوڑے جا سکتے تھے۔ ایسے نہیں بنائے جا سکتے تھے۔ نام کے ساتھ نام لکھ دینے سے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

جویریہ حبیب اس کی آواز سن کر دروازے پر دستک دیتی اندر آئی تھی۔ اس نے ترتیب اور نفاست سے سجے اپنے اس کمرے کا ایک بار پھر حشر بگاڑ دیا تھا۔ وہ ایک بار پھر اس حالت میں تھی کہ ہر ایک چیز کو تہس نہس کر دینا چاہتی تھی۔

"اس نے کہا، وہ مجھے نہیں جانتا!! میرے بیٹے نے کہا۔" فارس کا چہرہ آنکھوں میں آ گیا تھا۔ اس کی آواز گونج کر رہ گئی تھی۔

"میم! سنبھالیں خود کو۔" پریشانی اور فکرمندی کے عالم میں جویریہ اس کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔

"جویریہ! وہ میری اولاد ہے۔" سینے پر ہاتھ رکھے تاکیدی انداز اپنایا۔ جیسے یقین دلانا چاہ رہی ہو۔ "میرا بیٹا۔ میرا خون ہے وہ۔ اس کے انکار کرنے سے یہ حقیقت تو نہیں بدلے گی۔ کبھی نہیں بدلے گی۔ بالکل بھی نہیں۔"

نفی میں سر ہلانے لگی۔ جویریہ اسے سہارا دیتے اٹھا رہی تھی۔ کبھی نہ کبھی اس کی میڈم کی حالت ایسی ہو جاتی تھی۔ وہ ڈپریشن کی مریضہ تھیں۔ وہ سائکاٹرسٹ کے پاس ہر ہفتے جاتی تھیں۔ ادویات پر زندگی گزر رہی تھی۔ ادویات سے ہی نیند لے رہی

تھیں۔ جانے اس طرح۔ اچانک۔ انہیں کیا ہو جاتا تھا۔ وہ بھری دنیا کے سامنے کچھ اور ہوتی تھیں۔ تنہائی میں کچھ اور۔ جویریہ تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"وہ آپ سے نہیں ملنا چاہتا۔ آپ اس بات کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔"

"مجھے تنہائی کا احساس ہوتا ہے۔ میرے خیال سے مجھے۔ مجھے حبیب سے بات کرنی چاہیے۔ میں عیسیٰ کو اپنے پاس بلا لیتی ہوں۔ ہاں۔ یہ ٹھیک رہے گا۔ فارس نہیں۔ عیسیٰ تو ہے۔" اٹھ کر عجلت میں اپنا موبائل اٹھالیا۔

"میم!" جویریہ حبیب کے لب ہلے۔

"منصور سے کہتی ہوں۔ وہی سب مینج کرے گا۔"

"میم! عیسیٰ مر چکا ہے۔"

موبائل فون کان سے لگائے اپنے تمام تر جوش کے ساتھ وہ ایک دم سے ساکت ہوئی۔ موبائل کان سے لگائے چند لمحوں تک کھڑی رہی۔ آنکھوں میں تفکرات کی پرچھائیاں لہرائیں۔ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر خود پر حیران ہوئی کہ وہ کیسے بھول گئی۔ عیسیٰ کی وفات کو پورے نو سال ہو چکے تھے۔ یہ بات اس کے ذہن سے کیسے نکل گئی۔ ؟؟؟ کیا ہوتا جا رہا ہے اسے؟

جویریہ حبیب کو اب کے بہت زیادہ تشویش ہونے لگی تھی۔ اس مختصر عرصے میں یہ تیسری بار ہو رہا تھا کہ وہ عیسیٰ کو اس طرح سے یاد کر رہی تھی۔

"عیسیٰ تو مر چکا ہے!!" زیر لب دہراتی نیچے بیٹھ گئی۔ پانچ سال کا فارس۔ تین سال کا عیسیٰ۔ جب وہ انہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ اسے پتا نہیں کیوں خیال آیا اس کے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔

پیشانی مسل کر سر اٹھایا۔ کمرے کا منظر پھر سے بدل چکا تھا۔ اسے آس پاس بہت سے کھلونے بکھرے ہوئے دکھائی دیے۔ فارس کی چھوٹی سی کاریں۔ عیسیٰ کے جہاز، اور ٹیڈی بیئرز، اس کی چھوٹی سی سائیکل۔ ٹی وی پر چلتے کارٹونز کا شور۔ خالی صفحے پر قلم گھسیٹ کر رنگ بھرتا۔ اپنی پیشانی پر بکھرے بالوں کو ہٹاتا فارس۔

"ماما!"

اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ آواز کی سمت۔ وہ سفید شارٹس پر سیاہ شرٹ پہنے سیڑھیوں کی طرف بھاگا تھا۔ پھر وہ اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا تھا۔

اسے یہ سب کیوں یاد آ رہا ہے؟ آرزو کی آنکھوں میں عجیب وحشت سی اتر آئی۔

حبیب عیسیٰ کو اٹھائے کھڑے تھے۔ عیسیٰ شدت سے رو رہا تھا۔ اور وہ اپنا بیگ گھسیٹتی، گلاسز آنکھوں میں ٹھہراتی بیرونی گیٹ عبور کر رہی تھی۔ طلاق ہو گئی۔ رشتہ ختم۔ تعلق ختم۔ سب ختم۔

"آپ کو آرام کی ضرورت ہے آپ سو جائیں۔" جویریہ حبیب کہہ رہی تھی۔ مگر وہ اپنے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔

عیسیٰ کاٹ میں تھا۔ فارس اس کی گود میں بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ عجیب سا سکون رگ و پے میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے بے بی کاٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو عیسیٰ وہاں نہیں تھا۔ فارس کی آواز ایک دم سے ختم ہو گئی۔

"فارس!"

آواز کے تعاقب میں وہ قدم اٹھاتی دوسرے کمرے تک گئی اور ٹھٹھرا کر رک گئی۔ اس نے تین سالہ عیسیٰ کو دیکھا۔ اس کا پورا وجود بھیگا ہوا تھا۔ وہ نیچے بیٹھا تھا۔ اور اپنے جھولے کو خود ہی ہلا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ۔ اس کے کپڑوں سے ابھی بھی پانی ٹپک رہا تھا۔

اس کے رگ و پے میں خوف کی لہر سرایت کر گئی۔ اس نے روتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ لیے۔

"میم!" جویریہ حبیب نے کندھوں سے پکڑ کر

ہلایا تھا۔ آرزو جہانگیر کی آنکھوں سے وحشت ٹپکتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

مجھے یہ سب کیوں نظر آرہا ہے؟ اس کا وجود کپکپا رہا تھا۔

جویریہ حبیب ترحم بھری نگاہوں سے اسے دیکھتی پیچھے ہٹ گئی تھی۔

اسے گمان ہوا۔

وہ فکرمندی کے عالم میں تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

"ڈاکٹر کو کال کرو!" وہ کسی سے کہہ رہی تھی۔ آرزو جہانگیر کارپٹ پر لیٹ گئی۔ اپنے آپ میں سمٹ کر اس نے اپنے گرد بازو باندھ لیے۔

کمرے میں اس کی مدھم سی آواز ابھی بھی گونج رہی تھی۔

وہ لوری تھی۔ جو وہ بچوں کو سنا رہی تھی۔

"فارس۔ وہ ذرا زین کو پکڑو۔ جلدی سے پکڑو۔" بیٹھے بیٹھے چیخی۔ وہ کپڑے بدل کر ڈریسنگ روم سے نکلا تھا۔ تاسف سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ باہر جا کر اپنے ولی عہد کو پکڑ کر لے آیا۔ وہ اس کے بھی قابو میں نہیں آرہا تھا۔ جب سے اس نے چلنا شروع کیا تھا تو تب سے کچھ یہی حالات تھے۔

جنت ریان کے کپڑے بدل کر مڑی تو فارس نے اسے اس کے حوالے کیا۔ وہ ایک دم سے چیخنے لگا۔ چاہتا تھا کہ اسے فرش پر چھوڑ دیا جائے اور وہ جس طرح مرضی چاہے، چیزوں کو چھیڑے، چیخے، چلائے بھاگے۔ رات بھر سو کر صبح تک فل بیٹری چارج تھی اس کی۔

"میں تو بہت ڈیسنٹ بچی تھی۔ بالکل شور نہیں کرتی تھی۔" فارس نے آئینہ کے سامنے اپنے اور پھر ریان کے بال بناتے ہوئے اس کی نقل اتاری۔

"تو یہ کیسے طے ہوا کہ تم بچپن میں ایسے نہیں تھے!" چڑ کر کہا۔

"میں قطعاً ایسا نہیں تھا!"

وہ بڑبڑا کر رہ گئی۔

جلدی سے اپنی تیاری مکمل کر کے ریان کو ساتھ لیے باہر آیا تو مسز شیرازی ڈائننگ ٹیبل پر اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

"گڈ مارننگ می!" مسز شیرازی کو جا کر کہا۔

جنت زین کے کپڑے بدل کر کچھ ہی دیر میں آگئی تھی۔ اسے کرسی پر بیلٹ میں جکڑ کر بٹھایا۔ اب وہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر "پاپا" کیے جا رہا تھا۔ جنت نے گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ مگر فارس اسے اپنی گود میں اٹھا چکا تھا۔ ہاتھوں میں بریڈ کا چھوٹا سا ٹکڑا پکڑا دیا۔ لیکن اسے اب وہ چیزیں بھی کھانی تھیں جو باقی سب کھا رہے تھے۔

"زین! یہ لو!" ایسے موقعوں پر ریان اپنے ہاتھوں سے اسے کھلانے کی کوشش کرتا تھا۔ اب وہ یہی کر رہا تھا۔

"۔ تم آفس کے لیے لیٹ ہو جاؤ گے۔" جنت نے زین کو فارس سے لے لیا۔ اسے سیریلیک کھلانے لگی۔ ناشتے کی میز پر کافی رونق لگی ہوئی تھی۔ جمیلہ داؤد مسکراتے ہوئے ریان کی باتیں سنتی رہیں۔ ناشتے کے بعد وہ اسے باہر کی آف کرنے کے لیے گئے۔ اور واپسی پر وہ اسے دروازے پر منتظر سے نظر آئے۔ کپڑے بدل کر اس نے کچھ وقت بچوں کے ساتھ گزارا پھر جمیلہ داؤد کے اسٹوڈیو میں چلا گیا۔ جنت بھی وہیں تھی۔

برابر والا کمرہ ان کا پلے روم تھا۔ ریان زین کو ساتھ لیے اندر کھیل رہا تھا۔ ان کے کھلونوں کی الماری کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ زین نے ایک ایک کر کے سارے کھلونے نکال دیے۔ خود اندر گھس گیا۔ پھر دروازے کو آگے پیچھے کرتے ہوئے ریان سے چھپتا ہوا کھلکھلانے لگا۔ ریان کو بھی مزا آنے لگا۔ وہ الماری کا دروازہ کھول لیتا۔ پھر بند کر دیتا۔ زین کو لگتا وہ غائب ہو گیا ہے۔ پھر اسے لگتا وہ نظر آرہا ہے۔ اسے خوشی ہوتی۔ وہ ہنسنے لگتا۔ انہی شرارتوں میں دروازہ اتنی زور سے بند ہوا کہ پھر کھلا ہی نہیں۔ اب

زین صاحب اندر تھے۔ اور ریان باہر۔

"ایا (ریان)۔ !!" زین نے اٹھ کر اپنے دونوں ہاتھ الماری کے پٹ پر رکھ کر بجائے۔ ریان نے باہر سے کھولنے کی کوشش کی۔ نہیں کھلا۔ پھر ہینڈل پر گرفت جما کر کھینچا۔

زین بڑے آرام سے بیٹھ گیا۔ (بڑا بھائی ہے نا باہر!!)

اور باہر ریان شیرازی کا چہرہ سرخ پڑنے لگا۔ آنکھیں بھرنے لگیں۔ دھیمی دھیمی سسکیوں کے ساتھ زین کو آواز دی۔ کہ دروازہ تو کھل ہی نہیں رہا تھا۔ اور سامنے اسٹوڈیو روم میں جمیلہ داؤد کے پاس بیٹھی جنت کہ لیان سے بات کرتے ہوئے ایک دم سے چپ ہوئی تھی۔

"یہ صرف مجھے عجیب لگ رہا ہے یا تمہیں بھی؟" اس نے فارس سے پوچھا تو اس نے موبائل سے سر اٹھایا۔ زین اور ریان اپنے پلے روم میں اور اتنی خاموشی؟

دونوں ہی ایک دم سے بوکھلا کر اٹھے تھے۔ پلے روم میں داخل ہوئے تو ریان سسکیاں بھرتے ہوئے نظر آیا۔

"زین کہاں ہے ریان؟"

"زین۔ اندر۔" اس کی آنکھوں میں ایک دم سے خوف اور دہشت اتر آئی تھی۔ اور وہ جانے نہیں کیوں چیخ کر رونے لگا تھا۔ جنت نے گھبرا کر فورا سے الماری کھولی تو بند آنکھوں کے ساتھ زین ساکت سا نظر آیا۔ کہیں اسے کچھ ہو نہ گیا ہو۔ پریشانی کے عالم میں اٹھا کر سینے سے لگایا تو تو معلوم ہوا نیند میں تھا۔

"اللہ!!!" اس نے سکھ بھری سانس لیتے ریان کی طرف دیکھا۔ جو ہچکیوں کے ساتھ روتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ فارس اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ اس کی گرفت میں آنا نہیں چاہ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟"

جمیلہ داؤد بھی پریشانی کے عالم میں وہیں آ گئی تھیں۔

جنت نے بیڈ پر زین کو لٹا کر موبائل نکالا۔ ان کے کمرے میں گزشتہ بیس منٹ کی ویڈیو نکالی۔ اتنے آرام سے کھیلتے کودتے شرارتی زین نے الماری کا رخ کر لیا تھا۔ اور بے چارہ ریان کتنی دیر تک اپنی طرف سے الماری کا دروازہ کھولنے میں لگا رہا تھا اور پھر وہ رونے لگا تھا اور ابھی تک بھی رو رہا تھا۔ وہ تین سال کا تھا۔ اتنی سمجھ اس میں بھی تھی، کچھ غلط ہوا ہے۔

"ریان!!" جمیلہ داؤد نے متفکر سا اسے پکارا۔

فارس نے اسے بیڈ پر سامنے بٹھا لیا تھا۔

"کیا ہوا۔ بتاؤ کیا ہوا۔ کیوں رو رہے ہو!!،"

اس کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ اب جنت اور فارس دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ جنت نے پھر اسے سینے سے لگا لیا۔

"پاپا آپ ماتے (مارتے)۔ آپ مجے (مجھے) ماتے!!؟" اس کا سسکیوں کی زد میں پوچھے جانے والا سوال فارس کے اندر سناٹا پھیلا گیا۔ "میں کیوں ماروں گا؟؟"

اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر آنسو صاف کیے۔

"مونا پاپا نے۔ مونا کو مارا!! زور سے۔ مارا!!"

مونا ان کے پڑوسی اکرام صاحب کی نواسی تھی۔ بہت شرارتی تھی۔ دو روز قبل ہی زید کے ساتھ ریان بھی ان کے گھر گیا تھا۔ ذرا سے سوال جواب کیے تو معلوم ہوا مونا نے اپنے چھوٹے بھائی کو سیڑھیوں سے دھکا دے کر گرا دیا تھا۔ اور اس کی حرکتوں سے عاجز اس کے پاپا نے ریان کے سامنے ہی اسے تھپڑ مار دیا تھا۔ یہ بات بھی ذہن میں بیٹھ گئی۔ زین الماری میں بند ہوا تو اسے لگا پاپا اسے بھی منہ پر ماریں گے۔

فارس نے بے اختیار سانس بھر کر اپنے بھتیجے کو دیکھا۔ جنت نے کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے جوس میں منہ ڈال دیا تو وہ سنبھل کر گھونٹ لینے لگا۔ پھر اسے

بہت پیار سے سمجھایا گیا کہ مما، پاپا اسے کبھی بھی نہیں ماریں گے۔ اور یہ کہ مونا کے پاپا الگ ہیں۔ اس کے پاپا الگ ہیں۔ اور ریان تو مونا جیسا شرارتی بھی نہیں ہے۔ وہ تو اتنا پیارا ہے۔ شور کرتا ہے۔ نہ شرارتیں کرتا ہے۔ اور اپنے بھائی کا بہت خیال رکھتا ہے۔

اس طرح پیار اور نرمی سے چھوٹے چھوٹے لفظوں میں سمجھانے پر وہ کچھ حد تک سنبھل گیا اور سو گیا۔

☆☆☆

ریان کا کنڈرگارٹن میں داخلہ ہوا تو ابتدائی کچھ دنوں تک اس نے بہت تنگ کیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی مما پاپا سے دور نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن جب فارس نے کنڈرگارٹن سے پک کر کے اپنے آفس لے جانا شروع کیا تو وہ سنبھل گیا۔ اب وہ کنڈرگارٹن اس لیے جاتا تھا کیونکہ اسے پھر پاپا کے ساتھ آفس جانا ہوتا تھا۔

اس دن اپنے پلے روم میں ریان اپنا ننھا بیگ اٹھا لایا۔ سمجھ داری سے زپ کھول کر اپنی کلرنگ نکالی۔ پھر رنگ بھی سامنے رکھ لیا۔ زین اس کے پاس آ گیا۔

وہ چاہتا تھا ریان اس کے ساتھ کھیلے۔ مگر ریان اب سکول گوئنگ بچہ تھا۔ اسے زرافہ میں رنگ بھرنے کا پہلا ہوم ورک ملا تھا۔ یہ کام بہت ضروری تھا۔ وہ کیسے کھیل سکتا تھا۔

زین اس کی نوٹ بک پر لیٹ گیا۔

وہ ایک دم سے سر اٹھا کر چیخا، پھر اپنی نوٹ بک کھینچنا چاہی تو صفحہ پھٹ گیا۔ اور پھر۔

"پاپا!" وہ زارو قطار روتے ہوئے فارس کی اسٹڈی میں گیا۔ نوٹ بک ہاتھ میں تھی۔ صفحہ پھٹا ہوا تھا۔ غم سے نڈھال۔

فارس اپنی لیگل ٹیم سے معذرت کرتے ہوئے اسے اٹھائے باہر آ گیا۔

اس نے روتے سسکتے زین کی پوری کارستانی سنائی۔ اپنی نوٹ بک دکھائی۔ اس کے آنسو صاف کرتے، دلاسا دیتے وہ واپس ان کے کمرے میں آیا تو زین صاحب ندارد تھے۔

فارس نے اس کو نیچے اتار کر کھلونوں کی الماری کھولی پھر بیڈ کے پاس آ کھڑا ہوا، جھک کر، فرش کے ساتھ لگ کر دیکھا تو وہ بگڑے تیوروں کے ساتھ خفا خفا سا دیوار کی طرف رخ کیے لیٹا تھا۔ اب اس نے تو نوٹ بک نہیں پھاڑی تھی۔ وہ تو نوٹ بک پر صرف لیٹا تھا۔

"زین باہر آؤ!"

خاموشی۔

"زین!" لہجہ ذرا سا سخت۔ مگر خاموشی۔

"میں تین تک گنوں گا۔ اگر تم باہر نہ آئے۔ تو پنشمنٹ ملے گی۔"

آنکھیں رگڑتے، سسکتے ریان نے ذرا سا گھبرا کر فارس کو دیکھا۔

"ایک!"

اس کا ننھا دل دھڑکا کہ زین کو پنشمنٹ ملے گی۔ اپنا غصہ اور ناراضی بھول گیا۔

بیڈ کے پاس گھٹنے ٹکا کر، فرش سے گال مس کر کے، ہاتھ پھیلا کر اسے پکارا۔

"زین۔ بائی (بھائی)۔ آؤ باہر آؤ!!" اسے پیار سے، اور بڑوں کے سے انداز میں پکارا۔ پھر خود میں بھی فرش کے ساتھ لگ کر بیڈ کے نیچے چلا گیا۔

فارس نے گہری سانس لے کر پیشانی مسلی۔ ہر دوسرے دن اسے ان کی ناراضی اور محبت کا عملی مظاہرہ دیکھنے کو ملتا تھا۔

"زین!"

فارس نے اپنا ہاتھ بڑھا کر، اس کا پیر پکڑ کر کھینچا تو وہ شور کرنے لگا۔ وہ رونا چاہتا تھا، لیکن جس طرح فارس نے اسے کھینچ کر باہر نکالا تو اسے بہت مزا آیا۔

فارس نے بازوؤں سے پکڑ کر مصنوعی خفگی سے جھنجھوڑا تو کھلکھلا اٹھا۔ لیکن سزا اسے بہرحال جھیلنی پڑی۔ پھر اس نے جنت کو جا کر شکایت لگائی، اپنی

دادو کو۔ ضوفشاں کے ساتھ ساتھ اپنی دل عزیز "اذکا" کو بھی۔

"پاپا!"۔ نام لے کے پھر کچھ اشارے۔ کرتا۔ اور غیر مفہوم سی آوازیں اور لفظوں میں بتاتا۔ وہ ٹھیک سے بول نہیں سکتا تھا لیکن سب کو سمجھ آ رہا تھا وہ کہنا کیا چاہ رہا ہے۔

"آئندہ میرے بیٹے کو کچھ کہا تو اچھا نہیں ہو گا۔"

رجیلہ داؤد نے اسے سینے سے لگا کر فارس کو خفگی بھرے انداز میں ڈانٹا تو وہ مسکراتے ہوئے سر جھکا گیا۔

☆☆☆

دبیز تاریکی میں فلیش لائٹ کی تیز روشنی آدھی کھلتی بند ہوتی آنکھوں پر پڑی تو کچھ اذیت سے میچ کر اس نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ وہ جس کرسی پر بیٹھا تھا اس کے پیچھے ہاتھ سختی سے بندھے ہوئے تھے۔

فرینک فرٹ کی طویل القامت زیر تعمیر عمارت کی کوئی چھٹی یا ساتویں منزل ہوگی۔ دائیں طرف پلرز سے آگے تاریک شہر کے دامن میں فلک بوس عمارتوں پر جلتی بجھتی اور ٹھہری ہوئی کئی روشنیاں اور رنگ تھے۔ نقطوں کی صورت۔

پیشانی سے گال تک۔ بہتی ہوئی خون کی دھار اب کالر پر رنگ چھوڑ رہی تھی۔

سیاہ فام نے دو تین بار فلیش لائٹ چمکا کر بند کر دی۔ اکلوتا بلب جو سر پر تھا روشن ہو گیا۔ وہ تین لوگ تھے۔ ان میں ایک سیاہ فام تھا۔ ہٹا کٹا سا۔ اور باقی دو ولڑ کے تھے۔ اس نے باری باری تینوں کی شکل دیکھی۔ دو کا چہرہ تو بالکل سوجا ہوا تھا۔ تیسرے والے کی کچھ بچت ہوئی تھی۔ وہ بس لنگڑا کر چل رہا تھا۔ تینوں بالکل الرٹ اور محتاط ہو کر اسے گھیرے کھڑے تھے۔ ایک نے تو باقاعدہ گن بھی تان رکھی تھی۔

"کیا ہے یار! مل بیٹھ کر آرام سے مسئلہ حل کر لیتے ہیں۔" لہجہ دوستانہ تھا۔ موجودہ صورت حال کا اثر تاثرات پر تھا۔ نہ ہی چہرے پر۔

یکا یک فون بج اٹھا۔ کال ریسیو کر کے کسی کو "رحیم آفاق" کی خبر پہنچائی گئی۔ دوسری طرف سے انہیں ایک حکم دیا گیا۔ سیاہ فام نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر باقی دو ساتھیوں کو۔

بات ختم کر کے اس نے اپنے دو ساتھیوں کو سرگوشی میں کچھ کہا۔ ایک کو وہاں رکنا تھا اور بقیہ دو باہر پہرے کا سوچ رہے تھے۔

"تو کس کے حکم پر کام کر رہے ہو تم لوگ ہنری کے؟ فیصل؟؟ یا پھر سمان نے بھیجا ہے؟؟؟"

تینوں نے سوال سنا۔ جواب نہ دیا۔ وہ سمجھ گیا، اس کے ساتھ بات چیت سے انہیں روکا گیا ہے۔ وہ اب ان کے چہروں کے تاثرات پڑھ رہا تھا۔

"فیصل کا کام لگتا ہے مجھے۔ یقیناً اس نے ہائر کیا ہوگا تم لوگوں کو۔!" اپنی طرف سے اندازہ لگا کر مطمئن انداز میں سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔

"کیا فیصل نے تم تینوں کو بتایا ہے۔ وہ کس کے لیے کام کرتا ہے؟ یا اس نے مجھے پکڑنے کا کیوں کہا ہے؟"

"اپنا منہ بند رکھو ورنہ گولی سے تمہارا بھیجا اڑا دوں گا!" کرخت لہجے میں دھمکی دے کر سیاہ فام نے پلر کے پاس رک کر نیچے ویران سی سڑک پر دور تک کسی گاڑی کے نشان ڈھونڈنا چاہے۔

"اڑا دینا۔ گولی بھی چلا لینا۔ لیکن پہلے اپنی فکر کرو۔ یہاں سے آج تم تین بھی زندہ بچ کر نکلنے والے نہیں ہو!"

بے پرواہ سے لہجے میں کہہ کر اس نے اپنا سر جھٹکا۔

"تم ہماری گرفت سے بچ کر نہیں نکل سکتے!" سیاہ فام کی غراہٹ اس کے قریب سے گونجی تھی۔

"کس نے کہا، میں نکلنا چاہتا ہوں؟ مجھے ویسے بھی پرواہ نہیں تم لوگ مجھے ہنری کے حوالے کرتے ہو یا فیصل کے۔"

تینوں نے ناسمجھی کے عالم میں ایک دوسرے کی شکل دیکھی تھی۔ "یہ تو طے ہے کہ وہ میری جان نہیں

لیں گے۔ لیکن تمہارے ساتھ جو سلوک کریں گے۔ اس کی فکر ہو رہی ہے مجھے۔" اس کی مسکراہٹ ایک دم سے گہری ہو گئی تھی۔ آنکھوں کا تاثر عجیب سی پراسراریت میں ڈھل گیا۔

" کہنا کیا چاہ رہے ہو تم؟" جس نے پستول تانی تھی۔ سوال بھی اسی نے کیا۔ وہ بھول گیا تھا کچھ دیر پہلے تک فون پر اسے راحم آفاق سے کوئی بھی بات نہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

" یہی کہ مجھے پکڑ کر تم تینوں نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی ہے۔"

بات واضح نہ تھی۔ سمجھ سے باہر ہو گئی۔

" تمہیں ہم بے وقوف لگتے ہیں۔"

اس نے پورے یقین کے ساتھ اثبات میں سر کو جنبش دی۔ اس سے پہلے کہ سیاہ فام غصے میں اسے ایک اور مکا رسید کرتا کہ وہ ایک دم سے چیخ اٹھا۔

"رکو۔ رکو۔ ایک سیکنڈ۔ بات تو سن لو میری۔"

سیاہ فام نے رک کر اسے گریبان سے دبوچ لیا تھا۔

اس نے بھی سسپنس کی انتہا کرتے ہوئے فرفر بولنا شروع کر دیا۔ وہ راحم آفاق۔ ایک ہیکر تھا۔ اسے فیصل کے باس نے چھ ماہ پہلے گھر کا سیکیورٹی سسٹم ڈیزائن کرنے کے لیے ہائر کیا تھا۔ لائبریری میں ایک خفیہ دروازہ کسی کتاب کو حرکت دینے پر کھلتا تھا اور وہ کتاب باس کے بیڈ روم میں رکھی گئی تھی۔ اس کے عالی شان کے گھر کے وسط میں ایک باغ تھا۔ اس باغ میں بیری کے درخت کے نیچے چار لاشیں دفن تھیں۔

ایک تو اس کی معشوقہ تھی۔ دوسرا اس کا کوئی قریبی دوست تھا۔ اور بقیہ دو لاشوں کا اسے علم نہ تھا۔ پھر اس نے بتایا کہ وہ کتنا مجبور اور غریب تھا اور اس کی ماں بیمار تھی اور علاج کے لیے پیسے چاہیے تھے۔ اور اسے نہ چاہتے ہوئے یہ کام کرنا پڑا۔

اس نے تفصیل سے بتایا، کیسے وہ اس گھر میں گیا!! اور کیسے ان کی ڈیل ہوئی۔ اور کیسے وہ حقیقت منکشف ہو جانے پر اسے جان سے مارنا چاہتے تھے۔ کہانی سنانے والا جذباتی تھا اور وہ تینوں سادھے اسے سنتے گئے۔

اس نے پاس ورڈ سے لے کر، سیف، خفیہ دروازے اور چھپے ہوئے کسی تہہ خانے تک کی معلومات انہیں بتا دی تھیں۔ کچھ ایسے رازوں سے پردہ ہٹا دیا جس سے آنکھوں میں دہشت آ گئی۔ اور کچھ ایسے کارناموں سے بھی آگاہ کر دیا جو خطرے سے خالی نہیں تھے۔

اور وہ تینوں اپنے کلائنٹ کی ہر معلومات سے بے خبر اسے صدمے سے تکے جا رہے تھے۔ کیا وہ اتنے خطرناک آدمی کے لیے کام کر رہے ہیں؟ سماعت پر یقین نہ آیا۔ کہ جس نے ہائر کیا تھا خاصا معقول آدمی لگا تھا۔

"ان سب باتوں کا ہم سے کیا لینا دینا؟؟

"اکھڑ پن سے، کرختگی سے سوال اچھالا گیا۔ کہ انہیں بس ایک نوجوان کو پکڑ کر کسی کے حوالے کرنا تھا۔ اور اپنی مطلوبہ رقم حاصل کرنی تھی۔ بات ختم۔!!

" کیونکہ یہ راز مجھ تک ہے تو وہ میرے پیچھے ہیں۔ جب انہیں پتا چلے گا، تم لوگوں کو بھی میں نے سب کچھ بتا دیا ہے تو وہ زندہ تو تمہیں بھی نہیں چھوڑیں گے۔" وہ ہنسا تھا۔ اور ان تینوں کے پیروں سے زمین نکل گئی تھی۔ اتنی توجہ سے ساری باتیں سننے پر انہوں نے خود کو لعنت ملامت کی۔

" کیا بکواس ہے یہ؟"

" کوئی بکواس نہیں۔ بس آنے دو انہیں۔ یہاں ایک نہیں۔ چار چار لاشیں گریں گی۔" ان کے سر پر بم پھوڑ کر مسکرایا۔ کوئی ٹینشن فکر سرے سے نہ تھی۔

اچانک کہیں گاڑی کے ٹائر چرچرائے۔ سیاہ فام نے جھک کر نیچے دیکھا تو وین سے کچھ سوٹڈ بوٹڈ لوگ نکلتے نظر آئے۔ تعداد میں وہ چھ تھے۔ اسے زندگی میں پہلی بار سچ مچ میں خطرے کا احساس ہوا۔ کام بس چھوٹا سا تھا۔ اسے راحم آفاق کو زندہ سلامت ان کے حوالے کر کے اپنا معاوضہ لینا تھا اور پھر اپنے دو

ساتھیوں کے ساتھ یہاں سے چلتے بننا تھا لیکن جو خوفناک نقشہ راحم آفاق نے کھینچا تھا، اسے مدنظر رکھتے ہوئے اب اسے ایک دم سے یہ سب بہت مشکل لگنے لگا تھا۔ نہ اس نے کبھی اپنے ہاتھ خون سے رنگے تھے۔ نہ وہ یہاں کسی اور کو رنگنے دے سکتا تھا۔

"برو! میں نے بولا بھی تھا یہ کام ہمارے بس کا نہیں ہے!" سرخ جیکٹ والا لڑکا گھبرا گیا۔

چار ماہ پہلے تک وہ کسی باکسنگ کلب کے ساتھ جڑے رہے تھے۔ پھر کسی چھوٹی سی بدمزگی پر کلب انتظامیہ نے انہیں نکالا تو انہوں نے انتقاماً تہیہ کر لیا ،وہ پیسہ کما کر اپنا باکسنگ کلب تعمیر کریں گے۔ اب پیسہ ایک ہی دن میں نہیں کمایا جا سکتا تھا سو پارٹ ٹائم جابز کرتے کرتے وہ فیصل کے ہتھے چڑھ گئے جنہیں کچھ باکسرز کی تلاش تھی۔ کام آسان تھا کہ کسی لڑکے کو پکڑ کر ان کے حوالے کرنا تھا اور بدلے میں وہ انہیں معقول رقم آفر کر رہے تھے۔ اور اب جب سارا کام ہو چکا تھا تو انہیں اپنی زندگی خطرے میں پڑتی ہوئی نظر آنے لگی۔

" آنے دو انہیں۔ بالکل آنے دو انہیں۔ "
راحم آفاق گنگنا رہا تھا

"تم نے ہمیں کچھ نہیں بتایا ہے۔" بیس ہزار ڈالر کی رقم آنکھوں میں لہرائی تو وہ غرایا۔

" سب بتا دیا ہے ، اور ان کے سامنے بھی بتاؤں گا!! بار بار دہراؤں گا۔"

" وہ اوپر آ رہے ہیں۔" تیسرے لڑکے نے متوحش ہو کر اطلاع پہنچائی۔ اس سے پہلے کہ کوئی کچھ کہتا۔ سیاہ فام نے اشتعال میں پستول کا بٹ اس کے سر پر دے مارا تھا۔ شدید ضرب سے راحم سر گھوم کر رہ گیا۔

" کھول دو اسے۔"

نیچے سیڑھیوں پر عجلت میں قدم اٹھاتے بھاری جوتوں کی آواز واضح ہونے لگی تھی۔

وہ جو بڑی مشکل سے پکڑ کر اسے باندھ کر لائے تھے۔ اس کے ہاتھ کھولتے ، ، کار سے پکڑ کر دوسرے دروازے کی جانب دھکیلتے ہوئے باہر کو بھاگے۔

عجلت میں ایمرجنسی آہنی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ بیرونی دیوار کے ساتھ لگ کر آہنی راڈز پر گرفت جمائے عمارت سے نچلی منزل کا رخ کرتا نظروں سے کچھ دیر کے لیے اوجھل ہوا۔ اس کا سراپا پھر دوسری منزل پر نمودار رہا۔ دیوار پھلانگ کر وہ کچھ ہی دیر میں کھڑکی سے باہر تھا۔

سامنے عمارت کی منزل سے دوربین سے اس کی تمام کارروائیوں کو ملاحظہ کرتے، سختی سے بھینچے ہوئے لبوں میں جنبش ہوئی تھی۔

"ان گدھوں کو کہا بھی تھا، اس سے بات مت کرنا!!"

ان تین لوگوں کو پچھلی سڑک سے جاتے ہوئے دیکھا جا سکتا تھا۔

اوپن مال کی طرف لوگوں کے ہجوم میں گم ہوتے ہوئے راحم آفاق دائیں جانب ایک دکان کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

کچھ ہی دیر میں وہ سامنے کے دروازے سے باہر تھا۔ اب نہ جیکٹ وہ تھی، نہ حلیہ، اور نہ ہی چال۔ وہ اب ایک ادھیڑ عمر بیمار اور نحیف سا بوڑھا تھا جو کپکپاتے ہوئے ، بری طرح سے کھانستا ہوا سست روی سے قدم اٹھا رہا تھا۔

" کہاں گیا؟"

" تم اس طرف دیکھو۔ میں اس طرف جاتا ہوں۔ اور تم۔ وہاں سامنے!! " حکم ملتے ہی وہ اس کی دائیں بائیں سے لوگوں سے راستہ بناتے نکل گئے تھے۔ ہیٹ کے نیچے سر جھکا ہوا تھا۔ راحم آفاق کے لبوں پر مسکراہٹ سج گئی تھی۔

اور آنکھوں کی چمک خطرناک حد تک بڑھ چکی تھی۔

وہ بوڑھا۔
نحیف سا۔

بیمار اور کھانستا ہوا۔ اسی راہداری سے نکل کر جا چکا تھا۔

☆☆☆

ہاتھ میں موبائل لیے وہ ہاسپٹل کے ویٹنگ روم میں بیٹھی تھی۔ میسج ٹائپ کرتے ہوئے اس نے اپنے برابر میں ہی خالی جگہ پر ایک نوجوان خاتون کو بیٹھنے کی جگہ دی تو اس نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ وہ کافی دیر تک بیگ کندھے سے لگائے کسی کے انتظار میں وہاں کھڑی تھی۔

"پہلا بے بی ہے آپ کا؟" اس نے پوچھا تو جنت مسکرائی۔

"نہیں، دوسرا ہے!"

"ماشاء اللہ!!" اس کا جواب اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کا حزن اور نمی لے آیا تھا۔

"اور آپ کے کتنے بچے ہیں؟" اب بات شروع ہو ہی گئی تھی تو اس نے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

وہ لمحے بھر کے لیے کسی درد کی اذیت میں آئی تھی۔

"میری اولاد نہیں ہے۔ میں یہاں چھوٹی بہن کے ساتھ آئی ہوں۔"

جنت نے اس ایک ہی لمحے میں اس کے اعتماد کو بکھرتے، مسکراہٹ کو سمٹتے اور حزن کی دلدل میں اترتے ہوئے دیکھا۔ یوں لگا جیسے وہ اس کا ہی حزن ہو۔ کسی اور کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا نظر آ گیا ہو۔ جیسے وہ کسی اور جنت کے سامنے بٹھا دی گئی ہو۔

"شادی کو کتنے سال ہوئے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"بارہ سال۔" آنکھوں کی نمی بڑھ گئی تھی۔ "دعا کیجیے گا میرے لیے اللہ مجھے بھی دے۔"

جنت نے آہستگی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ضبط پکڑتی اس کی مٹھی سختی سے بند ہو چکی تھی۔ پتا نہیں وہ کن حالات سے گزر رہی تھی۔ کہ چہرہ سرخ پڑنے لگا تھا۔ اور آنکھیں تر ہو رہی تھیں۔

"میں پانچ [illegible]" جنت نے کہا تو اس نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ "پانچ سالوں تک جو ذہنی ٹارچر میں نے سہا ہے، شاید میں اسے لفظوں میں بیان نہ کر سکوں۔ پھر میری طلاق ہو گئی۔"

سیاہی مائل گہری آنکھیں جنت کمال کے چہرے پر جمی رہ گئی تھیں۔ "پھر میری دوسری شادی ہو گئی۔ میں اپنی زندگی کو لے کر اتنی مایوس تھی کہ مجھے لگتا تھا، کبھی کچھ ٹھیک ہو گا ہی نہیں۔ میں بے اولاد رہوں گی اور سب ایسے ہی ختم ہو جائے گا۔ میں نے دعائیں کرنا بھی چھوڑ دی تھیں۔

پھر میری ساس نے مجھے دعاؤں کی طرف متوجہ کیا۔ اور ان ہی دعاؤں کے ذریعے میں نے اپنے اندر امید جگائی اور اللہ کی تقدیر کے آگے سر جھکایا۔ اور شکر ادا کیا۔ کہ وہ جس حال میں بھی رکھے۔ الحمدللہ!!" اس کی آواز مضبوط تھی۔ لہجے میں ٹھہراو سا تھا۔ "میں نے کبھی توجہ ہی نہیں دی کہ جن بانجھ عورتوں کا ذکر قرآن میں کیا گیا، وہ دونوں ہی انبیاء کی بیویاں تھیں۔ اور دونوں کو ہی صاحب اولاد کر دیا گیا تھا۔ دونوں کے بطن سے نبیوں نے جنم لیا۔

میں نے کبھی اس بارے میں نہیں سوچا کہ مریم علیہ السلام کے حجرے میں جو بے موسمی پھلوں کا ذکر ہوا۔ تو کیوں ہوا؟ پھلوں کو دیکھ کر زکریا علیہ السلام نے امید پکڑ لی۔ آیات کو پڑھ کر۔ میں بھی کیوں نہ پکڑ سکی؟

زکریا علیہ السلام کو لگا تھا کہ وہ اب بڑی عمر کے ہیں اور ان کی زوجہ بانجھ ہے۔ انہوں نے یہ بات اللہ سے کہی۔ اور اللہ کا جواب۔ وہ صرف ان کے لیے نہیں تھا۔ وہ ہر اس عورت اور مرد کے لیے ہے جو اولاد کی نعمت سے محروم ہے۔!" اس نے رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ضبط پکڑتے لب کپکپا اٹھے تھے۔

"دعائیں رد نہیں ہوتیں۔! کبھی نہیں ہوتیں۔ اللہ پلان کرتا ہے اس نے ہمیں کب کس وقت کیا دینا

ہے۔اور کس طرح دینا ہے۔

اس لیے میں آپ سے بھی یہی کہوں گی۔ ناامید مت ہوں۔ صبر کریں۔ اور دعا اور آزمائش سے گزرنے کی ہمت مانگیں۔ اس دنیا نے تو پھر بھی ختم ہو جانا ہے۔ لیکن یہ جو آزمائش کے دوران ہمارے اعمال ہوں گے۔ ہماری عبادات۔ ہمارا یقین۔ ہمارا ایمان اور اللہ پر اعتبار۔ اور دعائیں۔ یہ آخرت تک جائے گی۔ یہی آخرت میں کام آئیں گی۔"

رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہر انسان کے ٹیسٹ کا دورانیہ مختلف ہے۔ میرا امتحان پانچ سالوں تک رہا۔ اور اللہ نے پھر مجھے دیا۔ وہ آپ کو بھی دے گا۔" اس نے پھر اس کی مٹھی آہستگی سے کھولی۔ "اسے کھلا رکھیں۔ بند نہ ہونے دیں۔ جو آپ اپنی اولاد پر خرچ کرتیں۔ اسے یتیموں مسکینوں پر خرچ کریں۔ جیسے زکریا علیہ السلام نے مریم علیہ السلام کی کفالت کی تھی۔ اسی طرح آپ بھی کسی کی کفالت کر لیں! اللہ کی راہ میں جتنا ہو سکے دیں۔ اور دعائیں جاری رکھیں۔ دعائیں تقدیر سے لڑتی ہیں۔ اور صدقہ مصیبت پریشانیوں کو ٹالتا ہے۔"

وہ سانس روک کر اسے سن رہی تھی۔

"میری دعا ہے اللہ آپ کو بہت نیک، صالح اولاد سے نوازے آمین!!" گرفت بڑھا کر بولی تو اس نے تشکر بھری نگاہوں سے دیکھتے اپنے آنسو صاف کر لیے۔

اس کا موبائل بجنے لگا تو اٹھا کر دیکھا۔ فارس کی کال آ رہی تھی۔

"میں چلتی ہوں۔" کہہ کر مسکراتے ہوئے اٹھنے لگی تو اس نے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"جنت کمال!" جواب دے کر وہ مسکراتے ہوئے جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔ ویٹنگ روم میں بیٹھی خاتون نے آنکھوں میں نمی لیے اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

☆☆☆

وہ بزنس ٹرپ سے واپس لوٹا تو احساسات بے حد مختلف تھے۔ گزشتہ رات فون پر ملنے والی خبر نے اسے مزید وہاں ٹھہرنے نہیں دیا تھا۔ وہ جلد ہی واپس آ گیا تھا۔ گھر میں داخل ہوا تو خاموشی کا راج تھا۔ کسی کو اس کی آمد کی خبر نہیں تھی۔

سیڑھیاں چڑھ کر اپنے بیڈ روم کا رخ کیا۔ دروازہ آہستگی سے کھول دیا۔

نیم تاریکی میں جنت اسے بیڈ پر دراز دکھائی دی۔ بے آواز قدموں کے ساتھ اس نے بے بی کاٹ کا رخ کیا۔ گلابی مخملیں کمبل میں لپٹا ہوا ننھا وجود گہری نیند میں تھا۔

وہ اپنی جگہ منجمد سا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر محسوس کیا جیسے اس کا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہو۔ آواز دھڑکنوں کی تھی جو ساعت میں ٹھہر گئی تھی۔ احساسات عجیب ہونے لگے تھے۔

اس نے ہمت پکڑتے ہوئے جھک کر بے حد احتیاط سے اسے اٹھا لیا تھا۔ نگاہیں اس کے پیارے سے چہرے پر جمی رہ گئیں۔

اس یوں لگا جیسے وہ وہی ہو۔ وہ اسے عطا کر دی گئی ہو۔

آہٹ پر جنت کی آنکھ کھل گئی۔ کہنی کے بل اوپر ہوئی اور فارس پر نظر پڑتے ہی ٹھہر گئی۔

نیم تاریکی میں وہ اسے دیکھ سکتی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کو سینے سے لگائے کھڑا تھا۔ وہ اس کا ماتھا، اس کا گال چوم رہا تھا۔ اس کی آنکھیں تر تھیں۔ وہ بے حد احتیاط سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ لحاف ہٹا کر اس کے پاس آ گئی۔

اس نے فارس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ تو اس نے گردن موڑ کر جنت کو دیکھا۔ وہ موت کی سرحدوں کو چھو کر پلٹی تھی۔ اس کی رنگت زرد اور آنکھوں کے حلقے گہرے لگ رہے تھے۔ لیکن موی چہرے پر الوہی سی خوشی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی پیدائش پر

یہاں نہیں تھا۔ اسے سوچ کر دکھ ہوا۔ اسے یہاں ہونا چاہیے تھا۔

"ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔" وہ بولی تو مسکراہٹ لبوں پر آ گئی۔ وہ اپنی بیٹی کو بانہوں میں لیے اس کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔

جنت کا داہنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دونوں ہی اب اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ مندی مندی آنکھیں کھولے ہوئے تھی۔ لبوں کو جنبش دیتے دیکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔ گلابی لباس اس کی اپنی رنگت سے میچ کر رہا تھا۔

وہ انگوٹھے سے اس کے گال کو چھوتے ہوئے اب اس سے بات کر رہا تھا۔

"زین کا نام میں نے رکھا تھا۔ اس کا نام تم رکھو گے!!" وہ کندھے سے گال مس کیے بہت نرمی سے بولی۔

"کیا رکھنا چاہیے؟"

"جو تم اپنی پہلی بیٹی کا رکھنا چاہتے تھے۔" آہستگی سے کہتے ہوئے اس نے فارس کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔

"میں اس کا نام جنہ رکھنا چاہتا تھا!!"

لمحے بھر کے لیے جنت کمال کی دھڑکنیں تھم گئی تھیں۔ آنکھوں میں محبت کی نرمی لیے اس نے فارس کو دیکھا۔ وہ اس کا نام تھا۔ چھوٹا سا ایک لفظ۔ جو اس کی پہچان بنا تھا۔ اور وہ اسے کبھی بھی بھلا نہیں سکا تھا۔

"ماں اور بیٹی کا ایک سا نام۔"

"بالکل! کیا خیال ہے؟" فارس نے پوچھا تو وہ مسکرائی۔

"مجھے زین کا نام پھر فارس رکھنا چاہیے تھا۔" وہ ہنس دیا۔

"تو اب۔ طے کرو۔" اس نے کپڑا ذرا سا نیچے کرتے ہوئے اپنی بیٹی کی ناک کو چھوا!۔

جنت۔ جنہ۔ اور اس سے جڑا ہوا ایک اور نام۔ جنان (Jinaan)

وہ نام جنت کمال کو بہت پیارا لگا۔ "جنان الخلد۔"

"ہاں!"

اور اس پیاری سی پری کا نام اس رات طے ہو گیا۔ سفر کی تھکان کے باوجود اس رات فارس وجدان رات گئے تک اپنی بیٹی کو گود میں لیے بیٹھا رہا تھا۔ وہ اس کے وجود سے لگی تھی تو زندگی کا احساس ہو رہا تھا۔ اور وہ درد جو دل میں تھا۔ اس کی چبھن ہلکی ہو رہی تھی۔

☆☆☆

وجدان ہاؤس کے لان میں دھوپ اتری ہوئی تھی۔ خالی کینوس کے سامنے برش ہاتھ میں لیے جمیلہ داؤد وہیں بیٹھی تھیں۔ ریان اپنی گیند سے کھیل رہا تھا۔ دوڑتے بھاگتے، چیختے ہوئے زین اس کا بھرپور ساتھ دے رہا تھا۔ اوپری منزل کی دیوار گیر کھڑکیوں سے باہر کا منظر دیکھتے ہوئے جنت نے کاغذات سے بھرا ہوا "عسر یسرا" کا فولڈر دراز میں رکھ دیا تھا۔ صرف ایک صفحہ تھا جو اس کے ہاتھ میں دھرا رہ گیا تھا۔

تلاش کا سفر مکمل ہو گیا تھا۔ جس جواب کی تلاش تھی وہ اسے مل چکا تھا۔ اس نے بے بی کاٹ پر جھک کر اپنی ننھی سی گڑیا کو بانہوں میں اٹھا لیا۔ سفید فراک میں ملبوس جنان اپنے ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔

احتیاط سے سیڑھیاں اتر کر وہ باہر آ گئی تھی۔ جمیلہ داؤد نے اسے اپنی جانب آتے ہوئے دیکھا تو برش رکھ دیا۔ لان چیئر پر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے انہوں نے جنان کو پکارا تو وہ مسکرائی۔ ریان بھاگ کر چلا آیا تھا۔ ان کی بہنا ابھی جاگی تھی۔ تو جنت کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے، اوپر ہو کر اس کے گال پر پیار کیا۔ زین کو فی الحال بوسہ لینا نہیں آتا تھا۔ سو اس نے بھی اپنے بھائی کی دیکھا دیکھی اپنے لب جنان کے گلابی گالوں پر رکھ کر ہٹا لیے۔ مسز شیرازی ہنس پڑیں۔

جنت نے عسر یسرا کے کاغذات ان کے سامنے میز پر رکھ دیے۔ "مجھے لگتا ہے شاید۔ میں کسی حد تک جواب تک پہنچ گئی ہوں۔"

اس نے کہا تو مسز شیرازی کی آنکھوں میں اشتیاق کی ایک لہر ابھری۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے ایک نظر صفحات پر ڈالی۔ "میں تم سے سننا چاہتی ہوں۔"

ایک بار پہلے انہوں نے اس کا ریسرچ ورک پڑھا تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں پڑھا تھا۔ اب وہ اس کا ہر جواب اس سے ہی سننا چاہتی تھیں۔

اس نے گہری سانس لے کر گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے کر دیا تھا۔ دھوپ میں اس کی اجلی رنگت چمک رہی تھی۔

اس نے پہلا صفحہ کھول دیا۔

" آیت ہے ان مع العسر یسرا۔ ان مع العسر یسرا" اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ " العسر اسم معرفہ ہے۔ یسرا اسم نکرہ۔ العسر کے آغاز میں الف لام ہے جس نے اسے "محدد" کر دیا گیا ہے۔ محدد یعنی ایک حد میں مقید کر دینا۔ اور یسرا بغیر الف لام کے "مطلق" ہے۔ مطلق وہ لفظ ہیں جو ہر لحاظ سے غیر مقید، غیر مشروط، غیر معین یا غیر محدود ہوتے ہیں۔ آسان لفظوں میں یوں کہنا مناسب رہے گا جو مکمل یا آزاد ہوں۔"

جمیلہ داؤد نے اثبات میں سر کو جنبش دی تو اس نے بات جاری رکھی۔

"العسر (معرفہ) "مقید" ہے۔ مقید یعنی باندھا ہوا۔ ایک حد میں رکھا ہوا۔ اور یسرا مطلق ہے۔ یعنی مکمل اور آزاد!"

لان کی سرسبز گھاس پر سے لہرا کر اٹھتی ہوئی ہوائیں درختوں کی شاخوں سے گزر گئی تھیں۔ نیلے آسمان کی بلندیوں پر کہیں کہیں سفیدی پھیلنے لگی تھی۔

" آیت نے العسر کو "الف لام" سے خاص (معرفہ) کر دیا۔ اور یسر کو بغیر "الف لام" کے عام (نکرہ) کر دیا۔"

اس نے آہستگی سے صفحہ پلٹ دیا تھا۔

"لیکن یہاں العسر کے مقابلے میں "یسر" نہیں یسرا ہے۔ الف کے ساتھ۔ الف یسر کی تعظیم کے لیے ہے!!...... یسرا "اسم تکبیر" ہے۔ اسم تکبیر نشاندہی کرتی ہے ہر اس شے کی جو عظیم ہے۔"

اس کی آواز مضبوط اور لہجہ ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ آنکھوں میں چمک لیے۔ بہت شوق اور ایکسائٹمنٹ کے ساتھ انہیں بتا رہی تھی۔

" تو اس حساب سے آیت کا مطلب ہوا۔ بے شک ہر مشکل کے ساتھ " عظیم آسانی " ہے۔!"

جمیلہ داؤد رشک بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ جنت کمال اپنے سوال کی تہہ تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے اپنے حالات کو سمجھ کر جواب اخذ کر لیا تھا۔ ابتلاء کو سمجھ لیا تھا۔ یسرا کو پا لیا تھا۔

" ہر وہ تکلیف، اذیت، آزمائش یا ابتلاء جسے ہم فیس کر رہے ہیں یا جس میں سے ہم روتے تڑپتے گزر رہے ہیں، اس کے ساتھ ہمارے لیے ایک بہت بڑی آسانی ہے۔ جو انعام ہمیں ملے گا وہ ہماری سوچ سے بڑھ کر ہوگا۔ جو "عسر" کی طرح صرف "یسر" نہیں ہوگا۔ وہ یسرا ہوگا۔ یعنی وہ عظیم ہوگا۔"

ریان کی گیند بہت دور جا گری تھی۔ زین نے بھاگتے ہوئے پہلے پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ کیاری میں چند ایک پھولوں کی پنکھڑیاں ٹوٹ کر نیچے آ گریں۔ ہوا نے رخ بدل لیا۔

" آیات یا تو تاکید کے لیے دہرائی جاتی ہیں۔ یا تہدید یعنی خوف کے لیے یا پھر تعظیم کے لیے۔ یعنی اللہ کے اس کلام کی گہرائی یا عظمت بیان کرنے کے لیے۔ اور کیا آپ یقین کریں گی کہ اس ایک جیسی دہرائی جانے والی آیت میں مجھے ایک مکمل طور پر مختلف مطلب نظر آیا ہے۔" اس نے ایک لمحے کا توقف کر کے ان کی آنکھوں میں بہت امید اور یقین سے دیکھا تھا۔ جنان اب اس کی چوڑیوں پر ہاتھ رکھ رہی تھی۔

میں نے سیکھا ہے۔

عسر کبھی بھی تنہا نہیں آتا۔ وہ آپ کی زندگی میں جب بھی، جس صورت میں بھی آتا ہے۔ یسرا کو ساتھ لے کر آتا ہے۔ یسرا یعنی ایک بہت بڑی آسانی۔

میں نے یہ بھی سیکھا ہے کہ چونکہ آپ "عسر" سے گزر رہے ہوتے ہیں، اس لیے آپ اس سے واقف ہوتے ہیں لیکن "یسرا" ایک ایسی چیز ہے جو نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے۔ بعض اوقات ہم اسے سمجھ نہیں سکتے۔ پہچان نہیں پاتے۔ بھی تو کہا گیا ہے "ساتھ" ہے۔ تاکہ ہم یقین قائم رکھیں کہ "وہ" ہے۔

میں نے اس آیت سے یہ بھی سیکھا ہے کہ یسرا دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک یسرا تو وہ ہے جو آپ کو صبر کے بدلے، محنت کے بدلے مستقبل میں مل جاتا ہے۔ (وہ محنت جس کا ذکر سورہ کی اگلی آیت میں بھی ہے)

دوسرا یسرا وہ ہے جسے سخت مشکل حالات سے گزرتے آپ اسے پا چکے ہوتے ہیں اور اسے جی بھی رہے ہوتے ہیں پر آپ کو اس کا علم نہیں ہوتا۔"

وہ بہت گہرائی میں بات کر رہی تھی۔ جو انہوں نے بھی نہ سوچا تھا۔ جنت کمال وہ بھی سوچ رہی تھی۔

"مثال کے طور پر ایک نوجوان ایک شہر سے دوسرے شہر جا رہا ہے۔ راستے میں گاڑی خراب ہو جاتی ہے۔ اب چونکہ آمدورفت بھی کم ہے تو اسے کوئی سواری نہیں ملتی۔ وہ پریشان ہو جاتا ہے کیونکہ اسے جاب انٹرویو کے لیے مقرر وقت پر پہنچنا تھا۔

وہ اداس ہو کر رونے لگتا ہے، اس لیے کہ بیمار ماں کو اکیلا گھر چھوڑ کر آیا ہے۔ اسے غم ہے کہ وہ اس نوکری کو بھی حاصل نہ کر سکے گا۔ وہ رکا رہا۔ پھنسا رہا۔ روتا رہا۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ اگر وہ اسی سڑک پر گاڑی چلاتا رہتا تو آگے کسی ٹرک سے ٹکرا کر اس کی گاڑی تباہ ہو جاتی اور وہ عین موقع پر دم توڑ دیتا۔

گاڑی کا خراب ہونا عسر ہے۔

جاب انٹرویو کا چھوٹ جانا بھی عسر ہے۔

مگر اس عسر کے بدلے جو یسرا اسے ملا ہے، کیا وہ عظیم نہیں؟ اس عسر کی یہ نسبت جس سے وہ گزر رہا ہے؟؟ اور جس کا اسے علم بھی نہیں۔؟"

جمیلہ داؤد کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی رہ گئی تھیں۔

"ہر غم، ہر دکھ، ہر درد، ہر پریشانی اور مشکل کا تناسب یسرا کے ساتھ اسی طرح ہوتا ہے۔ یسرا ہمیشہ العسر سے بڑا ہوتا ہے۔"

اس نے رک کر چند لمحوں کا توقف کیا تھا۔

جمیلہ داؤد بے حد خاموشی اور سکون سے اسے سن رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اطمینان نظر آ رہا تھا۔ ان کے زخموں پر پھر سے مرہم لگ رہا تھا۔

"میں نے دو یسرا پر غور اس لیے بھی کیا۔ کیونکہ آپ نے مجھے سورہ الطلاق کا حوالہ دیا تھا۔ عسر یسرا ایک جگہ پر "مع" اور دوسری جگہ پر "بعد" کے ساتھ ہے۔ ایک عسر ایسا ہے جس کا یسرا اس کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ جڑا ہوا۔ اور دوسرا یسرا عسر کی گھاٹی سے گزرنے کے بعد عطا کر دیا جاتا ہے۔"

خالی کینوس پر کئی منظر ابھرنے لگے تھے۔ ان کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی رہ گئی تھیں۔

"اور بے شک تمام علم اللہ کا ہی ہے۔ اللہ ہی ہے جو بہتر جانتا ہے۔"

اپنی بات ختم کر کے اب وہ اصلاح کے لیے منتظر انہیں دیکھنے لگی تھی۔ اپنا نقطہ نظر اس نے واضح کر دیا۔ اپنی تحقیق و محنت دکھا دی تھی۔

"ماشاء اللہ!" ان کی آنکھیں نم تھیں۔ محبت سے اس کی محنت اور لگن کو سراہا۔ دعا بھی دی۔

پھر انہوں نے صفحات اٹھا لیے۔ پلٹ کر دیکھنے لگی تھیں۔ پڑھنے لگی تھیں۔ اس نے لائٹر پن سے کئی نشان لگا رکھے تھے۔ کئی لفظوں کے ان گنت معانی کی لسٹ بنا رکھی تھی۔ صرف عسر یسرا کو سمجھنے کے لیے اسے قرآن کی ان تمام آیات کو ڈھونڈنا پڑا تھا جن میں یہ لفظ استعمال ہوئے تھے۔ اسے آیات کی بنت کو دیکھنا پڑا تھا۔ نکرہ اور معرفہ کی پہچان دینی پڑی تھی۔ سیاق و سباق پر غور کرنا پڑا تھا۔ کئی جگہوں پر عسر الف کے ساتھ "عسرا" استعمال ہوا تھا۔ اور کئی جگہوں پر یسرا صرف یسر۔

"کیا تلاش کا یہ سفر یہیں ختم ہوا؟؟"

"نہیں۔" جنان نے اس کے بالوں میں ہاتھ الجھا لیا تھا۔ چھڑاتے ہوئے انہیں دیکھا۔ "ختم نہیں ہوا۔ ابھی اس پر مزید ریسرچ کروں گی۔ میں اپنی زندگی کے وقت حالات کے تناظر میں اسے مزید دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کروں گی۔" رک کر مسکرائی۔ "اور میں تو اب یہ بھی سوچ رہی ہوں۔ سورۃ انشراح کا آغاز۔ ایک سوال سے ہی کیوں کیا گیا۔"

جمیلہ داؤد مسکرا کر رہ گئیں۔

"اب میں اس کا جواب ڈھونڈوں گی!"

"مما!" ریان بھاگا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔

جمیلہ داؤد کی نگاہیں خالی کینوس پر ٹھہر گئی تھیں۔ ذہن میں اب ایک نیا منظر تھا۔ ایک نیا مفہوم لیے ہوئے۔ نئے رنگوں میں گھرا ہوا۔ نئی امیدوں سے سجا ہوا۔

"بے شک! ہر مشکل کے ساتھ عظیم آسانی ہے۔"

انہوں نے برش اٹھا لیا۔

بیرونی دروازے کھل گئے تھے۔ فارس کی گاڑی اندر داخل ہو رہی تھی۔ اپنی گیند کو چھوڑ چھاڑ ریان اور زین اپنے پاپا کی طرف بھاگے تھے۔ جنان کو سینے سے لگائے جنت بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔

انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا جس کے لبوں پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ تھی۔ سفید کھلیں لباس میں ملبوس جنت کمال ہنستے ہوئے کچھ کہہ رہی تھی۔ فارس نے جنان کو اٹھا لیا تھا جو باپ کو دیکھتے ہی جنت کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"پاپا!" وہ پیاری سی آواز ریان شیرازی کی تھی۔ اس کے سیاہ بال پیشانی پر بکھرے جا رہے تھے۔ وہ ایک ہی لمحے میں اپنے پاپا کو صبح سے اب تک کی تمام باتیں بتا دینا چاہتا تھا۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں روشن ہو رہی تھیں۔

انہوں نے نم آنکھوں سے زندگی سے بھرپور اس منظر کو دیکھا۔ ان کڑی آزمائشوں کو سوچا۔ مشکلات سے گھرے وقتوں کو کھوجا۔ وہ آنسوؤں سے بھرے لمحے۔ وہ دعاؤں سے گھرے ہوئے سجدے۔ اور تڑپ لیے ہوئے ندائیں۔

"اور یسرا تو ایسے ہے جیسے ایک تنگ و تاریک سرنگ کے آخر پر پھیلا ہوا وسیع سبزہ زار۔" سورج آسمان پر تھا اور کرنیں زمین پر۔

"یسرا ایسے ہے جیسے ایک چھوٹے سے سوتے سے پھوٹتا پانی کا چشمہ۔"

انہوں نے کلر پلیٹ ہاتھ میں لیے برش اٹھا لیا۔

عسر مرض ہے تو یسرا ایک عظیم شفاء!

عسر زخم ہے تو یسرا ایک عظیم مرہم۔

عسر صبر ہے تو یسرا ایک عظیم اجر۔

عسر آنسو ہے تو یسرا عظیم فرح۔

عسر محرومی ہے تو یسرا اللہ کی عظیم عطا!

سفید کینوس پر رنگ بکھرنے لگے تھے۔ ایک نیا منظر تخلیق کے مراحل سے گزرنے لگا تھا۔

وہ "آغاز" تھا جسے وہ دیکھ رہی تھیں۔ وہ ابتداء تھی جسے وہ سن رہی تھیں۔

نام اللہ کا تھا۔

صرف اس کا ہی تھا۔

وہی مجیب۔ وہی خالق...... وہی رزاق اور وہی مالک ہے۔

جس نے احاطہ کر رکھا اپنی مخلوق کا۔ ان کی دعاؤں اور اعمال کا۔ ان کے یقین اور ایمان کا۔

"بے شک ہر مشکل کے ساتھ عظیم آسانی ہے۔"

ہوائیں تیز چلنے لگی تھیں۔ آسمان پر بادل پھیل رہے تھے۔ دھرتی پر املتاس کے درختوں سے۔ سنہری بارش ہونے لگی تھی۔

صفحے پلٹ دیے گئے تھے۔ اور قلم اٹھا لیا گیا تھا۔ ایک نئی حکایت کے لیے جو وقت کے کسی اور دائرے پر ابھرنے والی تھی۔

☆☆

خوب صورت بیضوی چہرہ، جھیل سی گہری آنکھیں، پنکھڑیوں کو مات دیتے گلابی لب، گلاب سی رنگت، چہرے کے عین وسط پہ دھرا گہرا سیاہ تل، وہ بلا کی حسین تھی اسے خوب صورتی بڑی فیاضی کے ساتھ عطا کی گئی تھی، ایسی خوب صورتی جس کا ہرجانہ اس نے زندگی میں بار بار بھرا......!

اس [illegible] لائن ہی تو لگ گئی، اس کی خوب صورتی سے اچھی طرح واقف اور کسی حد تک خوف زدہ، اس کے اماں، بابا کو بھی اسے کھونٹے سے باندھنے میں ذرا تامل نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کے بابا نے اپنی ہی ذات کے دیرینہ دوست کو ان کے اکلوتے سپوت کے لیے ہاں

کر دی تھی۔ لڑکے کی قابلیت پر کوئی شک کی گنجائش ہی نہ تھی، انجینئر تھا، ایک اچھی کمپنی میں اعلا عہدے پر فائز بھی تھا، البتہ کمی تھی تو شکل وصورت کی، صورت کے اعتبار سے وہ زہرہ کے پاؤں کی دھول بھی نہ تھا۔ لیکن یہ تو کوئی ایسی بڑی بات نہ تھی مرد کی شکل کبھی اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتی اگر جیب "وزنی" ہو تو، یہ وہ خوبی ہے جو تمام عیب چھپا دیتی ہے۔ ویسے بھی باقی خامیاں تو جب سامنے آئیں تو کسی بات کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

"فہد" ابا نے کھانا کھاتے ہوئے اکلوتے سپوت کو مخاطب کیا، تو اس نے سوالیہ نظریں ان کی طرف مرکوز کیں۔ "میں نے تمہاری بہن کا رشتہ طے کر دیا ہے۔"

یہ سن کر فہد کی نظروں میں واضح حیرانی در آئی اتنا بڑا فیصلہ بنا کسی مشورے کے...... اسے دکھ تو پہنچا مگر باپ کے سامنے سوال اٹھانے کی اس گھرانے میں روایت نہ تھی سو چپ سادھ لی۔

"جی!" منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔

لڑکے اور اس کے گھرانے سے ملنے کے بعد فہد اپنے جذبات پر قابو نہ کر سکا۔

"اباجی، گستاخی معاف کیجیے گا مگر میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ کو اتنی جلدی کس بات کی ہے؟" لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی آ ہی گئی۔

"مجھے یہ رشتہ قطعی طور پر منظور نہیں...... کوئی جوڑ نہیں ہے ہماری زہرہ کا مسعود میاں کے ساتھ۔" فہد نے حتی الامکان لہجے کو ہموار رکھنے کی کوشش کی...... مگر چہرے سے ناگواری صاف عیاں تھی۔

"اچھا تمہیں کیا کمی دکھائی دی۔ ہمیں بھی تو پتا چلے؟" گویا انہوں نے اس کے اعتراض کا واضح تمسخر اڑایا۔

"کمی......؟ ابا وہ شکل وصورت کے اعتبار سے کسی صورت ہماری شہزادی جیسی زہرہ کے قابل نہیں کہاں زہرہ اور کہاں وہ......"

"شکل وصورت وہ پیمانہ نہیں جس میں اپنی لڑکی کا مستقبل تول دیں ہم، انجینئر ہونا کوئی معمولی بات نہیں پھر نوکری بھی اچھی ہے۔ زمین جائیداد الگ، ویسے بھی اگر مگر کی گنجائش ہی نہیں۔ میں زبان دے چکا ہوں۔" ان کا لہجہ دوٹوک تھا۔ پتھر پر لکیر......!

وہ اپنے ابا کی "میں" سے واقف تھا، مگر اس کے لیے یہاں ضبط کرنا محال تھا۔ سو بنا کچھ کہے اٹھا اور جاتے ہوئے سارا غصہ دروازے پر اتارا...... مگر ابامیاں کے سکون میں شگاف ڈالنا اتنا آسان نہ تھا۔

☆☆☆

پھر ہزار وہموں اور وسوسوں کو پاٹتے ہوئے وہ دن بھی آ ہی گیا جس کے لیے زہرہ نے من ہی من میں کتنے سپنے سجائے تھے۔ وہ دلہن بنی کانچ کا پیکر، چاندنی بکھیرتی اپنے آنچل میں دھنک کے تمام رنگ سمیٹے اپنے تمام خواب بند مٹھی میں لیے بابل کا آنگن عبور کر گئی۔

رسموں کے پل عبور کرتے مسعود میاں حجلہ عروسی میں پہنچے جہاں زہرہ اپنی تمام امنگیں اور آرزوئیں سمیٹے گھونگھٹ کاڑھے بیٹھی تھی۔

مسعود میاں نے گھونگھٹ اٹھایا تو دم بخود رہ گئے۔ جو سنا تھا اس سے کہیں بڑھ کے پایا مگر منہ سے ایک لفظ نہ کہا۔ وہ ان مردوں میں سے نہ تھے۔ جو محبت وستائش کی ڈوری سے باندھ کر اس کو چاند پر لے جاتے۔ وہ تو ہر صورت اپنی برتری قائم رکھنے والوں میں سے تھے۔

اور زہرہ کے دل پر کیا گزری ہوگی جو اس نے اپنے سے کمتر صورت والے مرد کو دیکھا؟ اس کی نہ انہیں سمجھ تھی نہ ہی پروا، ویسے بھی زہرہ اتنی کمسن اور معصوم تھی شرافت اور سادگی اس کی سرشت میں تھی۔ وہ اپنے ساتھ قسمت کے اس مذاق کو سمجھ ہی نہیں پائی تھی نہ مسعود میاں کے دل کے کھوٹ کو جان پائی تھی۔

وہ تو اپنی ہی دھن میں مگن تھی۔ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ زہرہ نے نئی زندگی میں قدم تو رکھ ہی دیا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے بہت تیزی سے ارتقائی منازل طے کیں۔

بیٹی سے بیوی، لڑکی سے عورت اور عورت سے کٹھ پتلی......"

نئے آنگن میں سورج کی روپہلی کرنیں بکھری تھیں مگر آج تو اسے سورج بھی اجنبی لگ رہا تھا۔ وہ خود میں سمٹی تھی۔ اسے اور دولہا کو ناشتا کمرے میں بھجوانے کے بجائے بڑے ہال میں ہی بلوالیا گیا تھا۔ جہاں شادی میں شرکت کی غرض سے آئے ہوئے سب ہی مہمان موجود تھے۔ اسے دیکھ کر بڑی بوڑھیوں کی سرگوشیوں اور جوان لڑکیوں کی اٹھکیلیوں میں اضافہ ہوا تو وہ مزید خود میں سمٹ گئی۔

☆☆☆

پھر ساس امی نے دوسرے دن سے ہی کھیر میں ہاتھ ڈلوا کر اسے باقاعدہ کچن سے روشناس کروایا۔ گھر میں اس کے اور مسعود میاں کے علاوہ تین نندیں، ایک دیور، ساس اور سسر تھے۔

سلیقہ، خدمت اس کی گھٹی میں پڑے تھے۔ وہ مستعدی و لگن سے کرتی۔

"یہ کیا چائے میں اس قدر میٹھا ڈالا ہے؟" مسعود میاں نے چائے کا کپ اس قدر زور سے پٹخا کہ تھوڑی سی چھلک ہی گئی اور وہ سہم سی گئی اتنی سی بات پر اتنا غصہ وہ محض سوچ تھی، کہنے کے لیے نہ ہمت تھی نہ جرات۔

"یہ کپڑے کالف کیسے لگائے ہیں۔ تمہیں استری کرنی نہیں آتی؟" مسعود میاں منہ بگاڑ کر کہتے اور وہ جیسے بولنا بھولتی ہی جا رہی تھی۔

"روٹی کیسی بنائی ہے اتنی سخت روٹی...... اسے روٹی بنانا سکھایے۔" وہ اپنی اماں سے مخاطب ہوتے۔ وہ اور سہم جاتی۔ ایک چیز صحیح کرتی تو دوسری چیز خراب ہو جاتی۔ کوئی نہ کوئی خرابی اس کے کیے کاموں میں نکل ہی آتی ہے۔

اپنی تمام تر معصومیت کے باوجود اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اس کا واسطہ ایک جابر اور حاکم طبیعت کے حکمران سے پڑا ہے۔ جو اپنی کم صورت کے باعث احساس کمتری کا شکار ہے۔ وہ زہرہ پر ہر دم نکتہ چینی کرنے بلکہ مختلف پابندیاں بھی عائد کر دیں۔

ویسے بھی وہ عورت کی پسند، ناپسند کی آزادی دینے کے بھی قائل نہ تھے۔ زہرہ کی خوب صورت انہیں کھٹکتی رہتی ان کی کم صورت کا احساس دلاتی رہتی۔

زہرہ کو انہوں نے ایک باندی کا درجہ دیا ہوا تھا۔ جسے صرف سننے کی اجازت تھی۔ جبکہ زہرہ اپنے سونے جیسے وجود کی مانند ظاہر و باطن صاف و شفاف تھی۔ ہر دم نظریں جھکائے اپنے مجازی خدا کے ہر حکم پر لبیک کہتی۔ سو دونوں کی ازدواجی زندگی زہرا کے کاندھوں پر ٹکی تھی۔

☆☆☆

وقت اچھا ہو یا برا گزرتا جاتا ہے۔ تقدیر کی ستم ظریفی نے زہرہ کے جرائم کی فہرست اور بڑھادی اور تین بیٹیاں جننے کا بوجھ بھی اس کے کاندھوں پر ڈال دیا۔ ظالم کو سب سے زیادہ تقویت سہنے والے کی ذات سے ہی ملتی ہے۔ اور زہرہ کی برداشت ناقابل شکست ثابت ہو رہی تھی۔

مسعود میاں کو اب زہرہ کی فرماں برداری سے بھی چڑ سی ہو گئی تھی۔ دل بھر گیا تھا اب ان کا، مگر کوئی بہانا نہ تھا راہ فرار کا۔ جب ڈھونڈنے سے بھی کوئی سوراخ نہ ڈھونڈ پائے تو بیٹے کی کمی کی وجہ بنا کر دوسری بیگم بیاہ لائے۔

آفرین تھی زہرہ پر اس کے ہونٹوں پر لگے قفل زنگ آلود ہو چکے تھے۔ وہ تو پہلے ہی اپنے شوہر کے دل میں موجود "دوج" کو جانتی تھی۔ تو اس کو فرق نہیں پڑا سوائے اس کے کہ پہلے بھی گھر والوں کی بے دام غلام تھیں، اب ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔ جس نے بھی سنا انگلیاں دانتوں تلے داب لیں۔

"کیا کمی تھی اس میں کیا صورت، کیا سیرت، خدمت گزار۔" لوگ نئی دلہن سے اس کا تقابل کرتے، پہلی والی اور دوسری والی میں کسی طور مقابلہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

دوسری، پہلی والی سے "حسن" میں پسپا تھی تو پہلی والی دوسری والی سے "قسمت" میں شکستہ تھی اور

جیت تو نصیب والے کے مقدر میں ہوتی ہے۔

''زہرہ'' وہ تو منہ اندھیرے ہی اٹھنے کے عادی تھی۔ شگفتہ بیگم تو من چاہی اور خود سر تھی نہ اس کو کسی نے ٹوکا تھا کہ اسے اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور سے غرض بھی نہ تھی۔ جب دل چاہتا، جیسے دل چاہتا کی عملی تفسیر تھی۔ زہرہ کی کہاں اتنی ہمت تھی کہ چوں چرا کرتی۔

''زہرہ!'' شگفتہ کے منہ سے اپنا نام سن کر وہ چونک گئی۔ شگفتہ تو کبھی نو بجے سے پہلے کمرے سے قدم باہر نہیں نکالتی تھی۔

''میرا سر بہت بھاری ہو رہا ہے مجھے چائے بنا دو ساتھ کچھ بسکٹ وغیرہ ہو تو دے دو مجھے دوائی کھانی ہے۔'' شگفتہ نے کنپٹی کو مسلتے ہوئے کہا زہرہ سر ہلا کے رہ گئی۔ پھر شگفتہ کی طبیعت خوش خبری سن کر ہی سنبھلی وہ ''امید'' سے تھی۔

اس بار مسعود میاں نے خوب ناز اٹھائے جیسے یہ ان کی پہلی اولاد پیدا کرنے جا رہی ہو۔ پھر ان کی امیدیں پوری ہوئیں اور شگفتہ کی خوش بختی میں ایک اور چاند لگ گیا۔ جب وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی اگر کمی رہ گئی تھی تو وہ بھی پوری ہو گئی۔ وہ بیٹا پیدا کر کے گویا چودھرائن ہی تو بن گئی۔ یہ اور بات کہ اس نے بیٹا صرف پیدا کیا تھا۔ پالنے کے لیے زہرہ کو تھما دیا تھا اور زہرہ وہ تو اس کے بیٹے کو اپنی سگی اولاد ہی سمجھتی، اس کے ناز اٹھاتی اس کی ماں کے پاس اتنی فرصت ہی کب تھی کہ اسے دیکھتی۔

☆☆☆

وقت اپنے دامن میں کتنی تلخ و شیریں یادیں سمیٹے گزرتا ہی جاتا ہے۔ بچے بڑے ہو گئے تھے اب وہ ہر بات سمجھتے تھے۔ کہاں کہاں کس کے ساتھ غلط ہو رہا تھا۔ وہ دیکھتے اور کڑھتے۔

''امی آپ چپ کیوں رہتی ہیں؟ ہر کام آپ نے اپنے ذمہ کیوں لیا ہوا ہے؟'' زہرہ کی چھوٹی بیٹی اس کے بالکل برعکس تھی۔ منہ پھٹ، حاضر جواب، زیادتی قطعی برداشت نہ کرنے والی۔ وہ اپنی ماں سے اکثر یہ سوال کرتی کہ چچی کوئی کام کیوں نہیں کرتیں وہ تو ملکہ عالیہ بنی ہر وقت تخت پر براجمان رہتی ہیں۔ حکم چلاتی ہیں، سب کو ہدایت دیتی اپنا عین فرض سمجھتی ہیں۔ فاطمہ سوال کرتی جس کا جواب زہرہ کے پاس نہ تھا اور بس ٹکر ٹکر اس کو دیکھتی جاتی۔

اس نے تو کبھی یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ وہ تو اس گھر کو اپنا گھر سمجھتی تھی۔ اس لیے کبھی کسی کام میں کوئی عار محسوس نہیں کیا تھا۔

''فاطمہ تم ایسی باتیں نہ سوچا کرو ویسے بھی تمہاری شادی میں کم دن رہ گئے ہیں خوشی خوشی شادی کی تیاری کرو۔'' زہرہ نے اپنی جذباتی اور حساس بیٹی کا دھیان بٹانا چاہا۔

''امی، آپی بجو تو جا چکی ہیں میں بھی چلی جاؤں گی تو آپ کا خیال کون رکھے گا؟ آپ کو دوسروں کی فکر رہتی ہے کبھی خود کے بارے میں نہیں سوچا آپ کتنی اکیلی ہو جائیں گی۔'' اسے اپنی ماں کی شدید فکر تھی۔!

''میں کیوں اکیلی ہوں گی بیٹا سب تو ہوں گے تم بس اپنی تیاری کرو اور اس گھر سے اچھی یادیں لے کر جاؤ۔'' زہرا نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔

''کون ہوگا، اتنے سالوں میں مجھے تو کوئی نظر نہیں آیا؟''

''کیوں بیٹا تمہارا بھیا ''احمد'' ہے ناں۔'' زہرہ کا لہجہ محبت سے چور تھا۔ کیوں نہ ہوتا ان دونوں ماں بیٹے کا رشتہ ہی ایسا تھا سگی اولاد سے بڑھ کر مان دیا تھا احمد نے زہرہ کو۔ مگر فاطمہ بھی مطمئن نہ ہوتی وجہ شگفتہ کی سازشی طبیعت تھی جسے ان پانچوں کا ایکا ایک آنکھ نہ بھاتا اور وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی۔ وہ اسی کوشش میں رہتی تھی کہ ان کی آپس میں ان بن ہو جائے مگر زہرہ اور اس کی بیٹیاں اتنی سمجھ دار تھیں کہ وہ ایسا موقع ہی نہیں آنے دیتی تھیں۔

☆☆☆

پھر فاطمہ بھی بیاہ کر چلی گئی اور زہرہ واقعتاً اکیلی ہو گئی۔ احمد کی پڑھائی مکمل ہو گئی تھی اور وہ روزگار کی

تلاش میں تھا۔ یوں تو روپے پیسے کی کمی نہ تھی مگر روزگار سے تو لگن ہی تھا۔ زندگی ایک ہی ڈھب سے رواں تھی کہ ایک نیا امتحان سر پر گرا۔ مسعود میاں کو فالج کا اٹیک ہوا اور وہ بستر سے لگ کے رہ گئے۔ ساری جوانی شوہر پہ حق جتانے والی اور شوہر نامی لفظ سے جڑا ہر فائدہ اٹھانے والی جب مشکل پڑی تو بنا کسی توقف کے پیچھے ہٹ گئی۔

''زہرہ بیگم! اب آپ مسعود کو اپنے کمرے میں شفٹ کر لیجیے میری جان اس قابل نہیں کہ کسی اور کو سنبھال سکوں۔'' انہیں کہنے میں ذرا تامل نہ ہوا اور زہرہ اس نے تو اعتراض اور انکار کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔

سو لاغر، اپاہج، کمزور مسعود میاں اس کے کمرے میں شفٹ ہو گئے۔ وہ ان کی ہر طرح سے دیکھ بھال کرتیں اور وہ بے زبان انہیں تکتے جاتے کس قدر ظلم ڈھائے تھے اس عورت پر، انہیں احساس ہوتا، ضمیر ملامت کرتا، ضمیر بھی تب ہی کچوکے لگاتا ہے جب خود پر مصیبت پڑ جائے۔ وہ کھانا کھلا رہی تھی جب مسعود نے کانپتے ہوئے ہاتھ اس کے سامنے جوڑے زہرہ تو جیسے مجسم حیرت بن گئی کس قدر ضبط سے کام لیا پھر بھی دو آنسو لڑھک کر بغاوت کر ہی بیٹھے وہ اتنا بھی نہیں کہہ سکی کہ کیوں؟ کیوں؟ ایسا سلوک کیا میرے ساتھ۔ میں اس کی حق دار تو نہ تھی اتنی ارزاں تو نہ تھی مگر اب کیا فائدہ تھا ان باتوں کا وہ ان کے ہاتھ تھام کر رہ گئی۔

پھر دن بدن ان کی حالت مزید بگڑتی گئی۔ شگفتہ نے جو یہ دیکھا تو ایک دن ان کے پاس آئی اور بولی کہ ''ویسے تو میرا احمد ہی اکلوتی اولاد نرینہ ہے مگر اتنی جائیداد ہے تو وصیت کر دیجیے کہ شرعی حصہ کے علاوہ سب احمد اور میرا ہے۔''

مسعود بے بسی سے ان کو دیکھ رہے تھے اب عقل آئی تھی کہ کھوٹ تو ان کی اپنی ذات میں تھا اسی لیے تو ہیرا صفت بیوی سے خود ہی دور ہو گئے اور اس پتھر کو سر کا تاج بنائے رکھا۔

''احمد کو بھیجو'' انہوں نے مشکل سے لفظ ادا کیے۔ وہ احمد کو بلا لائیں احمد باپ کا ہاتھ تھام کر بیٹھا تو مسعود نے شگفتہ کو جانے کا اشارہ دیا۔

''میرے سامنے ہی بات کر لیجیے جو بھی بات کرنی ہے میں غیر تو نہیں ہوں۔'' مگر مسعود میاں کراہنے لگے۔ احمد نے ماں کو جانے کا اشارہ کیا۔

بس پھر تو شاید انہیں وصیت کرنے کا ہی انتظار تھا۔ کام پورا ہوا اور وہ خالق حقیقی سے جا ملے۔ پورا گھرانہ سوگ میں ڈوبا تھا۔

''بس اب زہرہ اس گھر میں نہیں رہے گی۔'' شگفتہ جو فطرتاً ایک سفاک اور سخت دل عورت تھی۔ پورے کروفر سے بولی تھی۔

''بڑی امی کہیں نہیں جائیں گی یہ گھر اور تمام جائیداد بابا بڑی امی کے نام کر گئے ہیں۔''

زہرہ نے ساری زندگی خود پر جبر کر کے اپنا بھرم بنائے رکھا تھا اب اس دہلیز کو چھوڑنے کے خوف سے ہی بے دم ہو گئی تھی۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے نیچے ڈھے سی گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ تم نے روکا کیوں نہیں؟'' تنگ دل شگفتہ ہذیانی ہو گئی تھی یہ سوچے بغیر کہ مسعود کو دنیا چھوڑے ابھی صرف دو دن ہی ہوئے تھے۔ احمد دھیرے سے چلتا ہوا زہرہ کے پاس آیا ایک ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھاما اور ایک ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ ''بس اب نہیں روئیں گی آپ، آپ کا بیٹا آپ کو روتے نہیں دیکھ سکتا'' روتے ہوئے زہرہ کی ہچکیوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ ''اور آپ'' وہ شگفتہ سے مخاطب ہوا۔

''مجھے آپ کی فطرت کا اندازہ تھا میں نہیں چاہتا تھا کہ میری ماں کا گھر اور بہنوں کا میکہ چھوٹے، اس لیے میں نے خود بابا سے درخواست کی تھی کہ سب بڑی امی کے نام کر دیں۔''

احمد نے پرسکون لہجے میں اپنی ماں کو بتایا دیر سے ہی سہی زہرا بیگم کو احمد کی صورت ''ٹھنڈی چھاؤں'' میسر آ ہی گئی تھی۔

☆☆

نہ شب و روز ہی بدلے ہیں نہ حال اچھا ہے
کس برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

ہم کہ دونوں کے گرفتار رہے جانتے ہیں
دامِ دُنیا سے کہیں زلف کا جال اچھا ہے

میں نے پوچھا تھا کہ آخر یہ تغافل کب تک
مسکراتے ہوئے بولے کہ سوال اچھا ہے

دل نہ مانے بھی تو ایسا ہے کہ گاہے گاہے
یارِ بے فیض سے ہلکا سا ملال اچھا ہے

لذتیں قرب و جدائی کی ہیں اپنی اپنی
مستقل ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے

رہرواں رہِ اُلفت کا مقدر معلوم
ان کا آغاز ہی اچھا نہ مآل اچھا ہے

دوستی اپنی جگہ پر یہ حقیقت ہے فرازؔ
تیری غزلوں سے کہیں تیرا غزال اچھا ہے

احمد فرازؔ

کہہ بھی دے اب وہ سب باتیں
جو دل میں پوشیدہ ہیں
سارے روپ دکھا دے مجھ کو
جو اب تک نادیدہ ہیں
ایک ہی رات کے تارے ہیں
ہم دونوں اس کو جانتے ہیں
دُوری اور مجبوری کیا ہے
اس کو بھی پہچانتے ہیں
کیوں پھر دونوں مل نہیں سکتے
کیوں یہ بندھن ٹوٹا ہے
یا کوئی کھوٹ ہے تیرے دل میں
یا میرا غم جھوٹا ہے

منیر نیازی

خیال و خواب کی دُنیا سے ہم گزر بھی گئے
جہاں ٹھہرنا تھا ہم کو وہاں ٹھہر بھی گئے

ہمارے ساتھ رہے زندگی کے ہنگامے
جہاں جہاں سے بھی گزرے جدھر جدھر بھی گئے

زمانہ لاکھ ہماری مخالفت میں رہا
جو کام کرنا تھا ہم کو وہ کام کر بھی گئے

محبتوں میں بھی لازم ہے اعتدال کا رنگ
خلوص حد سے بڑھا جب تو لوگ ڈر بھی گئے

غم زیاں کے سوا کچھ نہیں ہے منزل پر
سفر کا لطف گیا اور ہم سفر بھی گئے

ہم ایسے لوگ منور کہاں سے آئیں گے
جو پستیوں میں رہے اور فراز پر بھی گئے

ڈاکٹر منور ہاشمی

تم جب آؤ گی تو کھویا ہوا پاؤ گی مجھے
میری تنہائی میں خوابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے کمرے کو سجانے کی تمنا ہے تمہیں
میرے کمرے میں کتابوں کے سوا کچھ بھی نہیں
ان کتابوں نے بڑا ظلم کیا ہے مجھ پر
ان میں اک رمز ہے جس رمز کا مارا ہوا ذہن
مژدہ عشرت انجام نہیں پا سکتا
زندگی میں کبھی آرام نہیں پا سکتا

جون ایلیا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جو بندہ باوضو سوتا ہے، پھر رات کو اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ اللہ سے دنیا کے معاملات میں سے یا آخرت کے معاملات میں سے کسی چیز کا سوال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے وہ چیز دے دیتا ہے۔" (ابو داؤد)

فوائد و مسائل۔

1۔ باوضو سونا بہت باعث برکت ہے، اس لیے باوضو سونا چاہیے تاکہ رات کو جاگ آئے تو اللہ سے کچھ نہ کچھ مانگ لیا جائے، خواہ وہ طلب مغفرت وغیرہ کا سوال کیا جائے یا مرض سے شفا، مصیبت سے نجات اور قرض کی ادائیگی کے لیے دعا کی جائے۔

عمل،

حضرت قبیصہ رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں، میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو منبر پر فرماتے سنا۔
"جو رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔ جو معاف نہیں کرتا اسے معاف نہیں کیا جاتا، جو توبہ نہیں کرتا، اس کی توبہ قبول نہیں کی جاتی۔ جو (برے کاموں سے) نہیں بچتا اسے (عذاب) سے نہیں بچایا جاتا۔"

کبوتر بازی،

حضرت حسن رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں۔
"میں نے ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ بیان میں تکلیف کتوں کو مار دینے کا اور کھیل کے طور پر اڑائے جانے والے کبوتروں کو ذبح کر دینے کا حکم دے رہے تھے۔ (جو دوسرے کبوتروں کو ساتھ لے آتے ہیں۔)"

وقت ضائع کرنا،

حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا۔
"مجھے اس آدمی پر بہت غصہ آتا ہے جو مجھے فارغ نظر آتا ہے۔ نہ آخرت کے کسی عمل میں لگا ہوا ہے اور نہ دنیا کے کسی کام میں۔"

اللہ کے لیے،

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
"جو بندہ بھی کسی چیز کو اللہ کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اللہ اس کے بدلے میں اس سے بہتر چیز اس کو وہاں سے دیتے ہیں جہاں سے ملنے کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا اور جو بندہ کسی چیز کو ہلکا سمجھ کر اسے وہاں سے لے لیتا ہے جہاں سے لینا ٹھیک نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اسے اس سے زیادہ سخت چیز دیتے ہیں جہاں سے ملنے کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔"

واصف علی واصف،

* دنیا کے اندر سب سے بڑا انصاف یہ ہے کہ یہ گناہ کے متلاشی کو گناہ کا موقع دیتی ہے اور نفس کے متلاشی کو نفل دیتی ہے۔
* جو بات آپ کے دل میں اتر گئی، وہی آپ کا انجام ہے۔ اگر آپ کو موت آ جائے تو جس خیال میں آپ مریں گے، وہی آپ کی عاقبت ہے۔
* جس کو صداقت اور نیکی کا سفر کرنے کی خواہش ہے وہ جان لے کر یہ مشکل کا اعلان ہے۔ جس کو مشکل

نہیں کیا جاتا، اس کو یہ شوق ہی نہیں ملتا۔

٭ استعداد سے زیادہ کی تمنا، ہلاکت ہے اور استعداد سے کم کی خواہش آسودگی ہے۔

٭ آپ کے سانس گنتی کے مقرر ہو چکے ہیں، نہ کوئی حادثہ آپ کو پہلے مار سکتا ہے، نہ کوئی حفاظت آپ کو دیر تک زندہ رکھ سکتی ہے۔

٭ دعا یہ کیا کرو، اے اللہ! جو تو نے دینا ہے، وہ بغیر مانگے دے اور جو کچھ تو نے نہیں دینا، اس کے مانگنے کی توفیق ہی نہ دے۔

٭ جو شخص مر گیا جو کسی کے دل میں نہ رہا۔ آدمی کب مرتا ہے، جب دل سے اترتا ہے۔ زندہ کب ہوتا ہے، جب دل سے اترتا ہے۔

٭ مجبوری ضرورت کا نام ہے، بندہ اندر سے برا نہیں ہوتا، ضرورت ہی برا کرتی ہے اور ضرورت ہی نیک کرتی ہے۔ ضرورت نکال دو، بندہ ٹھیک۔

(بات سے بات۔ واصف علی واصف)

آٹھ قیمتی خزانے

ایک روز شیخ شفیق نے اپنے شاگرد حاتم سے پوچھا۔

”حاتم! تم کتنے عرصے سے میرے ساتھ ہو؟“

انہوں نے کہا: ”تینتیس برس سے۔“

شفیق بلخی نے پوچھا: ”بتاؤ اتنے طویل عرصے میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا؟“

حاتم نے کہا: ”صرف آٹھ مسئلے۔“

شیخ نے کہا: ”انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میرے اوقات تیرے اوپر ضائع چلے گئے۔ تو نے صرف آٹھ مسئلے سیکھے؟“

حاتم نے کہا: ”استاد محترم! زیادہ نہیں سیکھ سکا۔ اور جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔“

شیخ نے کہا: ”اچھا بتاؤ کیا کچھ سیکھا ہے؟“

حاتم نے کہا۔

1۔ میں نے مخلوق کو دیکھا تو معلوم ہوا ہر ایک کا محبوب ہوتا ہے، قبر میں جانے تک۔ جب بندہ قبر میں پہنچ جاتا ہے، تو اپنے محبوب سے جدا ہو جاتا ہے، اس لیے میں نے اپنا محبوب نیکیوں کو بنا لیا ہے کہ جب میں قبر میں جاؤں گا تو یہ میرا محبوب میرے ساتھ قبر میں رہے گا۔

2۔ لوگوں کو دیکھا کہ کسی کے پاس قیمتی چیز ہے تو اسے سنبھال کر رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر فرمان الٰہی (سورہ نحل آیت 96) ”جو کچھ تمہارے پاس ہے، وہ ختم ہونے والا ہے۔ جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہی باقی رہنے والا ہے“ کو پڑھا، جو چیز مجھے قیمتی نظر آئی، اسے اللہ کی طرف پھیر دیا تاکہ اس کے پاس محفوظ ہو جائے جو کبھی ضائع نہ ہو۔

3۔ میں نے اللہ کے فرمان پر غور کیا (سورہ النازعات آیت 40) ”اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا، جنت اسی کا ٹھکانا ہوگا“ تو اپنے نفس کو برائیوں سے لگام دی، خواہشات نفسانی سے بچنے کی محنت کی۔ یہاں تک کہ میرا نفس اطاعت الٰہی پر جم گیا۔

4۔ لوگوں کو دیکھا ہر ایک کا رجحان دنیاوی مال، حسب نسب جاہ و منصب میں پایا۔ ان امور میں غور کرنے سے یہ چیزیں ہیچ دکھائی دیں۔ ادھر فرمان الٰہی الحجرات آیت 13 پڑھی۔ ”درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو (تمہارے اندر سب سے زیادہ) پرہیزگار ہو۔“ تو میں نے تقویٰ اختیار کیا تاکہ اللہ کے ہاں عزت پاؤں۔

5۔ لوگوں میں یہ بھی دیکھا کہ آپس میں گمان بد رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو برا کہتے ہیں دوسری طرف اللہ کا فرمان (زخرف آیت 32) دیکھا۔ ”دنیا کی زندگی میں ان کی بسر اوقات کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں۔“ اس لیے حسد کو چھوڑ کر خلق سے کنارہ کر لیا اور یقین ہوا کہ قسمت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ خلق کی عداوت سے باز آگیا۔

6۔ لوگوں کو دیکھا ایک دوسرے سے سرکشی اور

کشت و خون کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف رجوع کیا تو فرمایا۔ (فاطر آیت ۶) "درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو" اس بنا پر میں نے صرف اکیلے شیطان کو اپنا دشمن ٹھہرا لیا اور اس بات کی کوشش کی کہ اس سے بچتا رہوں۔

7۔ لوگوں کو دیکھا کہ پارہ نان (روٹی کے ٹکڑے) پر اپنے نفس کو ذلیل کر رہے ہیں۔ ناجائز امور میں قدم رکھتے ہیں۔ میں نے ارشاد باری تعالیٰ دیکھا۔ (ہود آیت ۶) زمین پر چلنے والا کوئی جان دار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔ پھر میں ان باتوں میں مشغول ہوا جو اللہ کے حقوق میرے ذمے ہیں، اس رزق کی طلب ترک کی جو اللہ کے ذمے ہے۔

8۔ میں نے خلق کو دیکھا کہ ہر ایک کسی عارضی چیز پر بھروسا کرتا ہے۔ کوئی زمین پر بھروسا کرتا ہے کوئی اپنی تجارت پر، کوئی اپنے پیشے پر، کوئی جسم پر، کوئی دینی و علمی صلاحیتوں پر بھروسا کیے ہوئے ہے اور ہر کوئی اپنی مخلوق پر تکیہ کرتا ہے۔ میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا۔ یہ ارشاد دیکھا۔ (الطلاق۔ آیت ۳) "جو اللہ پر بھروسا کرے اس کے لیے وہ کافی ہے" تو میں نے اپنے اللہ پر توکل کیا، وہی مجھے کافی ہے۔

شیخ بلخی نے فرمایا: "اے میرے پیارے شاگرد حاتم! اللہ تمہیں ان کی توفیق نصیب فرمائے۔ میں نے جب قرآن کے علوم پر مطالعہ کیا تو ان سب کی اصل جڑ ان ہی آٹھ مسائل کو پایا۔ ان پر عمل کرنے والا گویا چاروں آسمانی کتابوں کا عامل ہوگا۔"

(بحوالہ احیاء العلوم غزالیؒ)

اللہ کی کتاب،

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دروازے پر بہت زیادہ آیا کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے فرمایا۔

• جا اللہ کی کتاب سیکھو۔

چنانچہ وہ چلا گیا اور کئی دن تک حضرت عمرؓ کو نظر نہ آیا۔ پھر اس کی ملاقات حضرت عمرؓ سے ہوئی تو حضرت عمرؓ نے نہ آنے پر اس سے کچھ خفگی کا اظہار کیا تو اس نے کہا۔

• مجھے اللہ کی کتاب میں وہ کچھ مل گیا ہے جس کے بعد عمرؓ کے دروازے کی ضرورت نہیں رہی۔

لمحۂ فکریہ،

کوشش رہو اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔ ماضی راکھ کا ڈھیر ہے۔ پاؤں مضبوطی سے گاڑ کر چلو۔ حال سمندر کی ریت کی طرح لمحہ لمحہ سرک رہا ہے اور آنکھیں کھول کر دیکھو مستقبل تاریک خلا ہے۔

بچھو کی پیدائش،

حضرت سعدی بیان فرماتے ہیں، میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ بچھو کی پیدائش عام جان داروں کی طرح نہیں ہوتی۔ اپنی ماں کے پیٹ میں جب یہ بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اندر سے پیٹ کو کاٹنا شروع کر دیتا ہے اور اس میں سوراخ کر کے باہر آ جاتا ہے۔ میں نے یہ بات ایک مردِ دانا کے سامنے بیان کی تو انہوں نے فرمایا۔

• میں سمجھتا ہوں یہ بات درست ہی ہوگی بلکہ درست ہونا چاہیے۔ بچھو کی فطرت اور عادت پر غور کیا جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے پہلے دن سے برائی ہی کی ہوگی۔ یہی بات ہے کہ ہر شخص اس سے نفرت کرتا ہے اور دیکھتے ہی مار ڈالتا ہے۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... سارہ نیلم
میک اپ ... روز بیوٹی پارلر
فوٹوگرافی ..... موسیٰ رضا

خالدہ جیلانی

فاکہہ سہیل ——— کراچی

مجھے لہجوں کے بدلنے سے ہمیشہ خوف آتا ہے
کہ لہجے بدلتے ہیں تو کوئی اپنا نہیں رہتا

نادیہ اسیر ——— گوجرہ

سوکھے پتوں کی طرح بکھرے ہیں ہم تو
کسی نے سمیٹا بھی تو صرف جلانے کے لیے

طوبیٰ اطہر ——— فیصل آباد

میری نظریں کریں کیسے تیرے چہرے کا طواف
میری آنکھوں سے تو نے باندھ رکھیں احرام کی
دیکھ ایسے آنکھیں میری بھیگی ہی ہیں ہمدم!
اک دھندلا سا ہے بھیگی تو نہیں شام ابھی

میں وہ صاف ہی نہ کہہ دوں جو فرق ہے تجھ میں مجھ میں
ترا درد، دردِ تنہا، مرا غم، غمِ زمانہ

سب کا تو مداوا کر ڈالا اپنا ہی مداوا کر نہ سکے
سب کے گریباں سی ڈالے اپنا ہی گریباں بھول گئے

احباب سے کیا کہیے اتنا نہ ہوا فانی
جب ذکر مرا آتا مرنے کی دعا کرتے

اسی کے لطف سے مرنے سے خوف آتا ہے
اسی کے ڈر سے یہ جینا محال ہے مجھے

ٹوٹ گیا جب دل تو پھر یہ سانس کا نغمہ کیا معنی
گونج رہی ہے کیوں شہنائی جب کوئی بارات نہیں

تفصیل کیا بتاؤں کہ کیا کر رہا ہوں میں
جو کچھ بھی کر رہا ہوں، برا کر رہا ہوں

حمزہ اقرا ——— کراچی

ہم لوگ نسلِ آدم دعا ہیں اس لیے
آتا ہے لطف آج بھی ہمیں خطاؤں میں

بتاؤں تجھ کو مسلمان کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں

یہ میرے گرد تماشا ہے آنکھ کھلنے تک
میں خواب میں تو ہوں لیکن خیال ہی ہے مجھے

بعد مدت کے وہی خواب ہے پھر آنکھوں میں
لوٹ آیا ہے کہیں خود سے دھارا ہوا شخص

صرف ہاتھوں کو نہ دیکھو کبھی آنکھیں بھی پڑھو
کچھ سوالی بڑے خوددار ہوا کرتے ہیں

بخت کے تخت سے یکلخت اتارا ہوا شخص
تو نے دیکھا ہے کبھی جیت کے ہارا ہوا شخص

فضہ بلال ——— کراچی

ترے بغیر بھی اکثر دکھا ہے دل اپنا
کہ جتنے چہرے تھے وہ تیرے خد و خال کے تھے
ہزار غم تھے تیرے غم سے ماورا بھی مگر
وہ زندگی کے نہ تھے صرف ماہ و سال کے تھے

ہم لوگ سمندر کے بچھڑے ہوئے ساحل ہیں
اس پار بھی تنہائی ہے اس پار بھی تنہائی

احمق

لندن کے نواح میں ایک نوجوان جوڑا کار میں تیز رفتاری سے جا رہا تھا۔ ایک چیف جسٹس آف پیس نے انہیں روک لیا اور موقع پر ہی ایک سو پونڈ کا جرمانہ کر دیا۔

نوجوان بولا" جناب والا! ہم تو آپ کے پاس ہی آ رہے تھے تاکہ آپ ہماری شادی کا فریضہ انجام دیں۔"

" پھر تو جرمانہ دو سو پونڈ کا۔" جج صاحب نے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔" تم تو اس سے بھی زیادہ احمق ہو۔ جتنا میں نے پہلے سمجھا تھا۔"

لاعلاج

بیوی اپنے شوہر کا موبائل چیک کر رہی تھی۔ اس میں نمبر کچھ اس طرح سے محفوظ تھے۔

دل بہلانے کا علاج، خوشی کا علاج، غم کا علاج

بیوی نے اپنا نمبر چیک کیا تو لکھا تھا۔

"لاعلاج"

آرزو

صحافی۔" کیا آپ کے بچپن کی کوئی آرزو، پوری ہوئی؟"

بزنس مین" ہاں، جب امی میرے بال پکڑ کر کھینچتی تھی تو میں آرزو کیا کرتا تھا کہ کاش میرے سر پر بال نہ ہوتے۔"

اہمیت

ایک آدمی بیکری پر کیک سلائس لینے گیا۔ ان سے آگے ایک خاتون موجود تھیں۔ انہوں نے کاؤنٹر بوائے سے شوکیس میں لگی پیسٹریوں کے متعلق پوچھا۔

سیلز مین۔" میم! یہ بلیک فاریسٹ ہے، یہ پائن ایپل ہے، یہ ریڈ ویلوٹ ہے، یہ تھری ملک ہے، اور یہ......اور یہ......" ان خاتون نے کچھ سلیکٹ کیا اور سائیڈ پر ہو گئیں۔

آدمی نے اپنی باری آنے پر، اسی سیلز مین سے پوچھا۔

" اس والے شوکیس میں کون کون سی پیسٹریز ہیں؟"

" یہ اس طرف سو والی ہیں اور یہ ڈیڑھ سو والی ہیں۔" سیلز مین نے جواب دیا۔

ہمت

فراز۔" تم نے سنا شاہد عین اپنے نکاح کے وقت مولوی صاحب کے سامنے سے اٹھ کر بھاگ گیا اور اب تک اس کا کچھ پتا نہیں۔"

وسیم۔" اوہ میرا خیال ہے عین وقت پر اس کی ہمت جواب دے گئی؟"

" نہیں یوں نہ کہو، عین وقت پر اس نے ہمت کر ہی لی۔" فراز نے جواب دیا۔

مجبوری

ایک طالب علم اپنے پروفیسر کے پاس گیا اور شکایتی انداز میں بولا۔" سر! میرا پرچہ اب ایسا بھی

نہیں تھا کہ اس پر زیرو دیا جاتا۔"
پروفیسر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔"لیکن میرے پاس اس سے چھوٹا نمبر نہیں تھا۔"

شرف قبولیت

ایک خاتون نے ایک فقیر کو بہت سے پرانے کپڑے دیتے ہوئے کہا۔
"یہ سب کے سب تمہارے کام آجائیں گے بس انہیں معمولی سی مرمت کی ضرورت ہے۔زیادہ سے زیادہ ایک دن کا کام ہے۔"
"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! تو پھر میں کل آجاؤں گا۔"
فقیر نے کپڑے وہیں چھوڑ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

سزا

بیوی نے عدالت کو بتایا۔
"میری شادی کو ایک ہفتہ ہوا ہے کہ میرے شوہر نے میرے سر پر کیک دے مارا۔"
عدالت نے شوہر کو بدسلوکی پر پچاس روپے جرمانہ اور مقدمے کے اخراجات کی ادائی کی سزا سنائی۔
بیوی نے کہا۔"جناب والا! وہ کیک میں نے خود ان کے لیے بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔"
عدالت نے فوراً پچھلی سزا مسترد کرتے ہوئے حکم نامہ جاری کیا کہ"مہلک ہتھیار سے حملہ کرنے کے جرم میں ایک سال قید بامشقت۔"

فرق اصطلاح

جج نے ملزم سے پوچھا۔"تم اپنی بیوی کو چھوڑ کر کیوں بھاگ گئے تھے؟"
ملزم بولا۔"جناب والا! اگر میری بیوی سے آپ اتنے ہی واقف ہوتے، جتنا میں ہوں تو آپ مجھے بھگوڑا نہ کہتے۔اصل میں، میں بھگوڑا نہیں، پناہ گزین ہوں۔"

فرق

ایک گاہک نے ہوٹل کے بیرے سے پوچھا۔
"میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔اس ہوٹل میں سفید پلیٹوں میں جو سالن پیش کیا جاتا ہے اس کی قیمت پچیس روپے لی جاتی ہے اور جو سالن رنگین پلیٹوں میں دیا جاتا ہے اس کی قیمت بیس روپے۔اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا سفید پلیٹوں کا سالن زیادہ اچھا ہوتا ہے؟"
بیرے نے جواب دیا۔"جناب دونوں پلیٹوں میں ایک ہی سالن پیش کیا جاتا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ سفید پلیٹوں کو ہمیں دھونا پڑتا ہے اور......"

کہنے کی بات اور......

ایک مالک نے سوچا کہ اپنے ملازم کو ملازمت سے ہٹادے مگر وہ چاہتا تھا کہ یہ بات ملازم سے اس انداز میں کہی جائے کہ اس کا دل نہ ٹوٹے لہٰذا اس نے اپنے ملازم کو بلایا اور اس سے بڑے شفیق انداز میں کہا۔
"بھئی، تم نے ہمارے گھر میں رہ کر اس قدر محبت، توجہ اور دلچسپی سے کام کیا ہے کہ تم ہمارے گھر کے ایک فرد بن گئے ہو۔میں یہ ارادہ کررہا ہوں کہ گھر کے ایک فرد کے بغیر بھی رہ کر دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم تمہارے بغیر کس طرح رہ سکیں گے۔مگر خیر اگلے مہینے کی پہلی تاریخ سے کوشش تو کرکے دیکھتے ہیں۔"

☆☆

امتِ نعمان

فلسطین کا تنازعہ

پس منظر کیا ہے؟
فلسطین کا قضیہ برطانیہ اور فرانس کا کھڑا کیا ہوا ہے۔ اب تک سترہ کمیشن تحقیقات کر چکے ہیں۔ ملک کے باشندے ترکی حکومت کے ایام کو یاد کر کے کفِ افسوس ملتے ہیں مگر خود کردہ را علاج نیست۔ اے کاش کہ وہ سمجھتے غداری کی سزا تو اس دنیا میں بھی ملتی ہے اور آخرت میں تو سخت گرفت ہوتی ہے۔ ان کی ہر قسم کی چیخ وپکار بے کار ثابت ہو رہی ہے۔ کیا ہوگا۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ مگر بظاہر یا تو 1877ء کی تکرار ہوگی۔ جس میں صلاح الدین ایوبی کو پورے یورپ پر فتح ہوئی تھی اور اس کی صورت اتنی مہیب ہوگی کہ ممکن ہے۔ فلسطین کی اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ زمینیں چھورہ جائیں اور آسمان آٹھ بن جائیں یا ایٹم بموں سے تختہ ہی الٹ جائے اور ارض فلسطین کا بحیرہ فلسطین بن جائے اور نہ معلوم کتنے ملک اور کتنی قوموں کے کروڑہا انسان اس کی روندن میں آ کر صفحہ ہستی سے نابود ہوجائیں۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔

جنگ عظیم اول 18-1914ء کے دوران جب برطانیہ نے ترکوں کو شکست دینا چاہی تو شریف مکہ کے ذریعہ عربوں کو بغاوت پر یہ وعدہ کر کے ابھارا گیا کہ اگر اتحادی جنگ میں کامیاب ہو گئے تو عرب ممالک کی آزادی اور وفاق تسلیم کر لیا جائے گا۔

اس کے تھوڑے دن بعد برطانیہ نے یہودیوں سے وعدہ کر لیا کہ "اگر تم جنگ جیتنے میں ہماری مدد کرو تو ہم فلسطین کو تمہارا وطن مان لیں گے۔"

دونوں کی مدد سے برطانیہ نے جنگ میں کامیابی حاصل کرلی۔

ہوشیاری یہ کی کہ ان وعدوں کا ایک دوسرے کو بروقت علم نہیں ہونے دیا گیا۔ اسی طرح سے خفیہ طور پر باہم تقسیم ممالک کا بھی معاہدہ کر لیا۔ جن کے پیشِ نظر صلح کانفرنس میں من مانی کرلی۔

یہودیوں نے اپنا وطن بنانے کی غرض سے چند جماعتیں قائم کر لیں۔ انھیں چندہ فراہم کیا گیا۔ فلسطین میں زمینیں خریدنا شروع کردیں اور مختلف ممالک سے آ آ کر بسنا شروع کردیا۔

ادھر برطانیہ نے ان سے ایفائے وعدہ کی بنا پر ہر طرح کی سہولتیں اور آسانیاں بہم پہنچائیں۔ عربوں کے ہاتھ سے بہت سی زمین نکل گئی اور یہودیوں کی آبادی میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ عربوں کو اپنا مستقبل تاریک دکھائی دینے لگا۔ اور انہوں نے سمجھ لیا کہ برطانیہ نے ان کے ساتھ وعدہ خلافی کی ہے۔ اس پر عربوں اور یہودیوں میں تصادم ہونے لگے۔

حکومت نے حالات کا جائزہ لینے، مسئلہ کو حل کرنے اور سمجھنے کے لیے وقتاً فوقتاً کمیشن کے بعد سترھویں مرتبہ امریکہ بھی دخیل کار ہوگیا اور چھ چھ مدبروں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر ہوا جس نے اپنی سفارشیں مئی 1946ء میں شائع کر دیں۔ اب تک کسی کمیشن کی کوئی سفارش اہل فلسطین نے تسلیم نہیں کی اور ہر مرتبہ جھگڑے، قضیے۔

لوٹ مار، قتل وغارت، آتش زدگی وغیرہ کی

وارداتیں اور ہڑتالیں ہوئیں۔

اب فلسطین دوزخ کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ یہود کی درآمد ہر بہانے جاری ہے۔ اب ان کی امداد کے لیے عرب ممالک میں بھی اتحاد ہو گیا ہے اور دیگر ممالک میں بھی عربوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا جا رہا ہے۔

یہودی اپنے مقصد میں منہمک ہیں۔ آبادی بڑھ رہی ہے۔ مکان بن رہے ہیں۔ زمینیں درست ہو رہی ہیں۔ تعلیم جاری ہے۔ کھدائی کی جا رہی ہے۔ تجارت اور صنعت و حرفت میں ترقی ہو رہی ہے اور دنیا میں ہر یہودی کا دماغ اپنی قوم کی بہبود کے لیے کوشاں ہے۔ اس امر کے لیے پریشان ہیں کہ اتحادی اعلان کر دیں کہ فلسطین، وطن یہود بن چکا ہے۔

ادھر فلسطینی مجاہدین کی عزم و ہمت اور ان کی جان فشانی و جاں نثاری دیکھیے کہ امریکہ، برطانیہ اور دیگر اسلام دشمن طاقتوں کی طرف سے دیے گئے جدید ترین اسلحے کے اندھا دھند استعمال کے باوجود مجاہدین اسلام نے ان سفاک یہودیوں اور ظالم و جابر امریکیوں، برطانوی سامراجیوں کا مقابلہ ایمانی قوت و طاقت اور سڑکوں پر پڑے اینٹوں روڑوں سے کیا ہے۔ دنیا دیکھ رہی ہے کہ مظلوم فلسطینی چھوٹے لڑکے شوق شہادت کے ساتھ کس طرح مردانہ وار مقابلہ کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ضرور ان کو غیبی نصرت اور فتح و کامرانی سے ہم کنار کرے گا۔ (ان شاء اللہ)

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نظام امن عالم از ...... مجاہد الحسینی صاحب)

انتخاب: صبا خان...... ٹوبہ ٹیک سنگھ

معتمد اور ملکہ رمیکیہ

اشبیلہ کا امیر معتمد ایک بلند پایہ شاعر تھا۔ لیکن ایک قوم کی بدقسمتی نے اسے حکمران بنا دیا۔ معتمد کے وزیر عہدے دار اور قومی افسران کی بیگمات اور لونڈیاں اور اس کے خواجہ سرا سب شاعر تھے۔ معتمد کے دربار میں رسائی حاصل کرنے کے لیے شاعری پہلا اور آخری زینہ تھا۔ اس لیے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر شاعروں کا قبضہ تھا۔ جب قسطلہ کے اسلحہ خانوں میں دشمنان اسلام اپنی تلواریں تیز کر رہے تھے۔ تو اس وقت اشبیلہ کے حکمران اور اس کے امراء کئی کئی گھنٹے ایک شعر کی نوک پلک درست کرنے میں صرف کر دیا کرتے تھے۔

شاعری کے بعد امیر معتمد کو سب سے زیادہ ایک عورت سے محبت تھی۔ جو کہ ایک لونڈی تھی۔ اس کا اصلی نام اعتماد تھا۔ مگر رمیک کی لونڈی ہونے کے باعث اسے رمیکیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

دل کے ہاتھوں مجبور اشبیلہ کے ولی عہد معتمد نے رمیکیہ کو اپنے تاج کا ہیرا بنایا۔ رمیکیہ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد معتمد کے لیے ہر صبح ”صبح مسرت“ ہر شب ”شب نشاط“ تھی۔ رمیکیہ بذلہ سنجی اور حاضر جوابی میں اپنی مثال آپ تھی۔ رمیکیہ نے معتمد کو عیش و نشاط اور لہو و لعب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ حرم کے عیش و نشاط کو رمیکیہ نے اوج کمال تک پہنچایا۔ مفکر سیاست دان اور علوم و فنون کے ماہرین شاہی محل کے خانساموں، باورچیوں، اور سازندوں کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔

ایک دن رمیکیہ معتمد کے ساتھ دریا کی سیر کا لطف اٹھا رہی تھی۔ دریا کے کنارے چند غریب عورتیں اینٹیں بنانے کے لیے مٹی گوندھ رہی تھیں۔ شاہی محل واپس پہنچ کر رمیکیہ نے معتمد سے شکایت کی۔

”تم نے مجھے ایک قیدی کی طرح اس محل کی چار دیواری میں قید کر رکھا ہے۔ زندگی کی ہزاروں لذتیں ایسی ہیں جو مجھے میسر نہیں۔“

معتمد نے اس کی خواہش پوچھی تو اس نے کہا کہ میں چاہتی ہوں کہ مجھے بھی ان کی طرح مٹی

گوندھنے کی آزادی حاصل ہو۔"

معتمد نے چند دنوں کے اندر محل میں مشک عنبر اور کافور کے ڈھیر لگوا دیے پھر ان اشیاء کو کوٹ کر یک جان کیا گیا۔ اور گلاب کے عرق سے نمی دی گئی۔ جب یہ تیاریاں مکمل ہو گئیں تو رمیکیہ اپنی سہیلیوں اور خادماؤں کے جلوس میں تشریف لائی اور ننگے پاؤں اس مشک و عنبر اور کافور کے ڈھیر میں کود پڑی، جسے جمع کرنے کے لیے معتمد نے لاکھوں روپے صرف کر دیے تھے۔

معتمد کے قریب ایک لونڈی موتیوں سے بھرا طشت اٹھائے کھڑی تھی اور معتمد مٹھی بھر بھر کے قیمتی موتی اس کیچڑ میں موجود رمیکیہ پر نچھاور کر رہا تھا۔

یہ سچ ہے ہر عروج کو زوال ہے۔ اسی طرح معتمد کا زوال بھی شروع ہوا۔

سیر بن ابوبکر نے اشبیلیہ کی فصیل کو توڑ کر معتمد کے محل پر حملہ کر دیا۔ معتمد نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر ناکام ہو کر ہتھیار ڈال دیے۔ سیر بن ابوبکر نے معتمد، ملکہ رمیکیہ کو گرفتار کر کے طنجہ بھیج دیا۔ جب قیدیوں کا یہ جہاز وادی الکبیر کے راستے سمندر کی طرف روانہ ہونے کو تھا تو اشبیلیہ کے ہزاروں انسانوں نے کنارے پر کھڑے ہو کر یہ عبرت ناک منظر دیکھا۔ معتمد اور ملکہ رمیکیہ کو ننگی تلواروں کے سائے میں جہاز میں داخل کیا گیا۔ جب جہاز روزانہ ہوا تو اشبیلیہ کے ایک بوڑھے شاعر نے آنسو بھری آنکھوں سے کہا۔

"معتمد فیاض تھا، بہادر تھا۔ بیدار مغز تھا مگر ایک آوارہ مزاج عورت نے اسے ذلت کے گڑھے تک پہنچا دیا۔"

ملکہ رمیکیہ جہاز کے کونے میں کھڑی اپنے عظیم الشان محل کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس نے ڈوبتی آواز میں اپنے شوہر سے کہا۔

"ہم پھر یہاں نہیں آئیں گے؟ کیا اشبیلیہ کے دروازے ہم پر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں؟" معتمد نے کہا "ملکہ! اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ جس چراغ کا تیل ختم ہو چکا ہے۔ وہ آنسوؤں سے نہیں جلا کرتا۔"

دریا کے کنارے عورتیں مٹی گوندھ رہی تھیں۔ رمیکیہ نے کہا۔

"آپ کو وہ دن یاد ہے جب میں نے مٹی گوندھنے کی خواہش کی تھی اور آپ نے مشک و عنبر کے ڈھیر لگا دیے تھے۔"

معتمد نے کرب آمیز لہجے میں کہا۔ "خدا کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لو اور ماضی کو بھول جاؤ۔"

"نہیں، میں ماضی کو نہیں بھول سکتی۔"

رمیکیہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ معتمد، اشبیلیہ کا حکمران اور عظیم شاعر جس نے جلاوطنی کے زمانے میں بے شمار آلام و مصائب کا سامنا کیا۔ جس کا ذکر اس کے کلام میں موجود ہے۔ رمیکیہ، معتمد کو عیش و نشاط میں مبتلا کر دینے والی ملکہ جو سلطنت کی بیشتر آمدنی اپنی عیاشیوں پر صرف کر دیتی تھی۔ پائی پائی کی محتاج ہو کر بے بسی کے دن گزارنے لگی۔ ملکہ رمیکیہ اور معتمد کے اسیری کے ایام یقیناً اندوہناک تھے مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ انہوں نے جو راستہ منتخب کیا تھا۔ اس کی آخری منزل یہی ہو سکتی تھی۔

(نسیم حجازی کی تصنیف "یوسف بن تاشفین" سے)

صائمہ بدر..... کھلابٹ ہری پور

اعتذار

ہماری مصنفہ بہن امت العزیز شہزاد کو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے نوازا ہے۔

امت العزیز شہزاد کو دلی مبارک باد اور دعائیں۔

امت العزیز ناسازی طبع کے باعث اس ماہ والعصر کی قسط نہیں لکھ پائیں۔ ان شاء اللہ قارئین اگلے ماہ والعصر کی قسط پڑھ سکیں گی۔

واصفہ سہیل

تبدیلی

گزشتہ دنوں لاہور میں ہونے والے ایک ایوارڈ شو میں قومی ترانے کو ری مکس انداز میں پیش کیا گیا (یعنی بیڑا غرق کیا گیا)

معروف اداکار عدنان صدیقی نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کسی کو بھی تخلیق کے نام پر قومی ترانے میں تبدیلی کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

اس ترانے کو شہزاد رائے اور بلوچ فوک فنکار عبدالوہاب بگٹی نے گایا' اسے ری مکس میوزک کے ساتھ پیش کیا گیا' ترانے کی ویڈیو میں ملک کے مختلف علاقوں کے مناظر دکھائے گئے۔

جب اس ترانے کی ویڈیو وائرل ہوئی تو بہت سے لوگوں نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ (ہم بھی ان لوگوں میں شامل ہیں)

عدنان صدیقی کو قومی ترانے کا ری مکس اچھا نہیں لگا اسے سن کر انہیں مایوسی ہوئی انہوں نے کہا کہ قومی ترانے کو آج تک تمام تقریبات' کھیلوں اور ایوارڈ شو میں اصل موسیقی کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے' جس سے عوام میں حب الوطنی بیدار ہوتی ہے کیونکہ قومی ترانے کو بہترین موسیقی کے ساتھ لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے تخلیق کیا گیا تھا (ویسے بلاوجہ قومی ترانے میں چھیڑ چھاڑ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ شاید ان کے پاس کرنے کو کچھ نہ تھا تو!)

ویسے عدنان صدیقی نے آخر میں کہا کہ ہوسکتا ہے ان کی رائے غلط ہو۔ (ہیں یہ کیا بھئی؟ اپنی بات پر قائم تو رہتے۔)

دلچسپی

"پورا پاکستان بالی ووڈ دیکھ کر بڑا ہوا

پاکستانیوں کو بھارت میں ہونے والی ہر چیز کا علم ہے وہ اچھی جانتے ہیں کہ بھارتی کیا اور کیسے لباس پہنتے ہیں مگر بھارتیوں کو پاکستان سے متعلق کچھ علم نہیں۔"

ان خیالات کا اظہار صنم سعید نے ایک بھارتی اخبار کو انٹرویو دیتے ہوئے کیا۔ یاد رہے کہ صنم سعید نے بھارتی پروڈیوسر کی ویب سیریز قاتل حسینائیں میں کام کیا ہے۔ جس نے عالمی ایوارڈ بھی جیتے ہیں' صنم سعید کے مطابق یہ ایک بہترین سیریز تھی' اس ویب سیریز سے ثابت ہوتا ہے کہ جب دو مختلف ممالک کے بہترین ذہن اور لوگ آپس میں مل کر کام کرتے ہیں تو یقینی طور پر اچھی چیزیں بنتی ہیں۔

صنم سعید کہتی ہیں کہ پاکستانیوں کو مدھوبالا سے لے کر کرینہ کپور اور دپیکا پڈوکون تک ہر کسی کو جانتے ہیں لیکن بھارتی پاکستان کے متعلق یہ تک نہیں جانتے کہ پاکستانی کس طرح دال چاول کھاتے ہیں (اور بریانی بھی کراچی کی بریانی کا تو کوئی مقابلہ ہی نہیں) خواتین بال کس طرح باندھتی ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے "زی زندگی" چینل کھلنے کے بعد بھارتیوں نے پہلی بار پاکستانیوں سے متعلق چیزیں دیکھنا شروع کیں تو انہیں معلوم ہوا کہ پاکستانی لوگ کس طرح کا لباس پہنتے ہیں' وہاں کی خواتین کیسی ہوتی ہیں' زی زندگی پہ پاکستانی ڈرامے دیکھنے کے بعد بھارتی دنگ رہ گئے اور انہیں پاکستان کے متعلق نئی چیزیں بھی دیکھنے کو ملیں لیکن بعد میں یہ سلسلہ بند ہو گیا۔

فیصلہ

لگتا ہے کہ آج کل فیروز خان کے ستارے گردش میں ہیں' کئی لوگ ان کی گھریلو زندگی کی وجہ سے انہیں تنقید کا نشانہ بنا رہے ہیں اب بھی دیکھ لیں ان کی ساتھی اداکارہ اقراء عزیز نے بھی ان کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

اقراء نے فیروز خان کے ساتھ کام نہ کرنے کے فیصلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ فیروز خان

کی اہلیہ علیزے سلطان کی جانب سے اداکار پر تشدد کے الزامات کے بعد وہ ان کے ساتھ کام کرنے میں پرسکون محسوس نہیں کرتیں۔ (کیوں بھئی؟)

ہر کسی کو اختیار ہے کہ وہ جس کے ساتھ چاہے کام کرے اور کیسے کام کرنا چاہتی ہیں کریں (ابھی آپ اتنی بڑی اداکارہ تو نہیں کہ یہ فیصلہ کرسکیں) میں نے وہی کیا جو میرے لیے بہتر تھا اور جو میں کرنا چاہتی تھی۔ میں ایکشن لینے کے لیے کسی چیز کے ثابت ہونے کا انتظار نہیں کر رہی تھی۔ (اخلاقی طور پر تو کرنا چاہیے۔)

☆☆

موسم کے پکوان

واصفہ سہیل

مچھلی بریانی

اجزاء

مچھلی کے قتلے	ایک کلو
چاول	ایک کلو
نمک	حسب ذائقہ
ادرک لہسن پسا ہوا	دو کھانے کے چمچے
پیاز	دو عدد درمیانی
ٹماٹر	تین عدد
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
میتھی دانہ	چند دانے
رائی	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	آدھی پیالی

ترکیب:

دیگچی میں تیل کو دو تین منٹ ہلکا سا گرم کریں اور اس میں میتھی دانہ، رائی، کڑی پتہ اور ہری مرچیں ڈال کر پکائیں۔ پھر پیاز ڈال کر سنہری کرلیں۔ لہسن ادرک اور ٹماٹر ڈال کر کچھ دیر تک بھونیں۔ یہاں تک کہ دونوں چیزیں اچھی طرح گل جائیں اور تیل علیحدہ ہو جائے۔ نمک، لال مرچ، ہلدی اور دھنیا ڈال کر ہلکا سا پانی کا چھینٹا دے کر کچھ دیر تک بھونیں اور بھوننے کے بعد اس کے اندر مچھلی کے قتلے ڈال دیں۔ تین سے چار منٹ پکا کر احتیاط سے مچھلی کو علیحدہ کرلیں۔ اس مسالے میں چاول ڈال کر درمیانی آنچ پر پانی خشک ہونے تک پکائیں۔ اوپر سے مچھلی کے قتلے رکھ کر ہلکی آنچ پانچ سے سات منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ مچھلی کے قتلوں کو اٹھا کر علیحدہ رکھیں۔ پھر بریانی کو ڈش میں نکال کر ان قتلوں کو سجا کر گرما گرم پیش کریں۔

فلافل

اجزاء

کابلی چنے	ایک پاؤ
ہرا دھنیا	تین کھانے کے چمچے
لہسن	ایک چائے کا چمچہ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
کٹی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
کھانے کا سوڈا	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسب پسند
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

بھیگے ہوئے چنوں کو باریک پیس کر ایک پیالے میں نکال لیں۔ اس میں باقی اجزاء ملائیں۔ کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ آمیزے کے چھوٹے پکوڑے تیل میں سنہرا تلیں۔ مزے دار گرما گرم فلافل چٹنی کے ساتھ نوش کریں۔

سرکہ چکن

اجزاء

مرغی	آدھا کلو
سرکہ	ایک پیالی
دہی	ایک کپ
کٹی مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچ	چار عدد
لہسن ادرک	ایک کھانے کا چمچہ

ترکیب:

مرغی کے ٹکڑوں کو سرکے میں بھگو دیں۔ پکانے سے پہلے اسے سرکے سے نکال لیں اور فریج

میں چالیس منٹ کے لیے رکھ دیں۔ اب مرغی میں کٹی مرچ، دہی، نمک، ہری مرچ اور لہسن ادرک ملا دیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر لیں۔ مرغی ڈال کر ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ مرغی کا پانی خشک ہونے پر دو منٹ بھون لیں۔ پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔

مٹن بھنڈی گوشت

اجزاء

گوشت	آدھا کلو
پیاز	دو عدد
نمک	حسب ذائقہ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
دھنیا	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ
بھنڈی	ایک پاؤ

ترکیب:

کڑاہی میں تیل گرم کر کے اس میں پیاز ڈال کر سنہری کر لیں۔ نمک، لال مرچ، ہلدی، دھنیا، لہسن ادرک ڈالیں اور مسالا بھون لیں۔ مسالے میں گوشت ڈال کر بھونیں اور حسب ضرورت پانی ڈال کر گوشت گلنے تک پکائیں۔ گوشت گل جائے تو بھونیں۔ شوربے کے حساب سے حسب ضرورت پانی ڈال دیں۔ بھنڈی ڈال کر کچھ دیر مزید پکائیں۔ ہری مرچیں، گرم مسالا، ہرا دھنیا ڈال دیں اور سرونگ ڈش میں نکال کر لیموں اور چپاتی کے ساتھ سرو کریں۔

فش کٹلس

اجزاء

مچھلی	آدھا کلو
کالی مرچ	آدھا چمچہ
آلو	ایک عدد
انڈا	ایک عدد
لہسن	تین جوے
ادرک	دو انچ کا ٹکڑا
ہری مرچ	دو عدد
ہرا دھنیا	حسب پسند
نمک	حسب ذائقہ
لیموں	آدھا
پیاز	ایک عدد

ترکیب:

آلو ابال لیں۔ ڈیڑھ کپ پانی میں مچھلی اور کالی مرچ ڈال کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ پانی خشک ہو جائے تو چولہے سے ہٹا لیں۔ مچھلی کو اچھی طرح چل کر کانٹے نکال لیں۔ مچھلی میں ابلا اور چھلا ہوا آلو شامل کر لیں۔ کٹا ہوا ادرک لہسن، باریک کٹی ہری مرچ، لیموں کا رس، باریک کٹی پیاز، حسب ذائقہ نمک اور ہرا دھنیا ڈال کر مکس کر لیں۔ حسب پسند کٹلس بنا کر تل لیں۔ کیچپ اور چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

موسمی کا مربہ

اجزاء

موسمی	ایک درجن
شکر	تین کلو
الائچی	چھ عدد
عرق گلاب	چار کھانے کے چمچے
میوہ جات	حسب پسند

ترکیب:

موسمی کو ایک پتیلی میں چار جگ پانی ڈال کر ابال لیں۔ دو تین جوش کے بعد پانی نتھار کر موسمی میں کانٹے سے سوراخ کر لیں۔ موسمی کو ایک بڑی پتیلی میں رکھ کر اس پر شکر عرق گلاب اور الائچی ڈال کر دو گھنٹے تک رکھیں۔ اس کے بعد ہلکی آنچ پر پکائیں شیرہ گاڑھا ہونے لگے تو میوہ شامل کر دیں۔

☆☆

ہماری آنکھوں میں نمی ہوتی ہے اور جب ہم پلکیں جھپکاتے ہیں تو یہ عمل اس نمی کے ذریعے آنکھوں کو بار بار دھو دیتا ہے۔ یہ آنسو ہماری آنکھوں کی صفائی کے لیے بہت ضروری ہیں۔

خراب غذا اور غیر صحت مند مشاغل آنکھوں کو خشک کر دیتے ہیں' مثال کے طور پر راتوں کو دیر تک جاگنا' کمپیوٹر یا ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہنا' دھواں' گندگی' ماحول کی کثافت۔ یہ سارے عوامل آنکھوں کے لیے نقصان دہ ہوا کرتے ہیں۔ اس سے آنکھیں خشک بھی ہو جاتی ہیں اور ان میں چبھن اور تکلیف بھی ہونے لگتی ہے۔

بہت سی غذائیں آنکھوں کے لیے بہت مفید ہوتی ہیں اور ان کے استعمال سے آنکھیں روشن اور صحت مند رہتی ہیں۔

جیسے وٹامن اے جو آنکھوں کی خلیات کو توانا رکھتا ہے خاص طور پر ریٹینا۔ رات کے وقت کم نظر آنے کی صورت میں بلیو بیری بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔

آنکھوں کے بے تحاشہ سرخ ہو جانے کی کئی وجوہات ہوا کرتی ہیں۔

بے خوابی' تھکان' الرجی' گرد آلود یا دھواں آلود ماحول۔ اگر ان کی طرف توجہ دی جائے تو آنکھوں کی اس خرابی کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ صحت مند آنکھوں کو مناسب مقدار میں آئرن کے ساتھ خون کی سپلائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ آنکھوں کو آکسیجن ملتی رہے اس لیے اپنی روزانہ کی خوراک میں ایسے عناصر ضرور شامل رکھیں جن میں آئرن موجود ہو۔

وہ لوگ جو قبض میں مبتلا ہو جاتے ہیں نہیں خون کی روانی کے لیے اندرونی طور پر دباؤ کا سامنا ہوتا ہے جس کا اثر ان کی آنکھوں پر پڑتا ہے۔ قبض سے بچنے کے لیے وہ غذائیں استعمال کریں جو ریشے دار ہوا کرتی ہیں جیسے فروٹ سلاد' بھوسی کا دلیہ' گندم کی روٹی' دالیں وغیرہ۔

ہر اس چیز سے پرہیز کریں جو آنکھوں میں خون کی روانی کو سست یا کمزور کرنے کا سبب بنتی ہو۔ جیسے الکحل اور کیفین وغیرہ یہ اجزا آپ کے جسم میں موجود وٹامن بی کو ختم کر دیتے ہیں اور وٹامن بی آنکھوں کے اعصابی نظام کو فعال اور توانا رکھنے کے لیے بہت ضروری ہے۔

فوری اثر

آپ ابھی ابھی دفتر سے گھر واپس آئی ہیں اور آپ کو آدھ گھنٹے کے اندر اندر تیار ہو کر ایک پارٹی میں جانا ہے لیکن آپ کی آنکھوں کی حالت عجیب ہو رہی ہے' آنکھوں میں خارش ہے آنکھیں جل رہی ہیں یا سرخ ہو رہی ہیں۔

سب سے پہلے تو پلکوں اور آنکھوں سے میک اپ صاف کریں۔

اس کے لیے روئی اور گرم پانی استعمال کریں۔

اس کے بعد دونوں آنکھوں پر کھیرے کے ٹکڑے رکھ کر کسی تاریک کمرے میں پانچ منٹ کے لیے لیٹ جائیں اگر آپ کے پاس وقت ہے تو یہ دورانیہ پندرہ منٹ کا بھی ہو سکتا ہے۔

جب پانچ یا پندرہ منٹ پورے ہو جائیں تو اٹھ کر ہلکے گرم پانی سے آنکھوں اور چہرے کو دھو لیں۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے عموماً اس بات کی علامت ہیں کہ آپ بے خوابی کا شکار ہیں آپ سوئی نہیں ہیں جبکہ ماہرین کا خیال ہے کہ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں کا تعلق گردوں سے ہوا کرتا ہے۔

اس لیے جب آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑنے لگیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ گردوں میں خرابی پیدا ہو گئی ہے چکنی' روغنی اور سخت قسم کی غذائیں پورے نظام ہاضمہ کو برباد کر دیتی ہیں اور لامحالہ اس کا اثر گردوں پر بھی پڑتا ہے اور گردے اپنا فنکشن کمزور کرنے لگتے ہیں۔

گردوں میں ٹاکسن جمع ہوجاتی ہے ایسی صورت میں زیادہ سے زیادہ پانی کا استعمال گردوں سے ٹاکسن کو دھو ڈالتا ہے اور آپ کے نظام ہاضمہ پر پڑنے والا دباؤ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔

اگر آپ بے خوابی کی مریضہ ہیں تو نیند لانے کے لیے دواؤں کے بجائے غذاؤں پر توجہ دیں جیسے دودھ، دہی، کیلے وغیرہ نیند آور غذا میں کہلاتی ہیں۔

اس کے علاوہ بستر پر جانے سے پہلے الکحل، کیفین اور نکوٹین وغیرہ سے بھی پرہیز کریں کیونکہ یہ بھی بے خوابی کا سبب بن جاتے ہیں اور یہ چیزیں آپ کی نیندیں اڑا دیتی ہیں۔

اگر آپ کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تو ایک آسان حل یہ ہے کہ جب آپ شاور لے رہی ہوں تو اس وقت اپنے کالر بون پر مساج کرتی رہیں۔

اپنی انگلیوں کو کالر کی ہڈیوں سے پھراتے ہوئے شانوں تک لے آئیں باری باری دونوں طرف اسی طرح کریں خیال کیا جاتا ہے یہ عمل آنکھوں کے گرد پڑے سیاہ حلقوں کو ختم کر دیتا ہے۔

آنکھوں کا خشک ہوجانا ایک عام سی صورت حال ہے اس کی کئی علامات ہیں جیسے خشک، سرخی، خارش اور آنکھوں میں چبھن وغیرہ۔ آنکھوں کی اس خشکی کی وجہ آپ کی آنکھوں میں وٹامن اے کی کمی ہوا کرتی ہے۔

وٹامن اے آپ کی آنکھوں کو صحت مند، توانا اور روشن رکھنے کے ساتھ ساتھ اس میں نمی کو بھی برقرار رکھتا ہے وٹامن اے آپ کو انڈوں، مکھن، دودھ میں مل سکتا ہے۔

بیٹا کاروٹین آپ کے جسم میں جا کر وٹامن اے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس کی تلاش بہت آسان ہے یہ جز آپ کو کئی اقسام کی سبزیوں اور پھلوں میں مل جاتا ہے۔ ہر وہ غذا جو آپ کے جسم میں خشکی پیدا کردے اور نمی کو جذب کرتی رہے آپ کی صحت اور آنکھوں کے لیے نقصان دہ ہے اس لیے ایسی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کرتی رہیں جیسے کرسپی، فاسٹ فوڈ یا پروسیسڈ فوڈ۔

جب آنکھ کے گوشے کسی کی وجہ سے جراثیم زدہ ہوجاتے ہیں تو ان پر ننھے ننھے دانے نمودار ہوجاتے ہیں یہ دانے تکلیف دہ ہوتے ہیں اور انہیں Styes کہا جاتا ہے یہ دانے آنکھوں کے ڈھیلوں پر یا اس کے آس پاس اندر یا باہر کی طرف ہوسکتے ہیں ان کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے یہ کسی بھی عمر میں ہوسکتے ہیں یہ دانے عام طور پر نظر کو متاثر نہیں کرتے اور چند دنوں کے بعد ٹھیک ہوجاتے ہیں۔

عام طور پر جہاں دانے نمودار ہوجائیں اس کے آس پاس ہلکی سی سوجن ہوجاتی ہے۔ اس سوجن میں تکلیف ہوا کرتی ہے کبھی کبھی اس کی وجہ سے پوری آنکھ متورم ہوجاتی ہے ایسی صورت میں آنکھوں سے مسلسل پانی بہتا رہتا ہے اور روشنی سے چبھن ہوا کرتی ہے اس کے لئے کسی علاج سے بہتر احتیاط ہے اور اس کی احتیاط یہ ہے کہ اس تکلیف سے بچنے کے لیے تازہ پھل اور سبزیاں استعمال کرتے رہیں۔

پالک، امرود، پپیتا، اورنج اور اسٹرابری وغیرہ میں وٹامن سی، بیٹا کاروٹین پایا جاتا ہے یہ دونوں عناصر جسم کی توانائی اور دفاعی صلاحیت کے لیے بہت ضروری ہیں۔

اگر آپ کی آنکھوں کو Styes کی شکایت ہورہی ہے تو ایک عجیب وغریب ٹوٹکا پیش خدمت ہے۔

اپنی کسی دوست سے اس کی سونے کی انگوٹھی لے کر اپنی آنکھوں کے گرد مالش کریں یہ دانے نکلنے بند ہوجائیں گے اب یہ نہیں بتایا جاسکتا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن یہ ایک آزمودہ ٹوٹکا ہے۔

☆☆